انتہا پسندی سے نجات ممکن ہے

www.KitaboSunnat.com

HRCP
پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندی سے نجات ممکن ہے

HRCP
پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
107-ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناشر:
پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور - 54600
فون:042-35838341-35864994-35865969
فیکس : 042-35883582
ای میل : hrcp@hrcp-web.org
ویب سائٹ: www.hrcp-web.org

طابع:
قاسم کریم پرنٹر
ریلوے روڈ لاہور
فون:042-7124439

جون 2012

ISBN No. 978-969-8324-53-7

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست

پہلا باب — **انسانی حقوق کی تحریک کا پس منظر، ارتقاء اور انسانی حقوق کا آغاز**

- انسانی حقوق ۔ مذہبی اور تاریخی پس منظر (محترمہ زارا ادریس) 7
- انسانی حقوق کا ارتقاء، عصری تقاضے اور اقوام متحدہ کا کردار (اشرف شریف) 14
- انسانی حقوق کی تحریک ...... ترقی یا تنزلی (سارا ای مینڈلسن) 29

دوسرا باب — **جمہوریت اور انسانی حقوق، انسانی حقوق اور معاشی ترقی کے مابین تعلق**

- جمہوریت ...... تاریخی پس منظر اور عصری تقاضے (محترمہ حنا جیلانی) 37
- جمہوری کلچر کے فروغ کے لیے سیاسی جماعتوں کا کردار (ڈاکٹر مہدی حسن) 71
- پاکستان میں آمریت کے مختلف ادوار ۔ ایک سرسری نظر (ڈاکٹر مہدی حسن) 82
- بجٹ میں انسانی حقوق کے لیے مختص شدہ رقم ۔ ایک جائزہ (ڈاکٹر پرویز طاہر، ڈاکٹر نادیہ طاہر) 86
- جمہوریت، انسانی حقوق اور ترقی (ڈاکٹر حسن عسکری رضوی) 100

تیسرا باب — **انتہا پسندی، اس کے پھیلاؤ اور انسداد میں ریاست کا کردار**

- انتہا پسندی ...... تاریخی پس منظر ۔ (ڈاکٹر منظور آغا) 109
- مذہب کی من مانی تشریح انتہا پسندی کے لیے آلۂ کار ...... ایک تاریخی جائزہ (اجمل کمال) 112
- پاکستان میں انتہا پسندی، پس منظر اور اسباب (آئی ۔ اے ۔ رحمٰن) 119
- پاکستان میں انتہا پسندی کی مختلف صورتیں (عامر رانا) 124
- جدیدیت سے دوری انتہا پسندی سے قربت (خالد احمد) 127
- انتہا پسندی کے فروغ میں جاگیرداری نظام کا کردار (مہتاب راشدی) 130
- انتہا پسندی کی راہ ہموار کرتا نظامِ تعلیم (آئی ۔ اے ۔ رحمٰن) 133
- پاکستان میں مذہبیت کا بڑھتا ہوا رجحان (عامر رانا) 139
- قدامت پرستی انتہا پسندانہ سوچ کی محرک (پرویز ہود بھائی) 142
- ریاست کا معذرت خواہانہ رویہ انتہا پسندوں کی قوت کا موجب (آئی ۔ اے ۔ رحمٰن) 145

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- انتہا پسندوں کے مشترکہ مقاصد (عامر رانا) 148
- انتہا پسندی کے عوامل اور اثرات (آئی۔اے۔رحمٰن) 151
- انتہا پسندی کی وجوہات اور ساخت..... مختلف ممالک سے چند ایک مثالیں (خالد احمد) 158
- انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے ہماری ذمہ داریاں (آئی۔اے۔رحمٰن) 162

چوتھا باب — انتہا پسندی کے انسداد یا فروغ میں میڈیا کا کردار

- جاننے کا حق (آئی۔اے۔رحمٰن) 169
- الیکٹرانک میڈیا میں غیر تربیت یافتہ عملہ کی بھرمار اور اس کے اثرات (ڈاکٹر مہدی حسن) 177
- نوزائیدہ نجی ٹی وی چینلز کی مقابلہ بازی اور لاشعوری طور پر انتہا پسندی کا فروغ (ڈاکٹر مہدی حسن) 180
- انتہا پسندی کے انسداد یا فروغ میں میڈیا کا کردار (امجد علی شاکر) 183
- فکر کے زاویے (حفیظ بزدار) 186
- ذرائع ابلاغ میں اخلاقی اقدار کا فروغ اور عملہ کی تربیت وقت کی اہم ضرورت (زہرہ یوسف) 188

پانچواں باب — پاکستان میں بین المذاہب آہنگی اور عدم برداشت کے مسائل

- مذہبی رواداری۔تاریخی پس منظر (ڈاکٹر مبارک علی) 195
- رواداری مفہوم، تاریخی حوالہ اور عصری تقاضے (جہد حق) 200
- مذہبی ہم آہنگی اور رواداری (حفیظ بزدار) 205
- ذاتی مقاصد کے لیے مذہب کا استعمال۔تکفیر مذہب کے چند اہم مقدمات (جہد حق) 206
- اسلام کی لبرل اقدار۔رواداری اور بھائی چارہ کے لیے مشعلِ راہ (خالد رحمان) 209
- فرقہ واریت سے نجات کا راستہ (ڈاکٹر مہدی حسن) 215

چھٹا باب — مختلف مذاہب میں انسانی حقوق کا تصور

- انسانی حقوق کا تصور، مذہبی اور تاریخی پس منظر (پروفیسر رفیق محمد) 221
- مذاہب میں انسان کی عظمت اور حقوق کا تصور (عدنان عادل) 231
- اقلیتوں کو درپیش مسائل کو مذہبی نہیں سیاسی بصیرت سے دیکھنے کی ضرورت (آئی۔اے۔رحمٰن) 235

ساتواں باب — انسانی حقوق کے نفاذ، حقوق کے فروغ، حقوق کی تحریک کو مستحکم کرنے کے لیے حکمت عملی کی تشکیل اور عوام تک رسائی حاصل کرنے میں سول سوسائٹی کا کردار

- پاکستان میں انسانی حقوق پر عملدر آمد کی راہ میں رکاوٹیں (حنا جیلانی) 241
- ریاستی سرپرستی میں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی۔ناقابل تلافی نقصان (آئی۔اے۔رحمٰن) 246
- حقوق تک رسائی حاصل کرنے میں سول سوسائٹی کا کردار (ایم ابوالفضل) 250
- جاگیردارانہ نظام انسانی حقوق کے حصول میں رکاوٹ (آئی۔اے۔رحمٰن) 252
- قائد کی سوچ حقوق کے فروغ کے لیے مشعلِ راہ (اردشیر کاؤس جی) 256
- انتظامیہ کی بے حسی حقوق کے حصول میں بڑی رکاوٹ (آئی۔اے۔رحمٰن) 259
- حقوق کے فروغ کے لیے حکمت عملی (پرویز ہود بھائی) 263

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلا باب

(انسانی حقوق کی تحریک کا پس منظر، ارتقاء اور انسانی حقوق کا آغاز)

- انسانی حقوق۔ مذہبی اور تاریخی پس منظر (محترمہ زارا ادریس)
- انسانی حقوق کا ارتقاء عصری تقاضے اور اقوام متحدہ کا کردار (اشرف شریف)
- انسانی حقوق کی تحریک ...... ترقی یا تنزلی (سارا ای مینڈلسن)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسانی حقوق ۔ مذہبی اور تاریخی پس منظر

(محترمہ زارا ادریس)

تعارف

انسانی حقوق بغیر کسی تگ و دو کے بطور تحفہ عطا نہیں ہوئے بلکہ یہ بہت طویل اور سخت جہد وجہد سے حاصل کئے گئے ہیں۔ جب انفرادی حقوق کی عظمت کا نظریہ عملی شکل اختیار کرتا ہے تو اس کے باعث چند مفادات اور مراعات پر زد پڑتی ہے۔ تمام دنیا کے مردوں اور خواتین کو اپنی فتح کے معروف اور گم نام ڈرامائی واقعات سے آگاہی حاصل کرنی چاہیے جو ان کے عظیم رہنماؤں نے اپنی قیادت کے ذریعے حاصل کی۔

(یونیسکو)

انسانی حقوق کا ارتقاء کسی ایک کوشش سے وجود میں نہیں آیا بلکہ بہت سے فلسفیوں، سیاستدانوں اور انقلابی رہنماؤں کی جاری مشترکہ کوششوں سے وجود میں آیا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ بلند اور مثالی تصور جس کی بنیاد ہمدردی، انصاف کے وعظ پر عمل کرنا اور انسانی نسل کی برابری پر ہے، متاثر کن ہے۔ انسانی حقوق کے تصورات کی جڑیں انسانیت میں پیوست ہیں کیونکہ اس معاشرے کے رکن ہوتے ہوئے ہم اپنی روزمرہ کی زندگی اور معیار زندگی پر اس کے پیچیدہ تاثر سے بچ نہیں سکتے۔ تاہم زندہ رہنے کے عمل کے دوران ایسی کئی مثالیں پیدا ہوتی ہیں جب ہمارے اندر پوشیدہ انسانیت ہمیں اپنے اردگرد پائے جانے والے تضادات کا جائزہ لینے اور اس کے خاتمے کے لیے اقدامات کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

انسانی تحریک بربریت اور دوسروں کے عقائد اور اقدار کے ساتھ عدم رواداری سے بھری پڑی ہے۔ مگر اس کے برعکس یہ ایسی مثالوں سے بھی بھری پڑی ہے جہاں لامحدود بے غرضی ظاہر ہوتی ہے اور جنس، ذات، عقیدے یا مذہب کی بنیاد پر پائے جانے والے تعصب یا ایذا رسانی کو ترک کیا گیا ہے۔ انسانی حقوق جدید معاشرے یا ہم عصر انسان کے پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ تمام ادوار میں کیے گئے متعدد انسانیت دوست اقدامات کے ذریعے نمو پذیر ہوئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔اس کے روشن خیال خیالات کسی ایک جغرافیائی ریاست تک محدود نہیں ہیں بلکہ مشترکہ انسانی سوچ کے تشکیل شدہ ہیں۔قبل از تاریخ قدیم قبائلی معاشرے، پہلے مرتب شدہ مذہبی متن اور اقوام متحدہ کے منشور کے حالیہ دور تک، سب کا مقصد انسانیت کے مصائب کو کم کرنا تھا۔عالمی منشور برائے انسانی حقوق کا اقوام کی جانب سے تسلیم کیا جانا اس عالمی تصور اور اس ذمہ داری سے ریاستوں کی آگہی کا ثبوت ہے۔

روشن خیال تصورات

انسانی حقوق کو تسلیم کرنے سے ایک آدمی کی ذمہ داری صرف اس کے خاندان، معاشرے، طبقے، ذات، مذہب یا قوم تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ تمام انسانیت کو جوابدہ ہوتا ہے۔پیغمبروں اور اولیاء نے انسانیت کا پیغام پھیلانے اور لوگوں کو ان کے حقوق اور اخلاقی فرائض سے آگاہ کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔مذہبی و اخلاقی نظریہ حیات کی مناسبت میں ہی پہلے اور مابعد ادوار میں آنے والے دانشوروں اور فلاسفروں کے اخلاقی اور سیاسی افکار نے بھی اس ارتقائی عمل کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔بنی نوع انسان کے وجود کی فطرت اور سبب معلوم کرنے کے لیے تحقیقات کی تگ و دو کرنے کے سلسلے میں مذہب اور فلسفہ مشترکہ خصوصیت کے حامل ہیں۔

اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ قبل از تہذیب قبائلی معاشروں میں بھی ہم وطن شہریوں کے حقوق کی قبولیت پائی جاتی تھی۔تحریری کی بجائے زبانی الفاظ پر انحصار کرنے والے سادہ قبائلی معاشرے بھی اپنے مشترکہ رہن سہن میں ایک دوسرے کے حقوق و فرائض سے آگاہ تھے۔قبائلی قوانین میں مقامی امریکی کمیونٹی نے اپنے معاشرے کو چلانے کے لیے ''پانچ اقوام کے لوگوں کے حقوق'' تشکیل دیئے۔اسی طرح، روایتی افریقی ثقافتوں نے انصاف، انسانی عظمت، آزادی کے حصول اور سیاسی طاقت کے استحصال سے تحفظ جیسے افکار پیدا کیے۔تقریباً 24 سو برس قبل، چینی دانشور ماؤزے نے موہسٹ مکتبہ فکر کے اخلاقی فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ان کی تعلیمات نے معاشرتی حیثیت سے قطع نظر ایک دوسرے کے لیے احترام، ذمہ داری اور ایثار کی اہمیت پر زور دیا۔بعد ازاں، کنفیوشیت مکتب کے مبلغ مینگزی نے تمام افراد میں موجود پوشیدہ انسانیت اور اچھائی کے تصورات کی اہمیت کو اجاگر کیا۔مینگزی یا مینکی جس نام سے اسے عموماً پکارا جاتا تھا، نے حکومت یا حکمرانوں پر واجب الادا رعایا کے حقوق پر زور دیا۔اپنے آقا کی خواہشات کی پیروی کرنے پر کاربند رعایا پر بادشاہ کی استبدادی طاقت جیسے سابقہ خیالات کے برعکس، کنفیوشیت نے اس کے برعکس تبلیغ کی۔یہ زور دیا گیا، ''فرداً محدود عظمت کا حامل ہے، ادارے اور روایات بعد میں آتی ہیں'' اور حکمران کی ذات کم اہمیت کی حامل ہے''۔مزید برآں یہ کہا گیا کہ ''لوگوں کے پاس مطلق العنان حکمران کو اقتدار سے ہٹانے کا حق ہے''......اس وقت کے سماجی و سیاسی ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ایک انقلابی نقطہ نظر تھا۔اس وقت نہ صرف مشرقی ایشیا کا قطعہ انفرادی حقوق کی قبولیت کی اجتماعی آگہی کا تجربہ کر رہا تھا بلکہ اس طرح کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دانشورانہ تصورات کا سراغ مشرق وسطیٰ کے دورافتادہ علاقوں میں بھی ملتا ہے۔قدیم مصر میں ظہور پذیر ہونے والے قوانین اور عقائد میں سماجی انصاف، مساوات اور ہر طبقے کے ساتھ ناروا سلوک کے خاتمے جیسے معاملات پر توجہ دی گئی تھی۔البتہ اس وقت سب سے بڑی کاوش کا مظاہرہ بابل کے حکمران حمورابی نے کیا۔ 1780 قبل از مسیح میں زیر عمل لائے گئے حمورابی مجموعہ قوانین (Code of Hamu rabi) میں اعلان کیا گیا کہ بعض قوانین اتنے اہم ہیں کہ وہ بادشاہ سمیت ہر کسی پر لاگو ہوتے ہیں۔ یہ اصول انسانی حقوق کے تحفظ کی اہمیت پر زور دیتا ہے کیونکہ یہ طاقت کے ناروا استعمال کے خلاف ایک رکاوٹ ہے اور امیر کی طرف سے غریب کو ظاہر کی جانیوالی احساس برتری کی مذمت کرتا ہے۔

اسی طرح، یونان کے دانشوروں نے تمام انسانوں کے لیے یکساں عالمگیر قوانین متعارف کروانے کی جدوجہد شروع کردی۔ان کے مطابق یہ فطری قانون عالمگیر اور ازلی ہے اور چنانچہ کسی مخصوص ریاست کے لیے مختلف راسخ احکامات یا کسی ایک معاشرے کے لیے مختص روایات یا ضوابط سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ یہ قانون ازلی ہے اس لیے انسانی رویے کو اس کی مطابقت میں لانا چاہئے۔ افلاطون اور سقراط جیسے دانشوروں نے اخلاقی انصاف کا ایک عالمگیر معیار تشکیل دینے کی بات کی، جو تمام انسانوں کے لیے قابل نفاذ ہو جو قابل قبول اور ناقابل اقدامات کا تعین کرے، قطع نظر ان معاشروں کے جہاں سے انہوں نے جنم لیا ہے۔ان خیالات کی مطابقت میں دوسرے بڑے دانشور، ارسطو نے اس تصور کی حمایت کی کہ فطری قوانین محض فطرت کی جانب سے مقدم قرار دیئے گئے ہیں اور دنیاوی قوانین سے رد نہیں کیے جاسکتے۔

یہی اصول روی دانشوروں نے بھی اختیار کیے جنھوں نے کہا ''یہ قوانین تمام کائنات کو چلانے کے لیے منطقی اور مساوی اصول فراہم کرتے ہیں۔'' ان کا کہنا تھا کہ فطری واقعات کو کنٹرول کرنے والے منظم ضوابط کا اطلاق بنی نوع انسان پر بھی ہونا چاہئے تاکہ نظم ونسق کا ایک متحد اور حقیقی نظام قائم کیا جاسکے۔ رومی دانشوروں کی ایک بہت بڑی کاوش ''قانون برائے اقوام'' ہے جو کہ عالمی معاشرے کا رکن ہونے کی حیثیت سے تمام انسانوں پر قابل اطلاق حقوق وفرائض بیان کرنے والا ایک مجموعہ قوانین ہے۔

البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ سائرس اعظم کی قدیم ایرانی رسم الخط کی تحریریں انسانی حقوق کے وجود اور قبولیت کی توثیق کرنے والے پہلے متن ہیں۔ ایرانی سلطنت کے حکمران، عظیم سائرس کی جانب سے 539 قبل از مسیح میں نافذ شدہ سائرس منشور دنیا میں انسانی حقوق کا پہلا منشور تسلیم کیا جاتا ہے۔ برصغیر ہندوستان بھی ایسے افکار کے فروغ میں بہت زیادہ شریک تھا۔قدیم سنسکرت متنوں میں رعایا کی فلاح و بہبود کے حوالے سے حکمرانوں پر عائد ذمہ داریوں کا ذکر ملتا ہے۔ ہندوستانی علاقے میں انسانیت دوست قیادت پیدا ہونے کی سب سے بڑی مثال اشوک ہے۔ عقیدے کے لحاظ سے ایک بدھ مت تھا اور اس نے اپنی مذہبی افکار کو سیاسی تصورات میں تبدیل کیا۔اس کے معروف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احکامات کو پتھر کے ستونوں پر کندہ کر کے سلطنت کے تمام علاقوں میں نمایاں کیا گیا تاکہ سب کے لیے اس کے غیر جانبدار انصاف، عدم تشدد اور شفقت کے جذبے کو ظاہر کیا جا سکے۔ ان افکار میں عبادت کی آزادی کے حق اور سماجی برابری پر زور دیا گیا تھا۔ بعد ازاں یہی اصول چیتانیا جیسے ہندو دانشور اور سکھ رہنما، گرو گوبند سنگھ کی جانب سے پیش کیے گئے۔ چیتانیا نے ہندو معاشرے کے ''ذات پات کے نظام'' کو مسترد کیا اور کہا کہ دنیا میں صرف ایک ذات ہے اور وہ انسانیت ہے جبکہ گوبند سنگھ نے انسانی نسل کو ایک عالمگیر معاشرہ تسلیم کرتے ہوئے ذات کے نظام کے خاتمے پر زور دیا۔

چنانچہ یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی حقوق لوگوں کی اجتماعی ضروریات سے پیدا ہوئے ہیں تاکہ استبدادی اور متعصب روایات کے متشدد احکامات سے نجات حاصل کرنے کی خواہش ظاہر ہو سکے۔ ان کی ترقی کسی ایک علاقے یا کسی مخصوص سیاسی نظریے تک محدود نہیں ہے۔ یہ تصورات ایک مشترکہ سیاسی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں جو انسانیت دوست ہونے کے ناطے مختلف علاقوں اور سیاسی نظریے کے حامل دانشوروں کی کاوشوں سے پروان چڑھے۔

ارتقائی دور

ایسا نہ سوچیں کہ فکر انگیز اور پرعزم لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروپ دنیا کو تبدیل نہیں کر سکتا، حقیقتاً ایسا ہی ہوا ہے۔ بنی نوع انسان کے حقوق کا تصور افراد کو حاصل استحقاق کے دعوے کے طور پر نہیں بلکہ ایک دوسرے کے لیے ان پر عائد فرائض پر بات چیت کرنے کے ذریعے ابھرا ہے۔ تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے پیچیدہ اور باہم منسلک بیشتر واقعات کے نتیجے میں ابھرنے والے طاقتور اور موثر خیالات نے ان تصورات کو جنم دیا ہے۔ ایسے خیالات بعض اوقات قدرتی پیغمبرانہ بصیرت کے اور بعض دفعہ اس کے برعکس دور رس اثرات چھوڑنے والے والی تاریخ میں واقعہ ہونے والے ہنگامہ خیز انتشار کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔

مذہب نے ابتدائی طور پر اپنے ادوار کے روایتی، درجہ وار اور پدرانہ معاشروں میں عام آدمی کی حالت زار کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان نظریات کے ذریعے تبلیغ کیے جانے والے عقائد کی بنیاد مجموعی طور پر اخلاقی اقدار پر تھی اور مسائل کے حل کے لیے انہیں عملی اقدامات میں بدلنے کو کہا گیا تھا۔ نتیجے کے طور پر ان مذہبی اقدار نے انسانی حقوق کی بحث کو جاری رکھنے کی بنیاد فراہم کی۔

اس حقیقت کا اعتراف پال لارن نے بھی کیا ہے جو کہتے ہیں کہ اول، یہ کہ ان اخلاقی اقدار نے بنی نوع انسان کی قدر اور عظمت کا نوٹس لینے اور خیال رکھنے جیسے ازلی مقاصد اور مسلمہ اصولوں کو قائم کرنے میں مدد دی ہے۔ ان اقدار نے ثابت قدمی کے ساتھ اپنے مشن کو جاری رکھنے کے جذبے کے ساتھ ان مقاصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرنے والے افراد کو بنیاد بھی فراہم کی۔ دوئم، یہ کہ مذہب نے تشریحات پیش کر کے لوگوں کے حقوق سے متعلقہ مسائل کے حل کے لیے متبادل انقلابی تصور بھی پیش کیا جس نے حسب سابق صورتحال کو چیلنج کیا۔ بعد ازاں یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کشیدگی بعض وابستہ مفادات اور راسخ روایات کے استبداد پر مبنی طاقت کے ڈھانچوں کے خلاف سیاسی مزاحمت کی صورت اختیار کر گئی۔ سوئم، یہ کہ مذہب کی حمایت یافتہ اخلاقی اقدار نے دوسروں کے ایماء پر کام کرنے کی ذمہ داری کا تصور پیدا ہونے میں مدد دی، جو کہ انسانی حقوق کی تحریک کی ترقی کے لیے ضروری عنصر ہے۔ اس کے بغیر انسان کی بصیرت اس کی اپنی ذات سے آگے نہ بڑھتی اور عالمگیریت کا تصور پیدا نہ ہوتا۔ اور آخری اور سب سے اہم بات، مذہب نے دوسروں پر عائد ذمہ داری اور آدمی کے اپنے حقوق کے باہمی انحصار کی حقیقت کا انکشاف کیا۔ اس نے ذمہ داریوں اور حقوق کے باہمی تعلق کی حقیقت کو بیان کیا جو صرف اس وقت مستحکم رہ سکتی ہے اور حاصل ہو سکتی ہے جب بیک وقت دونوں ساتھ ساتھ چلیں۔

مذہبی تکثیریت

ہم ان حقائق کو خود آشکار پاتے ہیں؛ کہ تمام انسان برابر کی بنیاد پر پیدا ہوئے ہیں کہ انہیں اپنے خالق کی جانب سے چند ناقابل زوال حقوق عطا ہوئے ہیں کہ ان میں زندگی، آزادی اور خوشی کے حصول کی جستجو شامل ہے۔

ہر مذہب کے عقائد نے حقوق کی ابتدائی بحث و مباحثہ کو فروغ دیا چنانچہ ''انسانی فرائض کے تصورات نے بالکل قدرتی طور پر انسانی حقوق کے تصورات کو جنم دیا۔ ثقافتی اور وقتی اختلافات کے باعث پائے جانے والے اختلاف کے باوجود، دنیا کے تمام مذاہب ایک نقطے پر متفق ہیں...... دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانا چاہیے۔ اس بنیادی اتفاق کے باعث انہوں نے انسانی حقوق کے تصور کو منانے کا باہمی راستہ اختیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندومت موجودہ مذاہب میں سے سب سے قدیم مذہب ہے۔ اگرچہ اسکے مذہبی متن تین ہزار برس پرانے ہیں، ان میں سچائی اور زندگی کے احترام پر زور دیا گیا ہے۔ وہ دوسروں کی جانب فرائض کی ادائیگی، انصاف، اخلاقیات اور اچھے رویے کا مظاہرہ کرنے پر خصوصی زور دیتے ہیں۔ ہندومت کی بنیاد عقیدہ تناسخ اور اعمال پر ہے اور ایک میکانزم متعارف کروایا گیا ہے جس پر عملدرآمد کر کے پیروی کرنے والوں کو دوسروں کے ساتھ عاجزی اور نرم مزاجی سے پیش آنے کی ہدایت کی گئی ہے، بصورت دیگر انہیں اپنی بعد از مرگ زندگی میں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ مزید برآں تمام انسانوں کو ساوی وجود کی عکاسی کرنے والے وسیع اور مقدس زندگی کے سلسلہ کا ایک حصہ سمجھا گیا ہے چنانچہ ان کی عزت و تکریم پر زور دیا گیا ہے۔ بعد ازاں، برصغیر کو پچیس سو برس قبل ایک اور مذہبی شعور کا تجربہ ہوا جب سدارتھا گوتم نے خود آشنائی حاصل کرنے کے لیے شاہی زندگی کو ترک کیا۔ بدھ مت میں انسانی تعلقات کی عالمگیر حیثیت اور ان کے ایک دوسرے سے باہمی تعلق پر واضح روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی تعلیمات میں تمام زندہ مخلوقات سے محبت کرنیکی تاکید اور برہمنی ذات سسٹم کی مذمت پر زور دیا گیا ہے۔ بدھ مت کے بادشاہوں کے فرائض اور انمول آٹھ سمتی راستہ، میں پیروکاروں کو ''دوسروں کے ساتھ درست سوچ' درست زبان، درست عمل اور درست جدوجہد'' کا مظاہرہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔کنفیوشیت تقریباً بدھ مت کے دور میں ہی ایک جیسی تعلیمات کے ساتھ نمو پذیر ہوا۔ البتہ کنفیوشیت نے روحانی کی بجائے جسمانی زندگی کے دائرہ کار میں لوگوں کے رویہ جات اور آپس کے معاملات پر اپنی توجہ مبذول کی۔

''آپ جبر نہیں کرو گے' آپ ناانصافی نہیں کرو گے۔آپ اپنے ہمسایہ کے ساتھ اتنی ہی محبت کرو گے جتنی خود سے کرتے ہو'' یہ اور اس سے ملتی جلتی تعلیمات یہودیت کے قدیم ابراہیمی مذہب میں بیان کی گئی تھیں۔دو ہزار برس قبل توریت کی پہلی کتاب تخلیق (Genesis) کے شروع میں تمام لوگوں کے لیے خدا کی مشترکہ پدریت اور لوگوں کی ایک دوسرے پر واجب الادا مقدس ذمہ داریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دس احکامات میں بھی دشمنوں اور دوستوں سب کے ساتھ انصاف، دولت اور ہمدردی کرنے جیسی تعلیمات ہیں۔یہودی مذہبی عالم مارٹن ببر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان احکامات سے ایک مذہبی روایت قائم ہونے میں مدد ملی جس کے باعث پیروکاروں نے اپنی ذات سے آگے دیکھنا شروع کیا اور دنیا میں دوسروں کے ایماء پر اقدامات اٹھانے کا عمل شروع کیا۔

عیسایت نے ذمہ داری کے اس اصول کو مزید توسیع دی جب اس کے رسول نے اپنے پیروکاروں کو انسانیت کی خدمت کر کے خدا کی شکرگزاری کرنے کی ہدایت کی۔دیگر پیغمبروں اور اولیاء کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محبت، ہمدردی، انصاف اور امن کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تبلیغ کی۔مزید برآں، انہوں نے خواتین، بچوں، بے کسوں اور اجنبی افراد کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردی کرنے کی تلقین کی۔حضرت عیسیٰ کے پیروکاروں اور عیسایت کے مبلغین نے بھی اپنے رہبر کی طرح انسانیت کے پیغامات کی تبلیغ کی۔پانچ سو برس بعد بنجر عربی علاقے نے اسلامی تعلیمات کی شکل میں ایک اور روحانی تحریک کا سامنا کیا۔سب سے مقدس کتاب قرآن پاک میں طبقہ، ذات یا مذہب سے قطع نظر سماجی انصاف، زندگی کا احترام، رحم، ہمدردی اور تمام انسانوں کی عزت جیسے تصورات کی تبلیغ کی گئی۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ وہ نہ صرف ایک پیغمبر اور استاد تھے بلکہ ایک منتظم اور سیاستدان بھی تھے۔چنانچہ مذہبی عقیدے اور سیاسی سماج کے مابین رابطے کو تسلیم کیا گیا اور اس کا مقصد انسانیت کے عظیم مفادات پر پورا اترنا قرار دیا گیا۔حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانی حقوق کی نشو و نما کے لیے کئی نئی چیزیں لے کر آئے۔دھوکہ دہی، استبداد اور ناانصافیوں میں مبتلا ایک معاشرے میں، اسلام نے سماجی تحفظ، خاندانی ڈھانچے، غلامی اور خواتین و نسلی اقلیتوں کے حقوق کے میدان میں سماجی اصلاحات متعارف کروائیں۔درحقیقت تاریخ میں پہلی مرتبہ خواتین کو وراثت میں حصہ، پسند کی شادی اور علیحدگی کا حق دیا گیا جو کہ ان علاقوں میں ان سنا رواج تھا۔اسلامی تحریک کی انسانی حقوق کے میدان میں ایک اور بڑی کامیابی مدینہ کا منشور ہے۔منشور میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں اور مسیحوں کے تحفظ اور برابر حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے۔عبادت کرنے اور عقیدے کی تبلیغ کی آزادی اور تشدد و فساد کے خاتمے کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔جنگی قیدیوں کو حقوق فراہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کئے گئے اوران کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تلقین کی گئی۔ اپنے الوداعی خطبے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا "آپ کی زندگی، جائیداد اور عزت اس دن، مہینے اور مقام کی طرح مقدس ہے۔ ان کی بے حرمتی نہ کرو"۔

چنانچہ یہ امر طے شدہ ہے کہ اپنی سماوی یا دنیاوی ابتداء سے قطع نظر مذہبی عقائد میں بنی نوع انسان کے حقوق اور دنیا میں ان کے اچھے مقام پر زور دیا گیا ہے۔ روحانیت کے حصول کی جستجو اور اس کی مشق پر عملدرآمد میں غالباً اختلاف کے علاوہ یہ دیکھا گیا ہے کہ عام لوگوں کے حوالے سے دی گئی ہدایات تمام مذاہب میں ایک جیسی ہیں۔ ان عقائد نے بالآخر انسانی حقوق کے ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کیا، جن سے ہم آج کے دور میں آگاہ ہیں۔

ماحصل

بے شمار عشروں تک فلسفیانہ نظریات کے تصورات کی توجہ کا مرکز انسانوں کے مفادات کے لیے حقیقی قوانین کا نفاذ کی بجائے فطری قانون اور لوگوں کی دوسروں کو واجب الادا اخلاقی ذمہ داریاں رہا ہے۔ مذہبی اور فلسفیانہ نظریے کا سیاسی، معاشی اور سماجی پالیسی میں ارتقاء کا عمل بہت بعد میں آہستہ آہستہ ہوا۔ جاگیرداری کے زوال اور روشن خیالی اور انفرادی حقوق کے ظہور نے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا جس کے ذریعے لوگوں نے اپنی فلاح و بہبود کے لیے خودمختاری حاصل کی۔ 1215 میں منشور اعظم کی توثیق اور چودھویں و پندرہویں صدی میں تحریک نشاۃ ثانیہ کی بدولت پیدا ہونے والی آگہی نے اس تصور کو مزید مستحکم کیا۔ جان لاک، روسو، والٹیئر اور ہیوم جیسے لوگوں کی جانب سے متعارف شدہ دانشورانہ اور فلسفیانہ نظریات کی بدولت روشن خیالی کی تحریک پیدا ہوئی جس کا مقصد عوام کو روایتی عقائد، جبر، مراعات اور تشدد سے آزاد کرانا تھا۔ تھامس پین بھی ایک بڑا انقلابی تھا جس نے عوام کے فطری حقوق کے لیے جدوجہد کی۔ بالآخر دو عالمی جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تباہی کے بعد، پوری دنیا کی قوموں نے 1919 میں انجمن برائے اقوام کا ادارہ قائم کیا جو بعد ازاں اقوام متحدہ کی شکل میں سامنے آیا۔ ان بین الاقوامی تنظیموں کے زیر سایہ 1948 میں عالمی منشور برائے انسانی حقوق معرض وجود میں آیا۔ یہ اعلامیہ پہلی بین الاقوامی کوشش ہے جس کے ذریعے ریاستی طاقت کو محدود کرنے اور اپنے شہریوں کے حقوق کو تحفظ دینے پر زور دیا گیا۔ مزید برآں قوموں پر زور دیا گیا کہ وہ اس اعلامیہ میں موجود بیشتر انسانی، معاشی اور شہری حقوق کو اپنے شہریوں کے فطری حقوق کا حصہ قرار دیں۔

بین الاقوامی دنیا میں انسانی حقوق کی قبولیت نے ثابت کردیا ہے کہ روشن خیالی پر مبنی پہلے ادوار کے فلسفیانہ اور مذہبی افکار محض خواب دیکھنے والوں کے خام خیالات نہیں تھے۔ درحقیقت یہ بہتر مستقبل کی رہنمائی کرنے والے افکار تھے جنہوں نے انسانی حقوق کے منشور کی بنیاد فراہم کی ان کے خیالات اور افکار نے انسانی فطرت کی برائی کی بجائے اچھائی کو اجاگر کرکے انسانی حقوق کے ارتقاء کی رہنمائی کی۔

(بشکریہ: جہد حق۔ نومبر 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسانی حقوق کا ارتقاء، عصری تقاضے اور اقوام متحدہ کا کردار

(اشرف شریف)

انسانی سماج کی تشکیل کے ساتھ ہی جو پہلا مسئلہ پیدا ہوا وہ کمزور اور طاقتور کے مابین توازن تعلقات کا تھا۔ اس وقت انسان کی ایجاداتی اور سائنسی قوت نہ ہونے کے برابر تھی لہٰذا توازن تعلقات کا مسئلہ جسمانی طور پر طاقتور اور کمزور کے دائرہ میں رہا۔ تاریخ کے وہ ادوار جو تحریر اور یادداشت کی رسائی سے ماوراء ہیں ان میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول ہی تنازع کا حل ہوتا ہوگا۔ پھر وہ عہد ہمارے سامنے آتا ہے جس کے آثار مدفون تہذیبوں سے نکلے۔ محققین کی توجہ ان تہذیبوں کے سیاسی اور معاشی پہلوؤں پر رہی ہے۔ انسانی حقوق کے تصورات کے لئے ہمیں سینہ بہ سینہ وصول ہونے والی روایات اور دستیاب آثار قدیمہ، مخطوطات، پتھروں پر نقش، تصویروں و تحریروں اور سیاسی نظام پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ یہ آثار اور روایات بتاتے ہیں کہ طاقتور کمزور پر حکومت کرتا تھا۔ طاقتور کمزور کا مال ہتھیا لیتا، طاقتور عورتوں کا مالک ہوتا اور طاقتور آقا بن کر کمزور کو غلام بنا لیتا۔

انسانی معاشرہ کرۂ ارض کے مختلف علاقوں میں منقسم تھا لیکن غلامی کا تصور اکثر جگہ ایک جیسا تھا۔ مذاہب اور ادیان نے دنیا کے ہر طاقتور کو سب سے طاقتور ہستی کے سامنے جوابدہ قرار دے کر انسانی آزادیوں کا الہامی تصور پیش کیا۔ مذہب نے کچھ آزادیوں کو ختم بھی کیا جس سے انسانی حقوق کے ماہرین ایک لامختتم بحث میں کود پڑے جو آج تک جاری ہے۔ مسلمان پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ حجتہ الوداع کو انسانی حقوق کا چارٹر مانتے ہیں۔ قدیم ہندوستان میں ذات پات اور نسل کا امتیاز اور عورتوں کی کم تر حیثیت انسانی حقوق کے جدید تصور کے خلاف تھے۔ یونانی تہذیب نے انسانی حقوق کے تصور کو الگ سے نہیں دیکھا بلکہ اسے سیاسی نظام کی صورت میں مختلف تجربات سے گزارا۔

انسان نے شعور اور ایجادات کا سفر شروع کیا تو ایک دوسرے کے لئے نامعلوم بستیاں باہمی روابط استوار کرنے لگیں۔ ایک بار پھر طاقتور حملہ آور بن کر امن پسندوں پر چڑھ دوڑے۔ یہ عمل کئی ہزار سال جاری رہا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس جنگ و جدل میں صرف انسان ہی انسان سے نہیں لڑا بلکہ ایک علاقے کا شعور اور ایجاد بھی دوسرے علاقے سے برسر پیکار ہوئی۔ ان جنگوں میں کئی بار ایسا ہوا کہ کم تعداد اور جسمانی طور پر کمزور اپنے سے طاقتور اور بڑے لشکر سے جیت گئے۔ اب طاقت کی فلاسفی اور توازن طاقت (Balance of Power) کی بحث کا آغاز ہوا۔ کبھی کمزور اور کبھی طاقتور ریاستوں نے ایک دوسرے سے اتحاد کیا لیکن آخری نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی نہ کسی کا حق غصب کیا جاتا رہا۔ ٹیکنالوجی اور انڈسٹری کا انقلاب آیا تو انسانی سماج کا ہر کل پرزہ نئے سرے سے بٹھایا جانے لگا۔ بڑے ممالک کی تعریف آبادی اور رقبہ کی بجائے معاشی ترقی اور نظام کے استحکام کو پیش نظر رکھ کر کی جانے لگی۔ نوآبادیاتی نظام کو ہدف تنقید بنایا جانے لگا۔ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خاتمہ کی تحریک مقبول ہوئی۔ حق خود ارادیت کا تصور اُبھرا' معاشی مساوات کی بحث شروع ہوئی۔

یہ پہلی جنگ عظیم تھی جس نے دنیا بھر کے انسانوں کو ایک بین الاقوامی نظام میں شامل کرنے کی سوچ پیدا کی۔ اس سوچ کا نتیجہ 1919ء میں لیگ آف نیشنز کے قیام کی صورت سامنے آیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد 1945ء میں اقوام متحدہ قائم ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم میں ڈیڑھ کروڑ لوگ ہلاک ہوئے۔ ان میں مسلح افواج سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد 90 لاکھ تھی باقی 60 لاکھ عام شہری تھے۔ 22 لاکھ افراد زخمی ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں 6 کروڑ مرنے والوں میں سے 3.2 کروڑ سویلین تھے۔ ان جنگوں اور جغرافیائی تنازعات نے مزدور حقوق' عورتوں کے حقوق' اظہار رائے کی آزادی' معاشی آزادیوں' اقلیتوں اور کمزور طبقات کے حقوق' سیاسی حقوق' تعلیم اور روزگار کے حقوق اور بچوں کے حقوق پر توجہ مبذول کرائی۔

اقوام متحدہ کے قیام کی فوری وجہ اگرچہ مستقبل کی جنگوں کو روکنا اور تنازعات کے پرامن حل کی راہ ہموار کرنا تھا لیکن اس ادارے نے انسانی فلاح و بہبود کے دوسرے شعبوں تک اپنا کردار پھیلایا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی' سوشل اینڈ اکنامک کونسل اور عالمی عدالت انصاف اور ذیلی ادارے انسانی حقوق کا شعور پیدا کرنے اور رکن ممالک میں ضروری قانون سازی کے لئے شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کے چارٹر میں انسانی حقوق کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے شق 5 میں ادارے کے مقاصد کی یوں نشاندہی کی گئی ہے:

''اقوام متحدہ کے مقاصد میں مذہب' صنف' نسل اور زبان کے امتیاز کو پس پشت ڈالتے ہوئے ہر فرد کے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کو تقویت دینا ہے۔''

گویا اقوام متحدہ کے قیام کے ساتھ ہی انسانی حقوق کے ایک نئے بین الاقوامی نظام کی بنیاد رکھی گئی جو انسانوں میں مذہب' صنف' نسل اور زبان کے امتیازات کی نفی کرتا ہے۔ جنرل اسمبلی کے اختیارات و فرائض کی تفصیل اقوام متحدہ کے چارٹر کی شق 13 کی ذیلی شق 2 میں پیش کرتے ہوئے انسانی حقوق کے معاملے کو اہمیت یوں دی گئی:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''جنرل اسمبلی کے اختیار اور فرائض میں شامل ہے کہ وہ اقتصادیات' معاشرت' ثقافت' تعلیم اور صحت کے شعبوں میں بین الاقوامی اشتراک عمل کو رواج دے اور نسل' صنف' زبان اور مذہب کی تفریق سے الگ ہو کر سب لوگوں کو انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے حصول میں مدد دے۔''

سوشل اور اکنامک کونسل کے اختیارات و فرائض کا ذکر اقوام متحدہ کے چارٹر کی شق 61 میں کیا گیا اس کی ذیلی شق 4 میں بتایا گیا ہے کہ:

''کونسل پر فرض ہے کہ وہ سب لوگوں کے لئے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے اصولوں کے احترام اور ان پر عمل درآمد کو بہتر بنانے کے لئے تجاویز دے۔''

اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کے اکثر تصورات مہذب (Civilized) ریاستوں کے رواجاتی قوانین سے اخذ کیے ہیں۔ انسانی حقوق کے متعلق ان ریاستوں کی عدالتوں اور معروف قانون دانوں کی آراء کو اولیت حاصل ہے تاہم کسی اختلاف رائے' تشریح میں اختلاف یا کسی دوسری قانونی دشواری کے پیش نظر عالمی عدالت انصاف سے مدد لی جا سکتی ہے۔

اقوام متحدہ کے تحت کام کرنے والے کچھ اداروں کا کردار بالواسطہ طور پر انسانی حقوق کی صورت حال میں بہتری لانے سے متعلق ہے۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں انقلاب فرانس 1789ء کے بعد ''انسانی حقوق'' کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ انقلاب فرانس برپا کرنے والوں نے جو اعلان شائع کیا' اس میں حقوق انسانی میں یکسانیت پر زور دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور وہ آزاد ہی رہے گا' اس لئے تمام انسان مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور مساوی حقوق کے حامل ہیں۔'' اس اعلان میں افراد کے بنیادی شہری حقوق کو بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ اعلان انسانی حقوق کا علمبردار تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں سامراجی قوتوں نے نوآبادیاتی نظام کی صورت میں انسانی حقوق کو کچل کر رکھ دیا اور دنیا کے اکثر ممالک غلامی کے چنگل میں جکڑے رہے' تاہم وقفہ وقفہ سے انسانی حقوق میں مساوات کے حصول کی آواز اٹھتی رہی۔ بیسویں صدی عیسوی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ''مجلس اقوام'' کا ادارہ وجود میں آیا' جو انسانی حقوق کے سلسلہ میں کوئی خاص قرارداد منظور نہ کر سکا اور نہ ہی امن عالم بحال رکھنے میں کامیاب ہو سکا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران 1941ء میں ''منشور اوقیانوس'' (Atlantic Charter) وجود میں آیا' جس میں کہا گیا تھا کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد انسانی حقوق کو تحفظ دیا جائے گا۔ جنگ عظیم دوم کے خاتمہ کے بعد اقوام متحدہ کا ادارہ وجود میں آیا' جس نے 10 جنوری 1946ء کو اپنی جنرل اسمبلی کے پہلے اجلاس میں منظور کی جانے والی قرارداد میں اعلان کیا کہ:

''ہم باشندگانِ اقوام متحدہ اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نجات دلائیں گے، بنیادی حقوق کی قدر و قیمت، مرد و عورت اور چھوٹی اقوام کے مساویانہ حقوق کی توثیق کرتے۔‘‘

استحکام اور خوشحالی کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے کی غرض سے جو مساوی حقوق اور لوگوں کی خود مختاری کے اصول پر مبنی قوموں کے مابین پر امن اور دوستانہ تعلقات کے لئے لازم ہیں، اقرار کی ترویج کرے گی۔

(ا) بلند تر معیار زندگی، سب کے لئے روزگار اقتصادی اور معاشرتی نشو و نما کے امکانات۔

(ب) اقتصادیات، معاشرت، صحت اور دوسرے متعلقہ بین الاقوامی مسائل کے حل اور ثقافتی اور تعلیمی امور میں بین الاقوامی تعاون۔

(ج) جنس، زبان یا مذہب کی تفریق سے علیحدہ ہو کر سب کے واسطے انسانی اور بنیادی آزادیوں کا عالمگیر احترام اور ان کی پابندی۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights)

اقوام متحدہ نے 10 دسمبر 1948ء کو اپنی جنرل اسمبلی کی منظور شدہ قرارداد کے تحت انسانی حقوق سے متعلق جو اعلان کیا اسے ’’انسانی حقوق کا عالمی منشور‘‘ کہا جاتا ہے۔ یہ منشور 30 دفعات پر مشتمل ہے۔

عالمی منشور کا ابتدائیہ حسب ذیل ہے:

1- چونکہ ہر انسان کی ذاتی عزت اور حرمت انسانوں کے مساوی اور ناقابل انتقال حقوق کو تسلیم کرنا دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کی بنیاد ہے۔

2- چونکہ انسانی حقوق سے لاپروائی اور ان کی بے حرمتی اکثر ایسے وحشیانہ افعال کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جن سے انسان کے ضمیر کو سخت صدمے پہنچے ہیں اور عام انسانوں کی بلند ترین آرزو یہ رہی ہے کہ ایسی دنیا وجود میں آئے جس میں تمام انسانوں کو اپنی کہنے اور اپنے عقیدے پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو اور خوف اور احتیاج سے محفوظ رہیں۔

3- چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عملداری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے، کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ انسان عاجز آ کر جبر اور استبداد کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہوں۔

4- چونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بڑھایا جائے نہ کہ اقوام متحدہ کی ممبر قوموں اور عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدے کی دوبارہ تصدیق کر دی ہے اور وسیع تر آزادی کی فضا میں معاشرتی ترقی کو تقویت دینے اور معیاری زندگی کو بلند کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

5- چونکہ ممبر ملکوں نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے اشتراک عمل سے ساری دنیا میں اصولاً اور عملاً

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا زیادہ احترام کریں گے اور کرائیں گے۔

6- چونکہ اس عہد کی تکمیل کے لئے بہت ہی اہم ہے کہ ان حقوق اور آزادیوں کی نوعیت کو سب سمجھ سکیں لہٰذا: جنرل اسمبلی اعلان کرتی ہے کہ انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا مشترک معیار ہوگا تاکہ ہر فرد اور معاشرے کا ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کا احترام پیدا کرے اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کارروائیوں کے ذریعے ممبر ملکوں میں اور ان قوموں میں جو ممبر ملکوں کے ماتحت ہوں' منوانے کے لئے بتدریج کوشش کرسکے۔ اس منشور میں کہا گیا کہ:

7- تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں انہیں ضمیر ودیعت ہوا ہے اس لئے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہئے۔

8- ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کئے گئے ہیں اور اس حق پر نسل' رنگ' جنس' زبان' مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے' قوم' معاشرے' دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اس کے علاوہ جس علاقے یا ملک سے جو شخص تعلق رکھتا ہے اس کی سیاسی کیفیت' دائرۂ اختیار یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر اس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں روا رکھا جائے گا' چاہے وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا سیاسی اقتدار کے لحاظ سے کسی دوسری بندش کا پابند ہو۔

9- ہر شخص کو جان' آزادی اور تحفظ کا حق ہے۔

10- کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جاسکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی چاہے کسی شکل میں ہو ممنوع قرار دی جائے گی۔

11- کسی شخص کو جسمانی اذیت یا ظالمانہ' انسانیت سوز یا ذلیل سلوک یا سزا نہیں دی جائے گی۔

12- ہر شخص کا حق ہے کہ ہر مقام پر قانون اس کی شخصیت کو تسلیم کرے' خواہ اس کا تعلق کسی علاقے رنگ اور نسل سے ہو۔

انسانی حقوق سے متعلق بنیادی معاہدے:

انسانی حقوق کا دائرہ وسیع ہے اور اسی لحاظ سے درجنوں اعلامیوں اور معاہدوں میں انسانی حقوق کے معیارات اور اقدار کا ذکر ہے۔ مندرجہ ذیل سات معاہدے انسانی حقوق کے حوالہ سے بنیادی اور اہم سمجھے جاتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1- شہری اور سیاسی حقوق کا بین الاقوامی معاہدہ ICCPR (1966ء)

2- معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کا معاہدہ ICESCR (1966ء)

3- نسلی امتیاز کے خاتمے کا معاہدہ ICERD (1965ء)

4- عورتوں کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمے کا معاہدہ CEDAW (1979ء)

5- بچوں کے حقوق کا عالمی معاہدہ ICRC (1989ء)

6- تشدد کے خاتمے کا عالمی معاہدہ ICAT (1984ء)

7- غیر ملکی مزدوروں اور انکے اہلخانہ کے حقوق کا معاہدہ ICPRAMWF (2003ء)

یوں تو کئی اعلامیے ایسے ہیں جن کی مدد سے انسانی حقوق کی بحث کے ساتھ ساتھ قانون سازی میں مدد ملی لیکن اقدار اور اصولوں کے تعین کے حوالہ سے مندرجہ ذیل اعلامیے خاصے اہم سمجھے جاتے ہیں۔

1- عقیدے اور مذہب کی بنیاد پر ہر قسم کے امتیازات کے خاتمے کا اعلامیہ 1981ء

2- ترقی کے حق کا اعلامیہ 1986ء

3- قومیتی، نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے حقوق کا اعلامیہ 1992ء

4- انسانی حقوق کے محافظین کے تحفظ کا اعلامیہ 1998ء

انسانی حقوق کے اطلاق کی نگرانی کے لئے اقوام متحدہ میں جو نظام تشکیل پایا ہے اس میں کئی ادارے اور ذیلی تنظیمیں حصہ لیتی ہیں۔ ان اداروں کی تین اقسام ہیں۔

1- وہ ادارے جو بالواسطہ یا براہِ راست انسانی حقوق کی ترغیب دیتے ہیں مثلاً کمیشن برائے پائیدار ترقی اور دفتر ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق۔ کمیشن برائے پائیدار ترقی کسی ملک کو براہِ راست اپنی پالیسی تبدیل کرنے کے لئے نہیں کہتا لیکن مطالعہ جات اور کانفرنس کے ذریعے ترغیب دیتا ہے جب کہ ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کے اختیار اور روایت دونوں میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کی صورت حال پر تبصرہ کرنے کی گنجائش موجود ہے تاہم یہ کام بہت احتیاط طلب بھی ہے۔

2- نگران کمیٹیاں کسی معاہدے کی پاسداری کے سلسلہ میں بنائی جاتی ہیں۔ اب تک انسانی حقوق سے متعلق تمام معاہدوں کی رُو سے کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی ہے جہاں حکومتوں سے نہ صرف یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ باقاعدہ اور تحریری طور پر ان معاہدوں کے ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی پر تواتر کے ساتھ رپورٹ پیش کریں بلکہ کمیٹی کی طرف سے کی جانے والی سفارشات پر عمل درآمد بھی کریں۔ ان کمیٹیوں کو معاہداتی نگران کمیٹیاں یا ٹریٹی باڈیز کہا جاتا ہے۔ ان کمیٹیوں میں سرکاری ووٹوں سے غیر جانب دار ماہرین کا تقرر کیا جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

3- انسانی حقوق کے اطلاق و نفاذ کے لئے جو غیر رسمی نظام وضع کیا گیا ہے انہیں چارٹر باڈیز کہا جاتا ہے۔ چارٹر سے مراد اقوام متحدہ کا منشور ہے۔ اس نظام کے پیچھے یہ اصول کارفرما ہے کہ چونکہ اقوام متحدہ کے رکن ممالک چارٹر میں درج انسانی آزادیوں، احترام انسانیت، انسانی بقاء اور تحفظ کی ضرورت سے اتفاق کرتے ہیں لہٰذا ان طے شدہ اُمور پر انسانی حقوق کے حوالے سے کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ منشور کی بنیاد پر مختلف اُمور پر سیکرٹری جنرل خصوصی مبصرین کا تقرر کرتے ہیں اور کچھ ورکنگ گروپ

بنائے جاتے ہیں جس طرح ہر معاہدے کے ساتھ ایک نگران کمیٹی بنائی جاتی ہے۔ ورکنگ گروپ بنانے کی ضرورت اعلامیے پاس کرنے کے ساتھ سامنے آئی لیکن اعلامیوں سے ہٹ کر بھی ورکنگ گروپ بنائے گئے۔

مبصرین اور ورکنگ گروپس کے قیام کے پس منظر میں بین الاقوامی معاہدوں کی توثیق میں ریاستوں کی خودمختاری کا عنصر ہے۔ رکن ممالک چونکہ اپنی مرضی سے معاہدات میں شامل ہوتے ہیں لہٰذا ان پر حقوق انسانی اور اقوام متحدہ کے مقاصد کے مطابق کچھ بنیادی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا اور انسانی حقوق سے متعلق شکایات دُور کرنے کے لئے یہ انتظامات کئے گئے۔ آیئے پہلے ٹریٹی باڈیز اور پھر چارٹر باڈیز کے کام اور دائرۂ کار کا جائزہ لیتے ہیں۔

معاہداتی نگران کمیٹیاں:Treaty Bodies

نگران کمیٹیوں کا چناؤ جنرل اسمبلی میں خفیہ ووٹ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اُمیدواروں کے لئے شرائط ہوتی ہیں کہ وہ غیر جانب دار اور انسانی حقوق کے ضمن میں اعلیٰ کارکردگی، اہلیت اور شہرت رکھتے ہوں۔ ہر ملک بطور اُمیدوار اپنے کسی بھی شہری کا نام پیش کرسکتا ہے لیکن کوئی بھی ملک ایک وقت میں صرف ایک اُمیدوار نامزد کرسکتا ہے۔ نگران کمیٹیوں کی تنخواہ وغیرہ اقوام متحدہ کے بجٹ سے ادا کی جاتی ہے۔

معاہدات میں دی گئی ہدایات کے مطابق نگران کمیٹیوں میں چیئرپرسن اور وائس چیئرپرسن چُنے جاتے ہیں۔ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ مختلف خطوں کو یکساں نمائندگی حاصل ہو۔ یہ کمیٹیاں بالعموم سال کے شروع (جنوری، فروری) میں اقوام متحدہ کے صدر دفتر میں ایک اجلاس میں کارروائی شروع کرتی ہیں پھر سال کے دوران دو یا تین ہفتوں کا اجلاس ہوتا ہے جس میں اپنے اپنے مینڈیٹ کے متعلق مختلف ممالک کی طرف سے رپورٹس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

کمیٹیوں کے دائرۂ اختیار میں یہ بات شامل ہے کہ وہ کسی ملک کی رپورٹ پر اپنی رائے متعلقہ حکومت کو بھجوا کر سوالات اور معاملے کی چھان بین کے بعد معاہدے کی پاسداری کے لئے سفارشات کرسکتی ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خصوصی طریقہ کار:

معاہدے چونکہ حکومتوں کی آزاد مرضی سے تسلیم کیے جاتے تھے لہٰذا ان کے ذریعے سے حقوق انسانی کے معاہدوں کا اطلاق یا معاہداتی نگران کمیٹیوں کے ذریعے ان کی نگرانی میں مشکلات جلد ہی سامنے آنا شروع ہو گئیں لہٰذا سیکرٹری جنرل کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ معاہدوں سے ہٹ کر اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی میں انصاف وحقوق کے احترام نیز امن کی کوششوں اور ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے خصوصی انتظام کرے۔ اس سلسلے میں نمائندے اور خصوصی وقائع نگار یا مبصرین (رپورٹرز) اور ورکنگ گروپ بنائے گئے۔ ورکنگ گروپ کی سربراہی کسی سرکاری سفارت کار کو دی جاتی ہے دیگر 4 ارکان غیر جانب دار ماہرین ہوتے ہیں۔ ورکنگ گروپس ایک تو سب کمیشن میں ماہرین کے ساتھ اپنے مینڈیٹ کے مطابق سفارشات پیش کرتے اور صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں' دوسرے کئی ورکنگ گروپس مختلف اعلامیوں کے ناطے سے وجود میں آئے' جیسے اقلیتوں پر ورکنگ گروپ بھی ہے اور ڈیکلریشن (اعلامیہ) بھی۔ اسی طرح ترقی پر اعلامیہ منظور ہو جانے کے بعد 1998ء سے اس پر ورکنگ گروپ تشکیل دیا گیا۔ سپیشل پروسیجر کی دوسری اہم شکل خصوصی مبصرین اور نمائندے ہیں۔ ان کا تقرر سیکرٹری جنرل ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق اور ''ایکوسوک'' کے مشورے سے کرتا ہے۔ ان کی ذمہ داریوں میں درج ذیل اُمور شامل ہیں۔

☆ انسانی حقوق کی پامالیوں کی تحقیقات کرنا۔

☆ انفرادی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے واقعات کی روک تھام کے لئے حکومتوں سے رابطہ کرنا۔

☆ ہنگامی صورت حال میں مناسب کارروائی کرنا۔

یہ تقرری افراد میں اعلیٰ اہلیت اور کارکردگی کو سامنے رکھتے ہوئے کی جاتی ہے۔ مبصرین اور خصوصی نمائندے (سابقہ) کمیشن' ایکوسوک کونسل اور جنرل اسمبلی کو جوابدہ ہوتے تھے۔ 2006ء سے 'انسانی حقوق کی کونسل' کے قیام کے بعد ان مبصرین کے کام اور دائرۂ کار میں کچھ تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔

مبصرین اپنی رپورٹس کی تیاری کے سلسلے میں حکومتوں' متاثرہ افراد اور این جی اوز سے رابطہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ متعلقہ علاقوں میں جا کر شہادتیں اکٹھی کرنا بھی ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اقوام متحدہ ان رپورٹس کو شائع کرتا ہے اور یہ عوام الناس کے لئے انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعے مشتہر کر دی جاتی ہیں۔ خصوصی نمائندے اور مبصرین اقوام متحدہ یا حکومتوں کے تنخواہ دار نہیں ہوتے لیکن جنیوا میں ان کے قیام کا خرچ اور عملے کے اخراجات اقوام متحدہ برداشت کرتا ہے۔ یہ اُمر قابل ذکر ہے کہ ان پروسیجرز کی رپورٹنگ ماہرانہ اور شاندار معیار کی رہی ہے۔

خفیہ طریقہ کار یا پروسیجر: 1503

انسانی حقوق کی سنگین اور نظاماتی خلاف ورزیوں کو روکنے کے لئے جنرل اسمبلی کی ایک خصوصی قرارداد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ذریعے ایک طریقہ کار اور مینڈیٹ کا 1967ء میں اجراء کیا گیا۔ جس کے تحت ''ایکوسوک'' ''انسانی حقوق کمیشن'' اور ''ذیلی کمیشن'' کو تمام ممالک میں سنگین خلاف ورزیوں کی شکایات موصول کرنے اور اپنی سفارشات 'ایکو سوک' کو بھیجنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ 1970ء میں ایکوسوک کی قرارداد نمبر 1503 کے ذریعے وجود میں آنے والے اس طریقہ کار کو اسی نمبر سے یاد کیا جاتا ہے۔

1503 پروسیجر کو مسلسل جاری رہنے والی اجتماعی خلاف ورزیوں کی شکایات کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ذیلی کمیشن میں سے پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی جنیوا میں ہر ماہ اس ضمن میں دُنیا بھر سے آنے والی شکایات کا جائزہ لیتی ہے۔ جن شکایات کو درست پایا جاتا ہے انہیں ذیلی کمیشن اور کمیشن (سابقہ) میں ممالک کی ایک فہرست بنا کر واضح کیا جاتا ہے لیکن دیگر دستاویزات اور رپورٹس کی طرح یہ عام دستاویزات ہوتی ہیں اور نہ ہی عام لوگوں کی ان تک رسائی ہوتی ہے۔ پھر ان شکایات کی چھان بین کرنے کے بعد متعلقہ حکومت کو ان شکایات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ 54 ممالک کے نمائندوں پر مشتمل 'ایکوسوک' چاہے تو ان شکایات کو خفیہ رکھنے کی شرط ختم بھی کرسکتی ہے۔

پروسیجر 1503 کی خوبی یہ ہے کہ ہر فرد اس کو اپنے ملک میں سنگین خلاف ورزیوں کے خاتمے کے لئے استعمال کرسکتا ہے۔ اس کا کسی معاہدے پر اس ملک کے دستخط ہونے یا نہ ہونے سے تعلق نہیں ہے۔ اس کے لئے جنیوا جا کر شکایات جمع کروانے کی شرط بھی نہیں البتہ حقائق کے درست ہونے کی شرط ضرور ہے۔ 1503 کی خرابی یہ ہے کہ چونکہ اس طریق کار کو دُنیا بھر میں استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا شکایات کے ازالے میں دیر ہو جاتی ہے جو عام حالات میں برسوں پر محیط ہوسکتی ہے۔

لیکن براعظم ایشیا کے ممالک جہاں انسانی حقوق کا کوئی براعظمی فورم نہیں یا وہ حکومتیں جو بین الاقوامی معاہدات کو تسلیم کرنے سے گریزاں رہی ہیں وہاں کے شہریوں کے لئے 1503 کا طریقہ کار کارآمد کہا جاسکتا ہے۔

انسانی حقوق کے فروغ اور تحفظ کے لئے ذیلی کمیشن:

سب کمیشن، کمیشن کے ذیلی پلیٹ فارم کے طور پر 1947ء سے کام کر رہا ہے۔ اس میں 26 ماہرین شرکت کرتے ہیں اور تفویض کردہ ذمہ داریوں پر اپنی رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ حکومتی نمائندے اس کارروائی میں حصہ لیتے ہیں لیکن اس میں کوئی قرارداد وغیرہ منظور نہیں کی جاتی۔ لہٰذا اس کی افادیت مسائل کی نشاندہی اور رائے عامہ کی تیاری کے حوالہ سے زیادہ ہے۔ اس کمیشن کو شروع میں دنیا کی مختلف اقلیتوں کے حقوق زیر بحث لانے کے لئے استعمال کیا گیا لیکن اب اس میں انسانی حقوق کے ہر نوعیت کے مسائل پر بات ہوتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسانی حقوق کے بین الاقوامی ادارے

انسانی حقوق کے فروغ، اطلاق اور تحفظ کے لئے کچھ خاص ادارے قائم کئے گئے ہیں ان میں سابقہ کمیشن اور موجودہ ذیلی کمیشن اور انسانی حقوق کونسل خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

1- کمیشن برائے انسانی حقوق:

کمیشن برائے انسانی حقوق ایک اہم پلیٹ فارم کا کام کرتا رہا۔ 53 سرکاری نمائندگان پر مشتمل اس فورم کو حکومتوں کی طرف سے اس لئے بھی اہمیت دی جاتی تھی کہ اس کے 6 ہفتوں پر محیط اجلاس میں ایجنڈا پہلے سے تیار ہوتا تھا جس کے مطابق سرکاری مندوبین کے علاوہ غیر سرکاری تنظیمیں بھی اپنی شکایات اور سفارشات پیش کر سکتی تھیں۔

کمیشن میں کمزوری یہ تھی کہ 54 ممالک کا ایک بڑا فورم ہونے کے باعث رُکن ممالک نے اسے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا اور یوں ان ممالک کے خلاف جہاں انسانی حقوق کی پامالیاں عام ہوتی ہیں، کسی قرارداد کا پاس ہونا یا کسی تادیبی اقدام کا کیا جانا مشکل ہو گیا تھا۔ خاص طور پر چین اور امریکہ جیسے بڑے ممالک کے خلاف تو کئی برسوں تک کوئی قرارداد کامیاب نہیں ہو سکی۔

کمیشن کی صدارت کے لئے ایسے ممالک کو بھی منتخب کیا گیا جو انسانی حقوق کے حوالے سے اچھی کارکردگی کے حامل نہ تھے۔ اس کے علاوہ کمیشن کا اجلاس سال میں صرف ایک مرتبہ ہوتا تھا جو یقیناً کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔

2- کونسل برائے انسانی حقوق:

مندرجہ بالا کمزوریوں کو دُور کرنے اور انسانی حقوق کے بہتر اطلاق و نگرانی کی غرض سے کمیشن کو ختم کر کے ایک کونسل بنائی گئی ہے۔ اس کونسل کے نمایاں خدوخال یہ ہیں:

1- کونسل 47 ریاستی نمائندگان پر مشتمل ہوگی۔

2- کونسل کے منتخب ارکان اپنے ممالک میں انسانی حقوق کے اعلیٰ معیارات کے حامل ہوں گے نیز وہ انتخابات سے پہلے انسانی حقوق کی پاسداری کے حوالہ سے ''وعدوں'' کا تحریری اعلان کر کے اقوام متحدہ کے دفتر میں جمع کروائیں گے۔ ان وعدوں میں ایسے اقدامات کا اعلان کریں گے جو وہ اپنے ملک اور دنیا بھر میں انسانی حقوق کے فروغ کے لئے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

3- کونسل تین سال کے لئے منتخب کی جائے گی۔ اس کی تقسیم جغرافیائی نمائندگی کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے۔ افریقہ سے 13، ایشیا سے 13، مشرقی یورپ سے 6، لاطینی امریکہ اور جزائر عرب الہند سے 8 جب کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مغربی یورپ اور ملحق ریاستوں سے 7 نمائندے منتخب کئے جائیں گے۔ جنرل اسمبلی کے ذریعے اس کا انتخاب برابری (ہر ملک ایک ووٹ) کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

-4 کونسل میں ایسے منتخب رکن ملک کی رکنیت جنرل اسمبلی میں دو تہائی اکثریت کے ووٹ سے معطل کی جا سکے گی جہاں پر تواتر کے ساتھ انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہو۔

-5 کونسل کا اجلاس سال میں تواتر کے ساتھ اور کم از کم تین مرتبہ جنیوا میں ہوگا جو کل ملا کر دس ہفتے کی مدت کے لئے ہوگا۔ ایک تہائی ارکان کی درخواست پر خصوصی اجلاس بھی بلائے جا سکیں گے۔

-6 سپیشل پروسیجرز (خصوصی نمائندے، مبصر اور ورکنگ گروپس) قائم رہیں گے اور ذیلی کمیشن بھی جاری رہے گا اور کونسل ان کے ساتھ باہم مل کر کام کرے گی۔

-7 یہ کونسل 'ایکوسوک' کے ماتحت نہیں ہوگی بلکہ جنرل اسمبلی کا ذیلی ادارہ کہلائے گی۔

-8 ہر پانچ سال بعد اس کی کارکردگی کی رپورٹ جنرل اسمبلی میں پیش کی جائے گی۔

جنرل اسمبلی کی قرارداد 60/251 کے ذریعے 3 اپریل 2006ء کو منظور اور جون 2006ء کو منتخب ہونے والی کونسل سے کچھ توقعات تو پوری نہیں ہوئیں لیکن کئی لحاظ سے صورت حال اُمید افزا بھی ہے۔ اس کی کمزوریوں میں سرفہرست اس کے ارکان کی تعداد ہے۔

(ا) 47 ارکان کے کسی نتیجے اور اتفاق رائے پر پہنچنے میں دیر لگ سکتی ہے جو کونسل کے کام کو متاثر کرے گی۔ اس کی بجائے سیکرٹری جنرل کی تجویز کے مطابق اگر ارکان کی تعداد 25 سے 30 کے درمیان ہوتی تو بہتر تھا کیونکہ اب اس میں علاقائی و بین الاقوامی سیاسی اثرات کا در آنا آسان ہو گیا ہے۔

(ب) انسانی حقوق کے اطلاق کے لئے ایک مضبوط اور واضح اختیار کونسل کے مینڈیٹ میں شامل کرنا انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو روکنے کے لئے ضروری خیال کیا جا رہا تھا لیکن اس پہلو کو مناسب توجہ نہیں مل سکی۔

(ج) انسانی حقوق کونسل میں این جی اوز کو کوئی واضح مقام اور کردار نہیں دیا گیا۔ جس سے خطرہ ہے کہ حکومتیں جو این جی اوز کی تنقید اور حقائق سامنے لانے سے خائف رہتی ہیں وہ حتی المقدور کوشش کریں گی کہ ان کا کردار اور اثر و رسوخ کم کیا جائے۔

ان کمزوریوں کے باوجود جو کچھ اُمید افزا ہے ان میں نمایاں پہلو مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) کونسل کی رکنیت کے لئے انسانی حقوق کی پاسداری کے لئے ترغیب کا بہتر نظام مہیا کیا گیا ہے۔

(ب) انسانی حقوق کونسل میں طاقت کا توازن تیسری دنیا کے ممالک کی طرف ہو گیا ہے کہ جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں زیادہ ہوتی ہیں، جہاں ایک امکان یہ ہے کہ ملی بھگت کے ساتھ ممالک ایک دوسرے کی کمزوریوں پر پردہ پوشی کریں۔ وہاں یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت یہ ممالک با اختیار بین الاقوامی فورم کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکن ہونے کے ناطے احساس ذمہ داری کا ثبوت بھی دیں اور اپنے ممالک میں صورت حال کو بہتر بنانے کے ساتھ دیگر ممالک میں صورت حال کی بہتری کے لئے اصول پرستی کو معیار بنانے پر توجہ دے سکیں۔

اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کا دفتر:

(Office of the High Commission for Human Rights)

اقوام متحدہ کا ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کے دفتر کا مینڈیٹ (جواز) اقوام متحدہ کے منشور کی دفعات 13,1 اور 55' ویانا اعلامیے اور 'پروگرام فار ایکشن' اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی 10 دسمبر 1993ء کی قرارداد 48/144 سے اخذ ہوتا ہے۔ اس کے مطابق اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کے تحفظ اور ترقی کے لئے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کا تقرر کیا۔ اس کا صدر دفتر جنیوا میں واقع ہے اور ایک ذیلی دفتر نیویارک میں بھی موجود ہے۔ دفتر تنظیمی یونٹوں میں منقسم ہے اور ہائی کمشنر کا رُتبہ انڈر سیکرٹری جنرل کا ہوتا ہے۔ ہائی کمشنر کے دفتر برائے انسانی حقوق میں اہل کاروں کی تعداد تقریباً 200 ہے۔ ہائی کمشنر کو چار سال کی مدت کے لئے تعینات کیا جاتا ہے۔

اس کے مندرجہ ذیل فرائض ہیں:

- ☆ بنیادی انسانی حقوق کے فروغ کے لئے عالمی سطح پر کوشش کرنا۔
- ☆ انسانی حقوق کے معاملات پر قومی اور بین الاقوامی سطح پر بنیادی انسانی حقوق کی اہمیت پر زور دینا۔
- ☆ انسانی حقوق کے لئے بین الاقوامی تعاون کو بڑھاوا دینا۔
- ☆ اقوام متحدہ کے نظام کے ذریعے انسانی حقوق کے لئے کام کو تیز کرنا۔
- ☆ بین الاقوامی معیارات کی عالمی سطح پر توثیق کروانا اور ان پر عمل درآمد کے لئے کوشش کرنا۔
- ☆ نئے معیارات کی ترویج میں مدد دینا۔
- ☆ انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں پر ردِ عمل ظاہر کرنا۔
- ☆ ایسے اقدامات کو روکنے کی کوشش کرنا جو انسانی حقوق کے منافی ہوں۔
- ☆ قومی سطح پر انسانی حقوق کے لئے ادارے قائم کرنے میں مدد دینا۔
- ☆ انسانی حقوق کی سرگرمیوں اور منصوبوں پر عمل درآمد کی ذمہ داری لینا۔
- ☆ انسانی حقوق کے بارے میں تعلیم، معلومات اور تکنیکی مدد فراہم کرنا۔

انسانی حقوق سے متعلق ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے جنرل اسمبلی نے 1993ء میں ہائی کمشنر کے عہدے کی منظوری دی جس کے ذمے سیاسی، شہری، معاشی وسماجی حقوق کے فروغ اور تحفظ کے لئے کام کرنا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق سے متعلق کام کے لئے ہائی کمشنر ایک مرکزی دفتر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسانی حقوق کے فورمز اور اداروں کے اجلاس بھی اس کے صدر دفتر (سیکرٹریٹ) میں ہوتے ہیں جو جنیوا میں واقع ہے۔ اس دفتر کے اندر قریباً دو سو افراد کا عملہ موجود ہے جو تین طریقوں سے کام کرتا ہے۔

1- ریسرچ اور ''ترقی بطور حق'' کا شعبہ جو ایسی تحقیقات اور جائزے مرتب کرتا ہے جن کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر منظور کردہ حقوق کے اطلاق کی نگرانی کی جاسکتی ہے۔

2- پروگرام اور سرگرمیوں کا شعبہ ممالک کو تکنیکی معاونت فراہم کرتا ہے۔ نیز تحقیقاتی مشنز کے لئے پروگرام بناتا ہے۔ مختلف اُمور پر قائم ورکنگ گروپ اور خصوصی مبصرین اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہائی کمشنر کے دفتر میں باقاعدہ پہنچنے والی شکایات کا جائزہ لینا اور متعلقہ حکومتوں سے خط و کتابت کرنا بھی اس شعبے کے فرائض میں شامل ہے۔

سول سوسائٹی اور اقوام متحدہ:

ہر غیر حکومتی یا عوامی تنظیم سول سوسائٹی ہے' ٹریڈ یونینز' اپوزیشن سیاسی جماعتیں' پیشہ وارانہ انجمنیں' فلاحی ادارے' ثقافتی تنظیمیں غرض مختلف مکتب خیال اور طریقہ ہائے کار لیکن واضح مقاصد کے تحت' قانونی تقاضوں کے مطابق اور اعلانیہ کام کرنے والے تمام گروہ اور تنظیمی ڈھانچے اس زُمرے میں آتے ہیں۔

مختلف ملکی قوانین کے مطابق کام کرنے سے جدید طرز پر تنظیم کو چلانے میں سہولت رہتی ہے۔ این جی اوز یا سرکاری تنظیمیں اس سے اپنے تنظیمی اُمور کو بہتر سرانجام دینے کے لئے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکتی ہیں لیکن سول سوسائٹی تنظیم کی تعریف میں شامل ہونے کے لئے رجسٹرڈ ہونے کی شرط صرف تکنیکی اعتبار سے اہم ہے۔ عملی طور پر اور عمرانی مطالعہ کی حد تک رجسٹرڈ حیثیت سے آگے دیکھنا پڑتا ہے مثلاً چند سال سے سنگاپور میں این جی او بنانا ممکن نہیں تھا۔ برما میں شہری آزادیاں نہ ہونے کے برابر ہیں' حتیٰ کہ چین میں اپوزیشن اور انسانی حقوق کی تنظیموں کا اعلانیہ کام کرنا مشکل ہے لیکن لوگ مزاحمت کے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ وہ عشائیہ یا دُعائیہ تقریبات یا موسیقی کی مجالس جیسے موقعوں کو آپس میں رابطے اور حقوق کی جدوجہد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

برما اور چین کی مثالیں سامنے رکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بعض اوقات ملک کی سول سوسائٹی حقوق کی تحریکیں جلاوطنی میں چلاتی ہے۔ بعض تنظیمیں عالمی سطح پر کام کرتی ہیں مثلاً ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ وغیرہ جن کو انٹرنیشنل سول سوسائٹی میں شمار کیا جاتا ہے۔

انسانی حقوق کی تنظیمیں:

اقوام متحدہ کا ادارہ بنیادی طور پر حکومتوں کا پلیٹ فارم ہے اور حکومتوں کو حقوق تسلیم و نافذ کرنے کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قائل کرنا آسان نہیں ہوتا' اس کے باوجود انسانی حقوق کی ترویج اور تحفظ کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کا کردار بہت اہم رہا ہے۔

سول سوسائٹی تنظیموں کے پاس ایک آپشن یہ ہے کہ اگر وہ معیار پر پورا اُترتی ہوں تو وہ بین الاقوامی یا علاقائی تنظیم کے طور پر 'ایکوسوک' میں رجسٹریشن حاصل کرسکتی ہیں۔ بعض اوقات قومی سطح کی تنظیموں کو بھی رجسٹریشن دی گئی۔ اس کے لئے مطلوبہ معیارات پر پورا اُترنا ہوتا ہے جس ملک میں صدر دفتر ہوگا وہ حکومت چاہے تو ایسی تنظیم کی اقوام متحدہ میں رجسٹریشن یا ایکریڈیشن (Acredition) کو چیلنج کرسکتی ہے۔

دُنیا بھر میں 4 ہزار سے زائد تنظیمیں 'ایکوسوک' رجسٹریشن رکھتی ہیں۔ پاکستان سے چند ایک تنظیمیں اس میں شامل ہیں۔ بعض حکومتیں اپنے مخصوص مفادات کے تحت اپنی سرپرستی میں غیر سرکاری تنظیمیں بنا کر اُن کو اقوام متحدہ میں رجسٹر کروالیتی ہیں' انٹرنیشنل سول سوسائٹی کی زبان میں انہیں گونگو (GONGO) کہا جاتا ہے۔ یہ حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے یا حکومت کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے علاوہ کوئی قابل قدر کام نہیں کر پاتیں۔ بہرحال ان تنظیموں کی تعداد بہت کم ہے۔

حقوق پر عمل درآمد کے لئے اعانت:

انسانی حقوق کی ترویج اور تحفظ کے لئے کام کرنے والی تنظیمیں اقوام متحدہ کے نظام میں بہت فعال کردار ادا کر رہی ہیں۔ 'ایکوسوک' کی رجسٹریشن ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی بنیاد پر رجسٹرڈ تنظیمیں اور ان تنظیموں کے نمائندے کے طور پر اقوام متحدہ کے مختلف فورمز میں شرکت کی جاسکتی ہے مثلاً:

1- اقوام متحدہ کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں این جی اوز نمائندے کے طور پر شرکت' سٹال لگا کر اور دیگر ذرائع سے اپنی تنظیم کے مقاصد اور کام کی تشہیر' حکومتی اور غیر حکومتی مندوبین کے ساتھ موضوعات پر لابی کرتے ہوئے اور اپنے مؤقف کے لئے حمایت حاصل کرنے کی صورت میں۔

2- ذیلی کمیشن' ورکنگ گروپس اور آئندہ ممکنہ طور پر کونسل کے عام اجلاس میں شرکت کرنا۔ ان اجلاسوں میں تحریری بیان اور تقریر کے ذریعے مسائل پر اظہار خیال (تنظیمی حوالہ سے)

3- معاہداتی کمیٹیوں میں حکومتی اور رپورٹنگ کے دوران شرکت کرنا' متبادل (شیڈو) رپورٹ پیش کرنا اور رپورٹ پر حکومتوں سے سوال کرنے میں کمیٹی کی مدد کرنا۔

4- چارٹر باڈیز یا خصوصی مینڈیٹ (متعلقہ موضوعات) انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر ان کی توجہ دلانا۔ اس کے علاوہ ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کو انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کی معلومات دینا نیز کارروائی کی درخواست کرنا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

-5 انسانی حقوق کے فروغ کے لئے اقوام متحدہ کے مقامی دفاتر اور ذیلی اداروں کے ساتھ مل کر آگہی و ترویج کے لئے کام کرنا۔

-6 مسلسل ہونے والی انسانی حقوق کی روایتی خلاف ورزیوں کے سلسلہ میں پروسیجر 1503 کے تحت شکایات ارسال کرنا۔ یہ کام کوئی فرد بھی کرسکتا ہے لیکن تنظیم کی سطح پر زیادہ مؤثر اور محفوظ سمجھا جاتا ہے۔

-7 اجازت نامہ حاصل کر کے اقوام متحدہ کی لائبریریوں' دستاویزات' اقوام متحدہ کی یونیورسٹی (جاپان) وغیرہ تک رسائی نیز اقوام متحدہ کے عملے کی خدمات سے استفادہ کرنا۔

-8 اقوام متحدہ کے فورمز میں شرکت کے لئے حکومتی وفود میں شراکت نیز رپورٹنگ پر اپنی آراء کو شامل کرنے اور سرکاری مؤقف میں بہتری لانا۔

-9 بین الاقوامی این جی اوز کے نیٹ ورک میں شامل ہوکر اپنی پسند کے انسانی حقوق کے موضوعات کے حوالہ سے وکالت کرنا۔

-10 بین الاقوامی کانفرنسوں کے بعد فالو اَپ (مثلاً بیجنگ 5+ اور 10+) میں شرکت کر کے سرکاری کارکردگی کا جائزہ لینا۔

بین الاقوامی معاہدوں' انسانی حقوق کے اداروں اور جنرل اسمبلی کے ذریعے انسانی حقوق کا بین الاقوامی نظام کام کرتا ہے۔ اس نظام کی معاونت اور تشریح کا فریضہ عالمی عدالت انصاف انجام دیتی ہے تاہم دنیا میں نسلی' لسانی' علاقائی' مذہبی اور صنفی بنیادوں پر امتیاز کی جگہ اب انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے کئی نئے شعبوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ کمزور طبقات کے معاشی وسائل' دانشمندی کے اثاثوں اور معروف اشیاء کی شناخت ہتھیانے کو بھی انسانی حقوق کی خلاف ورزی تصور کیا جانا چاہئے۔ پاکستان جیسے پسماندہ ممالک میں میڈیا کی آزادی عوامی شعور بیدار کرنے کے متعلق مفید کردار ادا کر رہی ہے لیکن اکثر اوقات اس سے پرائیویسی کا حق متاثر ہورہا ہے۔ پاکستان میں چائلڈ لیبر کا معاملہ انسانی حقوق سے جڑا ہوا ہے۔ دوسری طرف کئی خاندان ایسے ہیں جہاں بچے گھر کا واحد کفیل ہوتے ہیں۔ یو این او اور بین الاقوامی نظام کو انسانی حقوق کی تعریف اور معیاروں کے متعلق چین اور مسلم دنیا کے حقوق انسانی حقوق کے تصورات کا چیلنج بھی درپیش ہے۔ مہذب اقوام کی ذیل میں اب تک دوسری جنگ عظیم کی فاتح اقوام کو شامل کیا جاتا رہا ہے۔ اب یہ دائرہ اقوام متحدہ کے ذریعے وسیع کیا جانا چاہئے۔

حوالہ جات:

اقوام متحدہ کا چارٹر

یونیورسل ہیومن رائٹس ڈکلریشن

یو این او آفیشل ویب سائٹ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسانی حقوق کی تحریک ...... ترقی یا تنزلی

(سارا ای مینڈلسن)

سنٹر فار سٹریٹجک اینڈ انٹرنیشنل سٹڈیز کی محقق ای مینڈلسن کی زیر نظر تحقیق عالمی سطح پر انسانی حقوق کی تحریک کو حاصل ہونے والی کامیابیوں اور ناکامیوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پہلی قسط پیش خدمت ہے:

انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کی منظوری کی ساٹھویں سالگرہ سے تقریباً ایک ماہ قبل ریاست ہائے متحدہ امریکا نے اپنی تاریخ کے پہلے سیاہ فام صدر کا انتخاب کیا۔ یہ تاریخی واقعہ اور اہم سنگ میل اُس اعلامیے کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے جسے انسانی حقوق کے کارکنان اور عالمی قانون کے ماہرین ایک مقدس اور اہم دستاویز قرار دیتے ہیں۔ بارک اوباما کے بطور صدر انتخاب سے امریکی شہری حقوق کی تحریک ایک خواب پورا ہوتا ہے۔ یہ تحریک اپنی کامیابی کے لیے شہری آزادیوں اور مساوی حقوق کی خاطر کئی عشروں تک جدوجہد کرنے والے مردوزن کی قربانیوں کے ساتھ ساتھ 'انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے' پر بھی انحصار کرتی رہی ہے۔ چنانچہ اس انتخاب کی اہمیت دنیا بھر میں انسانی حقوق کے کارکنان کے لیے عیاں ہے۔

تاہم حالیہ برسوں میں اس واحد کامیابی کے باوصف آج کل انسانی حقوق کی تحریک کے خیموں میں عمومی طور پر خاموشی اور اُداسی کا ماحول طاری ہے۔ صدر اوباما کا انتخاب امریکا کی طرف سے انسانی حقوق اور بین الاقوامی قانون کے حوالے سے 8 برس تک عالمی قیادت میں کمزوری دکھانے کے بعد کہیں عمل میں آیا ہے۔ سال 2008 کے اواخر میں انسانی حقوق کے کارکنان، دانشوروں اور انسانی حقوق کی تحریک کے ناقدین سے کیے جانے والے انٹرویوز میں بیشتر نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر 'انسانی حقوق کے عالمی منشور' کو 1948 کی بجائے 2008 میں منظوری کے لیے پیش کیا جاتا تو شاید اسے 48 ممالک کی حمایت بھی حاصل نہ ہوتی۔ انسانی حقوق کے ایک نمایاں کارکن کا کہنا ہے ''مارٹن لوتھر کنگ نے جس چیز کو انسانی حقوق کے انقلاب کا نام دیا تھا، لگتا ہے دیگر انقلابوں کی طرح یہ بھی اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا ہے''۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

80 کی دہائی کے اواخر اور 90 کے اوائل میں فضاؤں کے اندر انسانی حقوق کے فروغ کی مہک محسوس کی جاسکتی تھی۔ انسانی حقوق کے کارکنان بہت جوش وخروش کے ساتھ لاطینی امریکہ اور مشرقی ایشیائی معاشروں میں مطلق العنان حکومتوں کے خاتمے کی طرف اشارہ کرتے تھے...... ''ہم نے جنوبی افریقا میں نسل پرست حکومت کے خاتمے اور سب سے بڑھ کر دیوار برلن کے انہدام اور کمیونزم کے خاتمے کا مشاہدہ کیا...... ہم احساس فتح کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے''۔ تجزیہ نگار ماہرین اور دانشور پالیسی جریدوں میں ''طاقت کے توازن میں واضح تبدیلی کی طرف اشارہ کررہے تھے جہاں این جی اوز روز افزوں ایجنڈے طے کرنے کے علاوہ ریاستی اقدامات کو چیلنج کررہی تھیں۔ درس گاہوں اور دانش کدوں میں 'انسانی حقوق کی طاقت' کے گن گائے جارہے تھے۔

آج دہشت گردی، تشدد نیز انسانی حقوق اور جمہوریت کے خلاف انتقامی کارروائیاں اُس احساس فتح کی جگہ لے چکی ہیں۔ اسے بجا سمجھا جائے یا بے جا، انٹرویو کردہ افراد میں سے اکثریت موجودہ افسوس ناک منظرنامے کا سبب تشدد اور بالخصوص ریاستی تشدد پر پابندی کے چلن کو آسانی اور لاپروائی کے ساتھ ترک کردینے کو قرار دیتی ہے اور بدقسمتی سے یہ کام دنیا کے دور دراز خطوں کے مطلق العنان حکمرانوں کی طرف سے نہیں بلکہ واشنگٹن میں بیٹھے پالیسی ساز کے ہاتھوں سے انجام پذیر ہورہا ہے۔ انسانی حقوق کی تحریک کے چند سرکردہ راہنما نہ صرف امریکی حکومت بلکہ خود تحریک کو بھی اس دلیل کی بنا پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ اس نے 11 ستمبر 2001 کے حملوں اور امریکا کی دہشت گردی مخالف پالیسیوں کے ممکنہ اثرات پر مؤثر ردعمل کا مظاہرہ کرنے میں سُستی دکھائی ہے۔ اُن کے بقول اُن کے ساتھی اِس گمان میں مبتلا تھے کہ اتنی طویل جدوجہد کے بعد تشدد کی مکمل ممانعت کے بارے میں جو (مفروضہ) اتفاق رائے قائم ہو چکا ہے اسے اس آسانی کے ساتھ ختم یا مسترد نہیں کیا جاسکے گا جس نے 8 سال گزرنے کے بعد بھی انسانی حقوق کی تحریک کو مبہوت رکھا ہے۔ اسی تحریک کے بعض افراد نے امریکی اقدامات کی نوعیت کو جانے بغیر یہ دعویٰ کردیا کہ ایسا کرنا امریکی سلامتی کے لیے ضروری تھا۔ بدقسمتی سے اس وقت محض امریکی پالیسیاں ہی انسانی حقوق کے لیے سنگین ترین چیلنج نہیں، دیگر کئی ممالک نے بھی بین الاقوامی قوانین سے اغراض کی راہ اختیار کی ہے مثلاً اس بات کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ کئی یورپی ممالک نے دہشت گردی کے ملزمان کی غیرقانونی حوالگی جیسے امریکی اقدامات میں معاونت فراہم کی ہے۔ دوسری طرف یورپ اور امریکا سے ہٹ کر باقی جگہوں پر بھی انسانی حقوق کے دور رس امکانات بہت زیادہ روشن دکھائی نہیں دیتے کیونکہ روس اور چین میں نئی نسلیں مطلق العنان طرز اقتدار سے مطمئن دکھائی دیتی ہیں۔

اب انسانی حقوق کے کئی سرکردہ راہنما ایک نئی حکمت عملی کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں۔ اب جبکہ 'انسانی حقوق کے عالمی منشور' کی منظوری کو 6 دہائیوں سے زیادہ عرصہ ہو چلا ہے ہمیں انسانی حقوق کی تحریک کی کامیابیوں نیز اس کی راہ میں رکاوٹوں اور چیلنجوں کا معروضی انداز میں جائزہ لے کر اس بات کا پتا لگانا چاہیے کہ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک کو عالمی منظرنامے کے مرکزی دھارے میں لانے کے لیے کیا کچھ درکار ہوگا؟ اگرچہ زیرِ نظر سطور میں ایک ہمہ گیر جواب دینا اور کوئی جامع حکمت عملی تجویز کرنا ممکن نہیں ہوگا تاہم اس حوالے سے پالیسی تناظر نیز اس مباحثے میں وسعت لانے کی کوششوں میں ادبا ما انتظامیہ اور این جی او کمیونٹی پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے بارے میں ضرور کچھ کہا جا سکتا ہے۔

تحریک کی کامیابیاں:

گزشتہ کئی برسوں کے دوران جن ناکامیوں کا سامنا رہا انہیں تاریخی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ انسانی تاریخ صدیوں تک انسانی حقوق کے طریق کار یا بین الاقوامی قوانین اور اُصول ضوابط جیسی چیزوں سے ناآشنا رہی ہے۔ یقیناً انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران غلامی کے خاتمے اور عوامی رائے دہی کے حق کی تحریکوں نیز انسانی ہمدردی کے بین الاقوامی قوانین وضع کیے جانے کی صورت میں کئی اقدامات ایسے تھے جو موجودہ بین الاقوامی قوانین کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ تاہم گزشتہ 6 عشروں کے دوران گوناگوں قسم کے کنونشن اور معاہدات (جن میں سے بیشتر کو مرتب کیے ہوئے 30 سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا) کی منظوری کی شکل میں انسانی حقوق کو قانونی اور اداراتی شکل دیا جانا، انسانی تاریخ میں انوکھی مثال ہے۔ 'انسانی حقوق کا عالمی منشور' اس سلسلے کی اولین دستاویز ہے۔ اس دستاویز کو اس بنا پر سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ اس نے انسانی حقوق کی آفاقیت کے اُصول کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کروایا۔ اس کا اطلاق اچھے اور بُرے، گورے اور کالے، چھوٹے بڑے، مسلمان یہودی، مسیحی یا دہریے ہر قسم کے انسان پر ہوتا ہے۔ انسانی حقوق کے بہت سے راہنما اور دانشور اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مذکورہ منشور میں 'انسانی حقوق' کی بجائے ان کا 'آفاقی' ہونا سب سے اہم نکتہ ہے۔ اگر 'آفاقیت' کا اُصول نہ ہو تو اِن حقوق کے مَن چاہے طریقے سے اطلاق کا خدشہ موجود رہتا ہے، مثلاً ریاست کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار مل جاتا ہے کہ کسے حقوق ملنے چاہئیں اور کسے نہیں۔ بہت سے حلقے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانی حقوق کی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی وہ قانونی دستاویزات اور معاہدات ہیں جو ایک مختصر سے عرصے میں 'انسانی حقوق کے عالمی منشور' کے اندر سے ظہور پذیر ہوئے۔ کئی ماہرین کا کہنا ہے ''آج کے دور میں انسانی حقوق کی ساخت اور ان کی زبان اس گہرے طریقے سے بین الاقوامی تعلقات کے ساتھ منسلک ہے کہ کوئی بدنام زمانہ ریاست بھی اپنے انسانی حقوق کے ریکارڈ کو بہتر بنا کر پیش کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل، امریکا کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر لیری کاکس کہتے ہیں ''جس وقت حکومتوں نے اس اعلامیے پر دستخط کیے انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے عملی اثرات اور تقاضے کس قدر ہمہ گیر ہوں گے...... درحقیقت سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انسانی حقوق کو ایسی صورت دے دی جائے کہ کسی حکومت کے لیے انہیں نظر انداز کر دینا مشکل ہو جائے اور اُن کے پاس اس بارے میں کچھ کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہے''۔ انسانی حقوق کے قوانین کے ماہرین کا کہنا ہے کہ 'انسانی حقوق کا عالمی منشور' ایک زندہ جاوید اور متحرک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دستاویز ہے۔اس سلسلے میں وہ ایسے بین الاقوامی قانونی اداروں کی روز افزوں تعداد کا حوالہ دیتے ہیں جنہیں انسانی حقوق کے نفاذ کی خاطر قائم کیا گیا ہے۔یورپ کے خطے کی عدالتیں (انسانی حقوق کی یورپی عدالت اور یورپی یونین کی یورپی عدالت انصاف)، انسانی حقوق کی بین الامریکی عدالت، انسانی اور عوامی حقوق کی افریقی عدالت اور افریقا کے دیگر علاقائی ادارے نیز بین الاقوامی فوج داری عدالت علاوہ ازیں اَن گنت عالمی اور علاقائی ٹربیونل ایسے اداروں کی نمایاں مثالیں ہیں۔بعض حلقے اس سلسلے میں عالمی نظام انصاف کو اداراتی سطح دیے جانے کی مثال بھی پیش کرتے ہیں۔ہیومن رائٹس واچ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کین روتھ کہتے ہیں ''ابھی تک یہ سبھی کچھ بہت محدود اور ابتدائی سطح پر ہے۔اس کے باوجود ہم جرائم کے مرتکب افراد کو انصاف کے کٹھرے میں کھڑا کر سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ماضی کے بڑے بڑے آج 'دی ہیگ' کی عدالت میں اپنے جرائم پر صفائیاں پیش کرنے کی ناکام کوششیں کر رہے ہیں۔مشرقی کانگو کے جنگجو سردار پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔سابق امریکی سیکرٹری دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ گھر سے باہر نکلتے ہیں نہ ہی سابق نائب صدر ڈک چینی کوئی سفر کرتے ہیں''۔

درحقیقت 'انسانی حقوق کا عالمی منشور' دنیا کے بیشتر حصوں کی عدالتوں میں حقوق کی فہم کے ضمن میں حوالے کے سب سے بڑے معیار کی صورت اختیار کر چکا ہے۔انسانی حقوق کو اداراتی شکل میں لانے کا کام اس سطح تک انجام دیا جا چکا ہے کہ ریاستیں خود کو ان معیارات پر کاربند دکھانے پر مجبور رہتی ہیں، خواہ یہ عمل دکھاوے کی حد تک ہی کیوں نہ ہو۔

انسانی حقوق کے ایک یورپی کارکن کہتے ہیں ''یہ حقیقت کہ انسانی حقوق کی یورپی عدالت کی بات سنجیدگی سے سنی جاتی ہے، حکومتیں اس کے فیصلوں کو اہمیت دیتی ہیں اور چند مستثنیات کے سوا، زیادہ تر صورتوں میں ان فیصلوں پر عمل درآمد کرواتی ہیں، نیز یہ امر کہ یوری کونسل آف یورپ میں کوئی بھی شہری اپنے ملک کے اندر دادرسی کے سارے ذرائع استعمال کر چکنے کے بعد انفرادی حیثیت میں مذکورہ عدالت میں اپیل دائر کر سکتا ہے اور اسے اس بات کے قوی امکانات بھی دکھائی دیتے ہیں کہ عدالت اُس کے حق میں فیصلہ سُنا سکتی ہے۔علاوہ ازیں اُس کی حکومت بھی فیصلے پر عملدرآمد کی پابند ہوگی...... یہ اس حقیقت کا انتہائی اہم عملی مظاہرہ ہے کہ انسانی حقوق کی ثقافت یورپ میں کس حد تک مضبوط ہو چکی ہے''۔انسانی حقوق کے معیارات پر کاربند رہنے کی ضرورت، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امریکی قوانین اور امریکی جمہوریت کے ارتقا پر بھی اثر انداز ہوئی ہے باوجود یکہ وہاں پر اس نظریے کو ہمیشہ مزاحمت کا سامنا رہا ہے کہ بین الاقوامی قانون ملکی سطح پر بھی کئی باتوں کا تقاضا کرتا ہے۔سابق امریکی صدر ہیری ٹرومین کی انتظامیہ نے ایک مقدمے کے جواب میں سپریم کورٹ کے سامنے غیر معمولی نوعیت کی یہ اپیل پیش کی تھی کہ نسلی امتیاز اور گوروں اور کالوں کی تعلیم کا جداگانہ نظام تعلم ملک کی خارجہ پالیسی پر بُری طرح اثر انداز ہو رہا ہے کیونکہ سوویت یونین اقوام متحدہ نیز اپنے نشریاتی پراپیگنڈے میں اس صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کرتا ہے اور یہ ساری دنیا تک پہنچتا ہے۔اسی قسم کی حرکیات کی بازگشت ابوغریب اور گوانتانامو بے میں رونما ہونے والے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واقعات اور عالمی برادری میں امریکا کا تاثر خراب ہونے کے حوالے سے بھی سنائی دیتی ہے۔

عالمی قوانین اور کنونشنز کے جلو ایک ایسی تحریک نے بھی جنم لیا ہے جو حکومتوں کو مذکورہ قوانین کی پابند رہنے پر مائل کرتی رہتی ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں پر مشتمل انسانی حقوق کی عالمی تحریک کا وجود میں آنا خوش آئند بات ہے اور 'انسانی حقوق کا عالمی منشور' ہی لامحالہ وہ بین الاقوامی معاہدہ ہے جو اس نوعیت کی تحریک کو قانونی و اخلاقی جواز عطا کرتا ہے۔ انسانی حقوق کی نگرانی کی غیر جانب دار تنظیم ہیومن رائٹس واچ کی تاریخ مذکورہ تحریک کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ تنظیم 1975 میں معاہدہ ہلسنکی پر دستخط کیے جانے کے کئی برس بعد 'ہلسنکی واچ' کے نام سے وجود میں آئی تھی اور ابتدائی طور پر بہت محدود سے اہداف اس کے پیش نظر تھے یعنی اس بات کی نگرانی کرنا کہ سوویت یونین اور معاہدے کے دیگر دستخط کنندگان انسانی حقوق کے حوالے سے اپنے نئے وعدوں پر کاربند ہیں یا نہیں؟ 30 برس گزرنے کے بعد یہ تنظیم انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے عملاً ہر ایک پہلو کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اس کے دفاتر برسلز، جوہانس برگ، ماسکو، نیویارک اور ٹوکیو سمیت دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔

جس طرح ہیومن رائٹس واچ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل دو مِمیز ناموں کے طور پر اُبھرے ہیں، اسی طرح سے یہ تحریک بھی عورتوں، بچوں، معذور افراد اور ہر قسم کی اقلیتوں سمیت مخصوص کمیونٹیوں کے حقوق کی نگرانی پر معمولی توجہ مرکوز کرنے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ دیگر قانونی شعبوں میں اس تحریک نے ''قید خانوں کے در کھلوانے'' سے لے کر ایک وقت میں کسی ایک حق کی خلاف ورزی کی نگرانی کرنے، ان خلاف ورزیوں کی رپورٹنگ کرنے اور ان کے ذمہ داروں کو شرمسار کرنے سے لے کر مسلح تنازعات کے دوران ریاستوں کی طرف سے حقوق کی خلاف ورزی پر توجہ مرکوز کرنے تک کا سفر طے کیا ہے۔ عبوری انصاف تحریک کی حالیہ اور ممکنہ طور پر اہم ترین شاخوں میں سے ایک ہے۔ یہ معاملہ نہ صرف انسانی حقوق کے اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے بلکہ سیاسی اور سماجی ارتقا کا اہم ترین مگر اکثر نظرانداز کر دیا جانے والا محرک ہے کہ ریاستیں اور معاشرے اپنی قوم کی تاریخ کے اندر امریکا میں غلامی، روس میں سٹالن کی دہشت گردی، چلی میں پناشے کے مظالم جیسے پرتشدد اور المناک ابواب کو کیسے بیان کرتے اور کس طرح اُن کے ساتھ اپنا ناتا جوڑتے اور انہیں از سر نو مرتب کرتے ہیں۔ جب ان تواریخ اور واقعات کو مختلف ممالک اور معاشروں میں باہمی نزاع کی بنیاد بنایا جاتا ہے تو نتیجہ جنگوں کی صورت میں نکلتا ہے جیسا کہ 1990 کی دہائی میں بلقانی ریاستوں کے ساتھ ہوا تھا۔

ناکامیاں:

اب جبکہ 'انسانی حقوق کے عالمی منشور' کی منظوری کو 6 عشروں سے زائد وقت گزر چکا ہے، اس حوالے سے حاصل ہونے والی کامیابیاں، ناکامیوں کے سامنے ماند پڑ چکی ہیں۔ غالباً امریکا کی طرف سے تشدد کے خاتمے کے مروجہ ضابطوں کی خلاف ورزی کو نہ صرف سرفہرست رکھا جا سکتا ہے بلکہ اسے دنیا بھر کی مطلق العنان حکومتوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سلسلے میں حوصلہ افزائی کا سبب بننے نیز ریاستی اختیارات کو بے محابہ طریقے سے استعمال کرنے اور دُنیا کے کئی حصوں میں 'انسانی حقوق کے عالمی منشور' کے مرکزی نکتے یعنی حقوق کی آفاقیت کے بارے میں بڑھتی ہوئی لاپروائی کا ذمہ دار بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کا کردار:

امریکا میں اُس طرزِ عمل کا چلن جسے بعض نکتہ چیں ''تشدد کے کلچر'' کا نام دیتے ہیں، 9/11 کے دہشت گردانہ حملوں سے تھوڑا عرصہ بعد ہی ظہور پذیر ہوگیا تھا۔ صحافیوں اور دانشوروں نے ملزمان کی غیر قانونی حوالگی، فردِ جرم کے بغیر زیرِ حراست رکھے جانے اور غیر قانونی طریقوں سے تفتیش جیسی امریکی پالیسیوں کے فوری اسباب کے حوالے سے تفصیلی جائزے پیش کیے ہیں۔ تاہم یہ پالیسیاں کس چیز کی عکاسی کرتی ہیں، اس بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کیا مسلمہ اُصولوں سے یہ انحراف بالخصوص جنگ کے دنوں میں حکومتی و انتظامی اختیارات کے استعمال کی مختلف تعبیرات کا معاملہ تھا یا اس سے وسیع تر پس منظر سے تعلق رکھتا ہے؟ پالیسی اور رائے عامہ کے تناظر میں بات کی جائے تو سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا تشدد کے خلاف ضوابط میں فی الواقع نرمی رکھی گئی تھی؟ آئندہ کیا ہو گا، اس بارے میں ابھی سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیا اوباما انتظامیہ یا مستقبل میں آنے والی کوئی بھی حکومت کسی انکوائری کمیشن کے ذریعے پالیسیوں کا غیر جانبدارانہ عمومی جائزہ لے سکے گی یا پھر (اگرچہ اس بات کے امکانات بہت کم ہیں) ذمہ دار اہلکاروں کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کر سکے گی؟ کوئی اور دہشت گردانہ حملہ ہو جانے کی صورت میں پالیسیوں کی صورت حال کیا رہے گی؟

اگر گزشتہ چند برسوں کی امریکی پالیسیوں کو اُس بے پایاں قوت کا نتیجہ قرار دیا جائے جو صدر نے ''وحدانی اختیارات'' کے نظریے کے تحت اپنے عہدے میں مرکوز کر لی تھی تو منطقی طور پر یہی کہا جاسکتا ہے۔ صورت حال کے ازالے اور پالیسیوں پر نظرِ ثانی کی کوئی خاص ضرورت نہیں کیونکہ انتظامی اختیارات کی تبدیلی کے ساتھ ہی یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ تاہم انسانی حقوق کے بہت سے کارکنان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ گزشتہ 8 برس کا تجربہ کسی اور بات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ انسانی حقوق حتیٰ کہ تشدد جیسی بنیادی خلاف ورزی کے حوالے سے اتفاقِ رائے کس قدر کمزور اور نازک ثابت ہوا۔ لیری کاکس کا کہنا ہے ''جس حد تک لوگوں نے اپنے اندر انسانی حقوق کا فہم پیدا کیا اور ان کے ساتھ اُن کی وابستگیاں جس سطح تک تھیں، انسانی حقوق کی تحریک اس بارے میں بہت سی خوش فہمیوں کا شکار ہوگئی''۔

(بشکریہ: نوائے انسان دسمبر 2009)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرا باب

(جمہوریت اور انسانی حقوق، انسانی حقوق اور معاشی ترقی کے مابین تعلق)

- جمہوریت...... تاریخی پس منظر اور عصری تقاضے (محترمہ حنا جیلانی)
- جمہوری کلچر کے فروغ کے لیے سیاسی جماعتوں کا کردار (ڈاکٹر مہدی حسن)
- پاکستان میں آمریت کے مختلف ادوار۔ایک سرسری نظر (ڈاکٹر مہدی حسن)
- بجٹ میں انسانی حقوق کے لیے مختص شدہ رقم۔ایک جائزہ

(ڈاکٹر پرویز طاہر، ڈاکٹر نادیہ طاہر)

- جمہوریت، انسانی حقوق اور ترقی (ڈاکٹر حسن عسکری رضوی)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوریت......تاریخی پس منظر اور عصری تقاضے

پاکستان میں جمہوریت کے امکانات

(حنا جیلانی)

عدم مساوات کی افزائش

اگر چہ متعدد سیاسی نظاموں نے ''جمہوریت'' کا لقب اختیار کر رکھا ہے تاہم گزشتہ برسوں میں چند ایسے معیارات کو تسلیم کر لیا گیا ہے جن کی موجودگی کسی بھی معاشرے کے جمہوری ہونے کا دعویٰ کرنے سے پہلے ضروری ہے۔ جمہوری نظام کے قیام کے لیے یہ بنیادی شرط لازم مانی گئی ہے کہ ایک ایسا منصفانہ اقتصادی اور سیاسی نظام موجود ہو گا جو نہ صرف آزادی کی ضمانت دیتا ہے بلکہ ایسے سماجی اور سیاسی عقائد، رویوں اور اقدار پر اعتقاد رکھتا ہے جو انسانی مساوات پر صرف قانون کی حد تک نہیں بلکہ سیاسی عقائد کی تمام سطحوں پر اور عمل کی حد تک مبنی ہے۔

لسانی اور ثقافتی تنوع، معاشی عدم مساوات، طبقات اور ذاتوں کی تقسیم، قبائلی اور خاندانی وفاداریوں اور عوام اور خواص کے موروثی اختلافات نے پاکستانی معاشرے کو بڑی حد تک مرتب کیا ہے، اور اس کے جمہوریت اور انسانی حقوق کے بارے میں رویوں کو شکل دی ہے۔ معاشرے کی سب سے نمایاں خصوصیت جاگیردارانہ اور قبائلی سماجی نظام کی بالادستی ہے جس میں مضبوط پدرسری اور استبدادی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ سماجی طرز عمل انہی رجحانات سے تشکیل پاتا ہے جن کا اظہار اختیارات پر کنٹرول اور وسائل پر اجارہ داری کے کلچر سے ہوتا ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں نو آبادیاتی طرز حکومت نے حکمران خواص کے ایک ایسے طبقے کو جنم دیا جس کا تعلق جاگیرداروں، قبائلی گردیوں اور صنعتی بورژوازی سے تھا۔ دیہی آبادی کی اکثریت کی ریاست تک رسائی صرف کسی سرپرست کے توسط سے ہی ممکن تھی جو فیوڈل لینڈ لارڈ یا قبائلی سردار ہوتا تھا۔ اقتدار، اختیار اور مراعات کے لیے یہی خواص نو آبادیاتی حکمرانوں سے سودے بازی کرتے تھے، لہٰذا نو آبادیاتی دور حکومت میں سرپرست اور موالی (Client) کے یہ رشتے اور مضبوط ہو گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پنجاب اور سندھ میں جاگیرداروں اور سرحد اور بلوچستان میں قبائلی سرداروں کی دیہاتی آبادی پر گرفت، پاکستان میں عدم مساوات کی افزائش کا سب سے بڑا سبب بنی۔ سیاسی فیصلوں پر کنٹرول براہ راست یا بالواسطہ طور پر انہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہا جن کا مفاد صورت حال کو جوں کا توں برقرار رہا ہے۔

سندھ میں جاگیرداری نظام پنجاب سے زیادہ طاقتور ہے جبکہ سرحد میں قبائلی نظام میں درجہ بندی بلوچستان کے سرداری نظام کے مقابلے میں کم ہے۔ سندھ اور پنجاب میں اور خصوصاً جنوبی پنجاب میں اقتدار و اختیار کا سرچشمہ وسائل، یعنی زمین اور اس کی مصنوعات پر کنٹرول ہے۔ قبائلی معاشرے میں، خاندان اور کنبے کے مضبوط رشتوں کا تقاضہ ہوتا ہے کہ قبائلی خواص کی اطاعت کی جائے۔

اگر چہ ان سماجی ڈھانچوں میں بعض باتیں مختلف بھی ہیں لیکن ان میں سے ایسے عقائد اور رواجوں کے معاملے میں حیرت انگیز حد تک مماثلت بھی پائی جاتی ہے، جنہوں نے مراعات سے محروم طبقات کو جنم دیا۔ سماجی طور طریقوں میں سرپرستی کی بے ضرر روایت کی عدم موجودگی سے اسٹیٹس کو (Status quo) برقرار رہتا ہے۔ سوشل گروپس کے کمزور تر عناصر بے اختیار ہی رہتے ہیں اور کوئی تبدیلی لانے کے قابل نہیں ہوتے۔ سماجی گروہوں کے ارکان کی حیثیت میں عدم مساوات سے استحصال کی ایسی اشکال کو دوام حاصل ہوا ہے، جنہوں نے روایات کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اطاعت کے کلچر کی واضح ترین مثال زمین کے مالک جاگیردار اور کسان کے درمیان تعلق ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ عورت کی غلامی سماج کی تمام تہوں میں، سماجی ڈھانچوں اور ثقافت میں تنوع کے باوجود مشترک ہے۔

مؤثر زرعی اصلاحات پر عملدر آمد میں ناکامی کے نتیجے میں بڑے بڑے قطعات اراضی پر ذاتی ملکیت قائم ہے، پاکستان میں زرعی اصلاحات کی جانب پہلی کوشش 1959 میں اور دوسری 1972 میں کی گئی جبکہ تیسری کوشش 1977 میں ہوئی۔ یہ کوششیں بڑے بڑے قطعات اراضی کی ملکیت میں کوئی اہم تبدیلی لانے میں ناکام رہیں اور ان سے جاگیرداروں کی سماجی اور سیاسی قوت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، زرعی اصلاحات کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ملکیت کی حد مقرر کرنے کا اصول تھا۔ ملکیت کی حد خاندانوں کی بجائے فرد کی ملکیت کی بنیاد پر مقرر کی گئی۔ اس طرح بیشتر جاگیرداروں کو زمین کی جعلی یا محض رسمی منتقلی کے ذریعے اصلاحات سے بچ نکلنے کا موقع ملا۔ بہت سے زمینداروں نے اصلاحات میں دوسرے قانونی سقم سے فائدہ اٹھایا اور مقررہ حد سے زائد اراضی اپنے قبضے میں رکھی، اراضی کی منصفانہ تقسیم کے مقصد کے حصول میں زرعی اصلاحات کی ناکامی کا اندازہ مندرجہ ذیل تبصرے سے لگایا جا سکتا ہے۔

"مقررہ حد سے اراضی کی نشاندہی کرنے کے بعد بھی جاگیرداروں کے پاس بڑے بڑے قطعات اراضی بچے رہے۔ 1959 میں صرف 35 فیصد (19 لاکھ ایکڑ) زمین جو مقررہ حد سے زائد قرار دی گئی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومت کے قبضے میں آئی۔ 1972 میں اس سے بھی کم اراضی، یعنی صرف ایک لاکھ ایکڑ، حکومت کی تحویل میں لی گئی۔ زرعی اصلاحات کی کوششوں کے نتیجے میں حکومت کے قبضے میں جو اراضی آئی اس کا بڑا حصہ غیر مزروعہ تھا اور اس پر کاشت کے لیے خاصی اصلاح کی ضرورت تھی۔ اراضی حاصل کرنے والے کسانوں کی قرضوں یا امدادی خدمات تک رسائی نہیں تھی لہٰذا وہ انہیں ملنے والی اراضی سے کوئی معاشی یا سماجی فائدہ حاصل نہیں کر سکے۔''

1960 کے عشرے کے اواخر میں ''سبز انقلاب'' کے بعد یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں نے زرعی اصلاحات کی کوئی ضرورت ہی نہیں محسوس کی کیونکہ حکومت کو آمادہ عمل کرنے کے لیے اب یہ دلیل نہیں دی جاسکتی تھی کہ چھوٹے فارموں کی پیداوار بڑے فارموں سے زیادہ ہوتی ہے۔ زیادہ حقیقی زرعی اصلاحات کی کسی نئی کوشش کے امکانات 1989 میں فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلے کے بعد قطعاً معدوم ہو گئے۔ اس فیصلے میں 1972 کے لینڈ ریفارمز آرڈیننس کو غیر اسلامی قرار دے دیا گیا اور یہ اصول متعین کر دیا گیا کہ زرعی اصلاحات کا پورا تصور ہی غیر اسلامی ہے۔

دیہی خواص کی آمدنیاں تو بڑھتی رہیں، دیہی علاقوں کے غریب عوام کو ان کی غربت میں اضافہ ہی نصیب ہوا، جس کے نتیجے میں بے زمین کسانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اس سے نہ صرف جاگیرداروں کی عملداری مستحکم ہوئی بلکہ ان لوگوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی جو ان کے رحم وکرم پر تھے۔ جاگیرداری نظام اپنی رعیت کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر کنٹرول کے ذریعے چلتا ہے۔ جاگیردار، کسان کی محنت پر کنٹرول رکھنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ اگر کوئی شرائط کار پیش بھی کی جاتی ہیں تو وہ انتہائی استحصالی ہوتی ہیں۔ بسا اوقات کسانوں سے جبری اور غلامانہ مشقت لی جاتی ہے۔ کسانوں کے سماجی حقوق بھی جاگیردار کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں۔ جاگیردار طبقہ تعلیم کی حوصلہ شکنی کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ تعلیم سے کسانوں کو قوت مل جائے گی اور وہ ان کے جاگیردارانہ کنٹرول کو چیلنج کرنے لگیں گے۔ استحصال بعض اوقات افراد کے استعمال بے جا اور تشدد کی سنگین صورت اختیار کر لیتا ہے۔ خواتین پر مجرمانہ حملے اور زیادتیاں، خاندانوں کی نقل وحرکت روکنے کے لیے انہیں حبس بے جا میں رکھنا، بچوں سے مشقت لینا، جبر کے خلاف سر اٹھانے پر ظالمانہ اور غیر انسانی سزائیں دینا، دیہی پاکستان کے جاگیردارانہ نظام میں عام باتیں ہیں۔

کسان طبقے کی خواتین ایک تو اپنے سماجی طبقے کے رکن کی حیثیت سے دکھ اٹھاتی ہیں دوسرے جنس کی بنیاد پر بھی انہیں اپنے حق اور مرتبے سے محروم رکھا جاتا ہے۔ جاگیردار طبقے کی خواتین کو غربت سے تو نجات مل جاتی ہے، لیکن جاگیرداری رسوم ورواج میں ان کی حیثیت اور حقوق بھی کسان عورتوں کی طرح خطرے میں ہوتے ہیں بلکہ بعض اعتبار سے قبائلی اور جاگیردار خاندانوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کی آزادی، کسان خواتین سے بھی زیادہ محدود ہوتی ہے۔ تعلیم اور صحت سمیت بیشتر سماجی حقوق سے ان کی محرومی کا سبب غربت نہیں بلکہ علیحدگی اور پردے کے وہ سخت ضابطے ہیں جو ان پر مسلط کیے جاتے ہیں۔ انہیں معاشی آزادی کے کوئی مواقع میسر نہیں۔ اگرچہ قانون

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے تحت وہ وراثت کی حقدار ہوتی ہیں لیکن پدرسری رجحانات کی وجہ سے جاگیردار اشرافیہ میں خواتین کو اس حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ زمین کی تقسیم سے بچنے کے لیے صرف مرد وارثوں کو موروثی جائیداد میں سے حصہ دیا جاتا ہے، جہاں کہیں زمین کی ملکیت خواتین کو منتقل بھی کی جاتی ہے وہ قانون کی رعایت حاصل کرنے یا لینڈ ریفارم اسکیموں سے بچنے کے لیے، بلکہ اکثر تو ایسی خواتین کو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ زمین کی مالک ہیں۔ پدرسری رجحانات اور نظام اقدار نے تمام فیصلے کرنے کے اختیارات سے بھی خواتین کو محروم کر رکھا ہے۔ شادی کے لیے انتخاب کا حق قطعاً نہیں دیا جاتا، خاندانی اتحاد قائم کرنے یا اپنی طاقت کی بنیادیں مستحکم کرنے یا اراضی کی ملکیت کا تحفظ کرنے کے لیے خواتین کی ادلے بدلے کی شادیاں کر دی جاتی ہیں۔

طبقاتی یا شہری اور دیہی تنوع سے قطع نظر خواتین کو ایسے ثقافتی رسوم و رواج کا پابند بنایا جاتا ہے جو جابرانہ اور امتیازی ہیں۔ ایسی رسومات میں بندھے سماج میں عورت کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ان کا اپنا کوئی آزاد وجود یا وقار نہیں ہے۔ انہیں خاندانی عزت و وقار کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ ان کی بے عزتی کو خود عورت کی بے عزتی نہیں بلکہ خاندانی وقار کی بے حرمتی سمجھا جاتا ہے، بے عزتی اور ذلیل کرنے کا ایک عام طریقہ جو جاگیردار عام طور پر بغاوت کرنے والے رعیتی کو سزا کے طور پر استعمال کرتے ہیں، یہ ہے کہ اس خاندان کی عورتوں کو برسرعام برہنہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر عورت شادی کے معاملے میں اپنی پسند کے حق کا استعمال کرے تو خواہ اس کا تعلق جاگیردار اور قبائلی ماحول سے ہو یا شہری علاقوں سے، اسے بھی خاندان کی عزت پر داغ سمجھا جاتا ہے اور اس پر انتہائی تشدد کیا جاتا ہے۔ آبادی کی شہروں میں منتقلی کا عمل بڑے پیمانے پر اور تیزی سے ہو رہا ہے لیکن اس سے پاکستانی معاشرے میں اقتدار و اختیار کی تصویر نہیں بدلی۔ پاکستان میں جاگیرداری محض ایک سوشل سسٹم نہیں بلکہ ایک اندازِ فکر بن گئی ہے جو اس صورت میں بھی رویوں اور اقدار کو متاثر کرتی ہے۔ جب جاگیرداری پر عمل نہ بھی ہو رہا ہو جیسے شہری علاقوں میں، یہاں پر اکثریت کو باہر رکھ کر خواص ہی اقتدار اور وسائل پر قابض ہوتے رہیں۔ یہاں بھی ریاست تک لوگوں کی رسائی خواص کے درمیانی واسطے سے ہوتی ہے۔ عام شہری کو روزگار کے حصول، پولیس سے جان و مال کے تحفظ، حتیٰ کہ سرکاری ہسپتالوں سے علاج کرانے کے لیے بھی کسی سرپرست پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

ریاست کی ملٹرائزیشن

آزادی کے بعد پاکستان کی ابتدائی زندگی میں ہی بیوروکریسی اور فوج کے ادارے بالادست حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ فوجی مداخلت کی نوعیت اور وسعت اور انتظامی ڈھانچے پر بیوروکریسی کے کنٹرول سے ہی ریاست کا کردار متعین ہونے لگا، اور یہی عوامل اب بھی ملک کی سیاسی، معاشی اور سماجی ترقی پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فیصلہ سازی میں بیوروکریسی نے اتنا غالب کردار کیسے حاصل کرلیا اس کا سبب وہ طرز حکمرانی ہے جو نئی مملکت نے اختیار کیا، اس کا سبب یہ بھی تھا کہ ایسی کوئی منظم سیاسی جماعت برسر اقتدار نہیں تھی جسے صوبوں کی بھی بھرپور حمایت حاصل ہو۔ پاکستان نے ''وائسرائے والا'' طرز حکومت اختیار کیا جس میں گورنر جنرل اختیارات اور اقتدار کا سرچشمہ تھا۔

نوزائیدہ ملک میں جو بے شمار مسائل سے دوچار تھا اور وسائل محدود تھے، کسی منظم مشینری کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس انتہائی مرکز پرست ریاست کا انتظام چلانے کے لیے بیوروکریسی کے ڈھانچے پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ آئین کی تدوین اور نفاذ تک جس قانونی ڈھانچے کے تحت ملک کو چلایا گیا اس میں مرکز اور صوبوں کے تعلقات واضح نہیں تھے۔ چنانچہ آزادی کے فوراً بعد ہی مرکز اور صوبوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہونے لگی اور بے چینی اور بے اطمینانی کا اظہار ہونے لگا۔ اس موقع پر مسلم لیگ نے پارٹی کو حکومت سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی پالیسیاں اب عوام کے مطالبات پر یا سیاسی جماعت کے مشوروں اور اطلاعات کی بنیاد پر نہیں بنائی جاتی تھیں۔ اس عمل سے پارٹی کی تنظیم کو اور بھی نقصان پہنچا۔ جوں جوں عوامی حمایت کم ہوتی گئی صوبوں کے ساتھ محاذ آرائی کی وجہ سے وفاقی حکومت مرکزی کنٹرول نافذ کرنے کے لیے اتنا ہی زیادہ بیوروکریسی پر انحصار کرنے لگی۔ بیوروکریسی کے اعلیٰ طبقات نے بتدریج سیاسی اتھارٹی سے فیصلے کرنے کے اختیارات غصب کر لیے اور پھر فوج کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پہلے سیاسی عمل کو پٹری سے اتارا اور پھر بالکل ملیا میٹ کر دیا۔

فوج کو ایک نمایاں مقام دلانے اور اداروں میں عدم توازن پیدا کرنے میں جو آج تک برقرار رہے، ہندوستان کے ساتھ محاذ آرائی اور مسئلہ کشمیر اہم عوامل تھے۔ مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے موقف کے پیش نظر فوج کی صلاحیت میں اضافہ سب سے بڑی ترجیح بن گئی خواہ اس کے لیے خزانے پر کتنا ہی بوجھ پڑے۔ اس بات سے قطع نظر کہ کشمیر کا فوجی حل کتنا قابل عمل ہے، یہ جھگڑا فوج کو ملک کے مالی وسائل کا سب سے بڑا حصہ دیے جانے کا سبب بنا۔ ایک طرف ہندوستان اس صورت حال کو اپنی فوجی قوت بڑھانے کا بہانہ بنا رہا تھا تو دوسری طرف پاکستان میں فوجی انتظامیہ سیاسی قیادت پر دباؤ ڈالتی رہی کہ دفاعی اخراجات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے۔ یہ صورت حال آج بھی جاری ہے، توسیع کے لیے رقم حاصل کرنے لیے پاکستان کی فوجی قیادت نے خود اپنے بین الاقوامی روابط پیدا کر لیے اور ان پر روابط کو سیاسی اور معاشی فیصلہ سازی میں اپنے لیے بڑے کردار کے حصول کے لیے استعمال کیا اور پھر 1958 میں براہ راست مداخلت کر کے اس کردار کی اجارہ داری حاصل کر لی۔ یہ وہ وقت تھا جب ایسے سیاسی گروہوں کی جانب سے چیلنج ابھرنا شروع ہو گئے تھے جو بیوروکریسی اور فوج کے زیر تسلط ریاست کی پالیسیوں کے خلاف عدم اطمینان کا اظہار کر رہے تھے اور 1956 کے آئین کے تحت پہلے قومی انتخابات ہونے والے تھے۔

اس وقت سے فوج مؤثر طور پر ریاستی پالیسیوں کا رُخ اور سیاست کا راستہ متعین کرتی رہی ہے۔ ایوب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خان نے پہلے مارشل لا کے ذریعے حکومت کی پھر 1962 میں اپنا آئین مسلط کر دیا، ان کے دور حکومت میں فوج اور بیوروکریسی کا گٹھ جوڑ اور زیادہ مستحکم ہوا اور سول اور فوجی بیوروکریسی کا اقتدار پکا ہو گیا۔ ایوب خان کے بعد سول بیوروکریسی کے اختیارات کو پہلے یحییٰ خان نے اور پھر ذوالفقار علی بھٹو نے محدود کیا۔ البتہ 1971 کی جنگ میں بڑے پیمانے پر شکست کھانے کے بعد فوج کی قوت جوں کی توں برقرار رہی۔ مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کی ناکامی اور فوج کی تبدیل شدہ امیج کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں فوج ریاستی اداروں کے درمیان توازن کا ایک نیا دور تسلیم کر سکتی تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بھٹو حکومت نے داخلی سطح پر درپیش مسائل کے دباؤ میں بلوچستان میں بلوچ قوم پرستوں کے خلاف کو استعمال کیا۔ بھٹو فوج میں بڑے پیمانے پر تبدیلی یا اس کی تنظیم نو سے فوج میں پیدا ہونے والی بے چینی یا بے اطمینانی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، انہوں نے اعلیٰ فوجی قیادت کے کچھ ارکان کو ہٹا کر فوج کو سدھارنے کی کوشش ضرور کی اور یہ سمجھا کہ کئی سینئر جنرلوں پر سبقت دلا کر جنرل ضیاالحق کو چیف آف آرمی سٹاف بنا کر انہوں نے خود کو اور سول حکومت کو فوج کی مداخلت سے محفوظ کر لیا ہے۔

لیکن بھٹو کو اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب ضیا نے ان کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا، بھٹو کو گرفتار کر لیا اور بعد میں ان پر قتل کا مقدمہ چلا کر اپریل 1979 میں انہیں پھانسی پر لٹکا دیا۔ اپوزیشن پارٹیاں بھٹو کے خلاف متحد ہو چکی تھیں، انہوں نے حکومت پر 1977 کے انتخابات میں دھاندلی اور فراڈ کے الزامات لگا کر مہم چلائی کہ بھٹو کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیں، لیکن جب سیاسی بحران ٹھنڈا پڑ چکا تھا، حکومت اور سیاسی جماعتوں کے درمیان مذاکرات تقریباً کامیاب ہو گئے تھے، فوج نے ایک بار پھر مداخلت کی۔ اس مرتبہ فوج نے ایک ایسی منتخب حکومت کو ہٹا کر سیاسی نظام میں خلل ڈالا جس کے سربراہ کی مقبولیت اگرچہ کم ہو گئی تھی لیکن بالکل ختم ہرگز نہیں ہوئی تھی۔ یہ 1958 جیسی صورت حال نہیں تھی جب فوج نے سیاسی انتشار، اقتصادی بحران اور حکومتی پالیسیوں سے عمومی عدم اطمینان کی فضا میں اقتدار پر ہلہ بولا تھا۔ 1958 میں اقتدار کسی منتخب حکومت کے پاس نہیں تھا، جس کے ساتھ آبادی کا کوئی طبقہ ہمدردی محسوس کرتا۔ لہٰذا اس وقت فوج کے اقدام کے خلاف کسی عوامی غم و غصے کا کوئی خطرہ نہیں تھا اور چونکہ فوج نے پہلی بار مداخلت کی تھی، لوگوں کو اس استدلال کے کھوکھلے پن کا کوئی تجربہ نہیں تھا کہ مسلسل اتھل پتھل کے سیاسی ماحول کے مقابلے میں جس میں کوئی ترقی ممکن نہیں، کوئی مارشل لا استحکام لاتا ہے۔

1977 میں صورت حال قطعاً مختلف تھی۔ لوگوں کو نمائندگی پر مبنی نظام کا چسکا پڑ چکا تھا، بھٹو کو اب بھی خاصی عوامی حمایت حاصل تھی، خاص طور پر ان کے اپنے صوبے سندھ میں، 1971 کی شکست کے بعد فوج کے وقار کو بھی دھچکا لگ چکا تھا۔ اب سب لوگ اسے نجات دہندہ نہیں سمجھتے تھے جو عوام کو بد دیانت سیاستدانوں کے استحصال سے نجات دلانے کے لیے مداخلت کرتی تھی، حالانکہ فوجی قیادت عوام کو بار بار یہی پیغام دیتی رہی۔ لہٰذا فوجی حکومت کو اپنی مداخلت کا جواز ثابت کرنے کے لیے نہ صرف ایک مضبوط استدلال کی ضرورت تھی بلکہ ممکنہ اختلافی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آوازوں کو خاموش کرنے کے لیے ریاستی مشینری کو استعمال کرنے کا شعوری فیصلہ بھی کرنا تھا۔ ضیا نے بڑی بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ یہ سب کچھ کیا۔

ضیا کچھ عرصے تک تو مخالف قوتوں کو کنٹرول کرنے یا انہیں غیر مؤثر بنانے میں کامیاب رہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا گیارہ سال تک برسر اقتدار رہنا ان کی داخلی حالات کو مہارت کے ساتھ سنبھالنے کی صلاحیت کا نتیجہ تھا۔ افغانستان پر روس کے حملے نے اس خطے میں پاکستان کی فوجی اہمیت کو بڑھا دیا، ضیا اور مغربی قوتوں خصوصاً امریکہ نے اس صورت حال کو باہمی مفاد کے لیے استعمال کیا۔ پاکستان کی سرزمین مجاہدین کی تربیت کے لیے استعمال کی گئی تاکہ وہ افغانستان میں سوویت فوج کا مقابلہ کر سکیں، اسے مجاہدین کو اسلحہ کی سپلائی کے روٹ کے طور پر بھی استعمال کیا گیا، ضیا نے فوجی امداد میں اضافے کے لیے سودے بازی کی۔ پاکستان کو ترقیاتی امداد دینے کے لیے بھی سمجھوتے فوراً کر لیے گئے۔ سرد جنگ کے ایجنڈے پر کامیابی کے ساتھ عملدرآمد کے لیے پاکستان میں "اسٹیٹس کو" برقرار رکھنا ناگزیر تھا۔ ضیا کے انسانی حقوق کے ریکارڈ یا پاکستان کی جمہوری ترقی پر اس کے اثرات کو افغان جنگ کے خاتمے تک بڑی آسانی کے ساتھ طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا۔ یہ بات اہم ہے کہ اسی دوران حکومت کو قانونی جواز دینے کے لیے دوسری حکمت عملی تلاش کرنے کی کوشش کی گئیں۔ داخلی حالات انتہائی نازک ہو چکے تھے اور معاملات کو رفع دفع کرنے کے حربے اب مؤثر نہیں رہے تھے۔ ضیا نے ان کوششوں کا آغاز 1984 میں ریفرنڈم کے ذریعے کیا۔ لوگوں کو اس سوال کا جواب دینا تھا کہ آیا وہ ملک میں اسلامی حکومت چاہتے ہیں یا نہیں، اگر اس کا جواب ہاں میں آیا تو ضیا یہ فرض کر لیں گے کہ انہیں مزید پانچ سال برسر اقتدار رہنے کا مینڈیٹ دے دیا گیا ہے۔ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور انہیں بے وقوف بنانے کی ایسی کھلم کھلا کوشش کی۔ پاکستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ لہٰذا اس پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ یہ کوشش بُری طرح ناکام ہو گئی۔ اس سے حکومت کی چالاکی کا بھانڈہ پھوٹ گیا، اور اس کا اعتبار اور بھی جاتا رہا۔ اگرچہ 1985 میں غیر جماعتی انتخابات کرائے گئے اور پارلیمنٹ قائم کی گئی لیکن 1986 تک مارشل لا نہیں ہٹایا گیا۔ ضیا نے صدر کے عہدے کے ذریعے فوج کے لیے پاور بیس بنانے کی خفیہ کوششوں کے تحت آئینی ترامیم مسلط کیں۔ 1988 سے پارٹی کی بنیاد پر انتخابات ہو رہے ہیں۔ تاہم قومی اسمبلی کے عرصہ حیات کو کنٹرول کرنے کے لیے صدر کے اختیارات میں اضافے کے لیے جو آئینی ترامیم کی گئی تھیں صدر نے ان کی مدد سے یکے بعد دیگرے چار اسمبلیاں توڑیں۔

اس بات کی بھی کوششیں کی گئیں کہ آئینی طور پر فوج کو سیاسی اقتدار میں حصہ دار بنایا جائے۔ جب ایسی کوششیں ناکام ہو گئیں تو پھر دوسری تجاویز پیش کی گئیں کہ اہم مسائل پر فیصلہ سازی میں فوج کو زیادہ بڑا کردار دیا جائے۔ فوجی انتظامیہ اور اس کی انٹیلی جنس ایجنسیوں نے سول حکومتوں کو غیر مستحکم کرنے اور ہٹانے میں کس حد تک کردار ادا کیا اس پر بحث تو ہو سکتی ہے، لیکن ان ایجنسیوں کی ورکنگ پر اخفا کا جو پردہ پڑا ہے اس کی وجہ سے اس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پوری تحقیقات نہیں کی جاسکتی۔

سیاسی عمل کے بار بار ٹوٹنے پر عدلیہ کے ردعمل نے نہ صرف فوجی مداخلت کے سلسلے کو قانونی جواز دیا بلکہ ایسی مداخلت کو قبول عام کا درجہ دلانے کے لیے گنجائش پیدا کرنے کی ذمہ دار بھی بڑی حد تک عدلیہ ہی ہے۔ اعلیٰ عدالتوں نے اپنے فیصلوں میں فوجی مداخلت کو قانونی جواز دینے کے لیے نظریہ ضرورت کا سہارا لیا، سوائے یحییٰ خان کے اقتدار ہتھیانے کے معاملے کے، جس میں یہ فیصلہ اگرچہ قابل تعریف تھا کہ فوج کی جانب سے غیر آئینی طور پر اقتدار سنبھالنے کے قانونی جواز کے تمام دعوؤں کو مسترد کر دیا گیا تھا، لیکن فیصلہ اس وقت دیا گیا جب خود غاصب کو بھی معزول ہوئے خاصا عرصہ گزر چکا تھا، اس فیصلے کے اثرات زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوئے۔ سپریم کورٹ نے اس فیصلے کے کئی اصولوں کو بعد میں نظر انداز کر دیا اور نہ صرف ضیا کی حکومت کو قانونی جواز بخشا بلکہ اسے آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی دے دیا۔

بار بار کی فوجی مداخلت نے نہ صرف پاکستان میں جمہوری ترقی کو متاثر کیا بلکہ اقتدار میں شراکت کے حوالے سے نسلی اور صوبائی عدم مساوات کو بڑھا کر قومی یکجہتی کو بھی نقصان پہنچایا، فوج زیادہ تر پنجابیوں پر مشتمل ہے۔ ان کے بعد پختون ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق 60 سے 65 فیصد فوجی افسر اور 70 فیصد اعلیٰ کمان کے عہدے پنجابیوں کے پاس ہیں، جبکہ 30 سے 33 فیصد افسران پختون ہیں۔ بلوچ 2 سے 3 فیصد ہیں اور فوج کی مجموعی تعداد میں سندھیوں کا حصہ صرف ایک فیصد ہے، اعلیٰ عہدوں پر ان کی کوئی نمائندگی نہیں ہے۔ فوج میں جن نسلی گروہوں کو نمائندگی نہیں ملی ان کا احساس محرومی اس وقت اور شدید ہو جاتا ہے جب فوج برسر اقتدار آتی ہے، فوج کے مسلسل سول حکومتوں پر کنٹرول اور ریاستی پالیسیاں منوانے کی صلاحیت نے آبادی کے ایک بڑے حصے کو ریاست سے لاتعلق اور بے گانہ کر دیا ہے۔ بلوچوں اور سندھیوں میں یہ لاتعلقی زیادہ نمایاں ہے۔ پنجابیوں کے غلبے والی فوج اپنی شناخت قومی فوج کے طور پر کرتی ہے اور نسلی قومیتوں کے تمام دعوؤں کو مسترد کرتے ہوئے قومی سیاست میں ان دعوؤں کو قبول کرنے کے دلائل کو ملک دشمنی قرار دیتی ہے۔ فوج کی بالادستی کو پنجاب کی بالادستی سمجھا جاتا ہے اور یہ تصور محروم علاقوں میں گہری نفرت کو جنم دیتا ہے۔ فوج کی تشکیل میں نسلی عدم توازن نے ملک میں نسلی تقسیم کے عمل کو برقرار رکھنے بلکہ تیز کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

حالیہ برسوں میں فوج نے زیادہ ضبط و تحمل کا ثبوت دیا ہے اور سیاسی امور میں براہ راست یا خفیہ مداخلت سے گریز کیا ہے۔ تاہم یہ بات قطعی واضح ہے کہ فوجی قیادت خارجہ پالیسی کے امور میں فیصلوں پر ابھی بھی خاصا اثر رکھتی ہے۔ خصوصاً افغانستان اور ہندوستان کے ساتھ تعلقات کے معاملے میں۔ اگرچہ سیاسی اتھارٹی اور روایتی مقتدرہ کے درمیان تعلقات کے بارے میں تشویش اب بھی پائی جاتی ہے تاہم ان کے درمیان جیسی کشیدگی 1988 کے انتخابات کے بعد سے فروری 1997 کے انتخابات تک پائی جاتی تھی وہ اب نظر نہیں آتی۔ آئینی ترامیم کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذریعے صدر کے قومی اسمبلی کی تحلیل اور حکومت کو برطرف کرنے کے اختیارات واپس لے لیے جانے کے بعد صورت حال شاید بہتر ہوگئی ہے اور سیاسی حکومتوں کو زیادہ اعتماد اور میعاد کے بارے میں تحفظ حاصل ہوگیا ہے۔

اگرچہ فوج کا ظاہری سیاسی کردار کم ہوگیا ہے تاہم اس کی معاشی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ فوج بڑے بڑے صنعتی، تجارتی اور مالیاتی اداروں کی مالک ہے۔ اس کے ساتھ ہی سول امور میں فوج کا کردار بڑھ گیا ہے کیونکہ اہم سول آسامیوں پر ریٹائرڈ اور حاضر سروس فوجیوں کو تعینات کیا گیا ہے۔ 1988 میں سول حکومت کی بحالی کے بعد سے ہر الیکشن فوج کی بھاری موجودگی میں کرایا گیا ہے۔ مسلح افواج نے 1998 میں مردم شماری کرانے میں بھی بڑا اور اہم کردار انجام دیا۔ لاء اینڈ آرڈر کے نفاذ کے لیے فوج کا استعمال بدستور جاری ہے، خصوصاً سندھ میں۔ حکومت پنجاب نے تعلیم اور صحت جیسے شعبوں میں کرپشن کی تحقیقات کی ذمہ داری فوج کے سپرد کی ہے جبکہ سڑکوں کی تعمیر کے بڑے بڑے ٹھیکے بھی فوج کے اداروں کو دیے گئے ہیں۔

قومی خزانے پر دفاع کا بوجھ کم نہیں ہوا ہے۔ موجودہ اقتصادی بحران کے دوران دفاعی اخراجات کا بوجھ زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ ترقیاتی کاموں کے لیے دستیاب قلیل وسائل اور بھی کم ہوگئے ہیں۔ سماجی شعبے کے اخراجات سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود دفاعی اخراجات میں کمی کے بارے میں سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ جب بھی ترقیاتی کاموں کی قیمت پر دفاعی اخراجات پر نکتہ چینی کی جاتی ہے حکومت فوراً ہندوستان کی جارحیت کے خطرے کے حوالے سے بیانات دے کر ان کا جواز ثابت کرنے لگتی ہے۔ ڈیفنس بجٹ اگرچہ اس فنانس بل کا حصہ ہوتا ہے جو منظوری کے لیے پارلیمنٹ میں پیش کیا جاتا ہے لیکن ایوان بل کے اس حصے پر بحث نہیں کرتا (گو کوئی آئینی بندش نہیں ہے) اگرچہ اس بات کی علامات پائی جاتی ہیں کہ فوج سیاست میں سرگرم حصہ نہیں لے گی لیکن اس کی اہمیت کسی طور پر بھی کم نہیں ہوئی ہے اور جب بھی اس کے مفادات کو خطرہ ہو یہ سیاسی حکومتوں سے ضروری یقین دہانیاں حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

قومی نظریہ اور قومی یکجہتی

جنوبی ایشیا کی قومی ریاستوں میں ایک مشترکہ موضوع نو آبادیاتی دور کے تجربات ہیں جن کے نتیجے میں عوامی آزادی کی تحریکوں کو فروغ ملا اور جن کے نتیجے میں پہلی بار جمہوری حقوق کی گنجائش پیدا ہوئی۔ تاہم بعد میں آنے والی آزاد حکومتوں نے مرکز کے ذریعے کنٹرول پر اپنے اقتدار کی بنیاد رکھی جس سے آمریت کو فروغ ملا اور جمہوریت کمزور ہوئی۔ یہ حکومتیں قومی ریاست میں قومی یکجہتی کے نام پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے پر مصر رہیں۔ جمہوری حقوق مزید کم کیے گئے اور موعودہ آزادیوں کا استعمال اور محدود ہوگیا۔ لیکن جمہوریت میں تو رویوں اور نقطہ نظر میں انقلابی تبدیلیاں درکار ہوتی ہیں تا کہ جمہوری قدریں جڑ پکڑ سکیں۔ جمہوریت کا اظہار مضبوط اداروں کی شکل میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہونا چاہیے، جن کے ذریعے معاشرے کے تمام طبقوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی ترقی کو فروغ مل سکے۔ اگر کسی گروپ یا زمرے کے افراد کو پوری طرح اقتدار میں شرکت کی اجازت نہ ہو یا وہ آزادیاں میسر نہ ہوں جن سے ان کی شرکت ممکن ہو سکے تو ایسا نظام جمہوری نہیں ہوگا۔

برصغیر میں سماجی تحریکوں کی تاریخ بہت طویل ہے۔ سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں اور انہوں نے آزادی کے لیے مذاکرات میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن اس عمل میں جس چیز کا فقدان تھا وہ یہ تھی کہ افراد متحرک کر کے 'عوام' یا 'قوم' کے مساوی اراکین بنائے جاتے۔ غیر منقسم ہندوستان کے معاشرے میں انتہائی متضاد مفادات کی وجہ سے ایسی تحریک بہت مشکل تھی۔ حتیٰ کہ نو آبادیاتی حکمرانوں سے آزادی کی تحریک بھی دو حصوں میں بٹ گئی کیونکہ ''مسلمانوں کے مفادات'' کے تصور نے پاکستان کی تحریک کو جنم دیا، جو ان علاقوں میں شروع ہوئی جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ یہ مفاد ''دو قومی نظریے'' پر مبنی تھا یعنی یہ دعویٰ کہ ہندوستان بھر کے جغرافیائی طور پر بکھرے ہوئے مسلمان ایک علیحدہ اور قابل شناخت قوم ہیں جسے اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا حق حاصل ہے، تاہم ان علاقوں کی آبادی میں جو پاکستان میں شامل ہوئے (ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقے) اس تحریک سے جذباتی لگاؤ بہت سطحی تھا۔

ایک علیحدہ پاکستانی ریاست کے قیام کا اثر جغرافیائی محل وقوع اور تحریک پاکستان سے وابستگی کے حوالے سے الگ الگ ہوا۔ پاکستان اور بھارت کی نئی سرحدوں کے علاقوں میں رہنے والوں نے آبادی کے اخراج اور آمد اور اس کے ساتھ فسادات اور تباہی کو بھی دیکھا، لہٰذا انہیں تقسیم ملک اور آزادی کے حصول کا براہ راست تجربہ ہوا۔ مہاجرین کو زبردست صدمات اٹھانے پڑے، انہیں اس بحران سے نمٹنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑی۔ تاہم پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں میں پہلے سے رہنے والے لوگوں کے لیے مجموعی طور پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مثال کے طور پر سندھ اور بلوچستان کے کسانوں پر قیام پاکستان کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔ اقتدار میں شرکت کے مطالبات اتنے مستحکم نہیں تھے کیونکہ عوام میں وسیع پیمانے پر تحریک نہیں تھی اور نہ ہی سیاسی اور سماجی ماحول میں ایسا محرک تھا جو انہیں کسی شہریت کے بندھن سے باندھ سکتا۔

ریاست خود ایسے اداروں کو فروغ دینے میں ناکام رہی جن میں اس آبادی کے اجتماعی کردار کو سمویا جا سکتا جو اسے ورثے میں ملی تھی اور لسانی، نسلی اور ثقافتی اختلافات کے باوجود مشترکہ مفادات کی ایک بنیاد تیار کی جا سکتی۔ ریاست کے مرکزیتی ڈھانچے پر مبنی حکومت قومی یکجہتی کے لیے سازگار اور معاون نہیں تھی، سیاسی اور اقتصادی اختیارات میں عدم مساوات بڑھتی چلی گئی۔ ایک تنگ سماجی بنیاد سے لی گئی سیاسی قیادت، قومی یکجہتی کے بنیادی مسائل سے عہدہ برا ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی، خواص نے ذیلی قومیتوں کے اظہار کو لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ قرار دیا اور اسے کچلنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا۔ اس جواب سے مسئلہ اور سنگین ہوگیا۔ موجود اداروں کے ذریعے شکایات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ازالے کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے آبادی کے محروم طبقات تشدد کی تحریک چلانے کے لیے نسلی، علاقائی اور لسانی شناختوں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ تشدد پسندی پاکستان کی سیاست میں دوسرے اثرات تو پیدا کرتی ہے لیکن اس سے خواص کے اس انتظامی اور سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جس کے تحت آبادی کے ایک بڑے حصے کو ان فیصلوں میں شریک ہونے سے دور رکھا جاتا ہے جو ان کے سیاسی اور معاشی وجود کو متاثر کرتے ہیں۔

آمرانہ حکومتوں اور کمزور جمہوریتوں نے مذہب، قومیت یا کسی مخصوص معاشی اور سیاسی نظام پر مبنی نظریات مسلط کرنے کے لیے نعروں کا سہارا لیا۔ ان نظریات کو ٹھونسنے کا جمہوری ترقی پر اثر اکثر منفی ہوتا ہے۔ ان سے حقوق بھی متاثر ہوتے ہیں کیونکہ حقوق کے دعوے کو بھی قومی نظریے کی بنیاد پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ کسی نظریے سے اختلاف کو بنیادی انسانی حقوق یعنی آزادیٔ فکر، اظہار مذہبی آزادی اور بنیادی آزادیوں سے محروم کر دینے کے جواز کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اس دوہرے بحران کی وجہ سے، یعنی ایک عوام کے لیے شناخت کا بحران اور ریاست کے قانونی جواز کا بحران، حکمراں خواص نے قومیت اور مذہب کے نظریات کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔ اگر چہ نظریہ پاکستان خود غیر واضح اور مبہم ہے لیکن ایسے قوانین بنائے گئے جن کے تحت اس نظریے سے اختلاف لائق تعزیر ہے۔ یہ عقیدہ کہ پاکستان کی بنیاد اسلام کے نام پر رکھی گئی تھی اور اسے ایک اسلامی ریاست منانا مقصود تھا، اس نظریے کی محض ایک تہہ ہے۔ تاریخ اور واقعات کی اگر دوسری توضیح کی جائے تو قانون کے تحت سزا دی جاسکتی ہے۔ ''نظریہ پاکستان'' کو اقتدار کے آلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام بطور واحد، جائز اجتماعی شناخت، مسلم قومیت کا دو قومی نظریہ اور فوج کا احترام یہ سب اسی نظریے کے اجزا کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں، جنہیں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ نظریہ پاکستان کے نام پر عدم رواداری کو فروغ دیا جاتا ہے۔ جو تصورات اس نظریے سے مطابقت نہ رکھتے ہوں انہیں غداری اور ملک دشمنی کے نظریات قرار دیا جاتا ہے۔ مذہبی اقلیتوں پر بلا سوچے سمجھے شبہ کیا جاتا ہے کیونکہ اسلام سے ان کی وفاداری پر کبھی اعتماد نہیں کیا جاتا۔

اسلام، ریاست اور معاشرہ

پاکستان ایک مملکت کے طور پر پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے مشترکہ تصور اور نظریے کی بنیاد پر وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس نئی مسلم ریاست کے عوام کے خیالات اس بارے میں جدا جدا تھے کہ پاکستان کیوں وجود میں آیا اور اس کے قیام کا مطلب کیا ہے۔ عائشہ جلال نے پاکستان کے تصور اور حقیقت کے تضاد کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جس تحریک کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا اس کے زیادہ تر نعرے مذہبی اصطلاحات میں لپٹے ہوئے تھے۔ لیکن پاکستان کے بارے میں مروجہ عقلی دلائل کے برعکس اس عمل میں جس کے نتیجے میں ہندوستان تقسیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوا، اسلام کا کردار صرف اتنا رہا کہ اس کے ذریعے محمد علی جناح کی سیکولر قیادت میں مسلم لیگ کی اول تا آخر سیاسی جدوجہد کو پرزور اور معتبر بنایا جائے۔

عائشہ جلال کا استدلال ہے کہ ''دوقومی نظریہ، بنیادی طور پر ایک حکمت عملی تھی جس کا مقصد یہ ثابت کر کے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا تھا کہ مسلمان ایک جداسیاسی کیٹگری ہیں''۔ مذہب کس حد تک مطالبہ پاکستان کی بنیاد تھا؟ کیا اس کے برعکس مسلمانوں کی شناخت بطور پر ایک علیحدہ سیاسی کیٹگری تھی؟ یا پاکستان کی تخلیق برصغیر کے مسلمانوں کے مذہبی جوش وجذبے سے اسلامی ریاست کے لیے ابھرنے والی کسی تحریک کا نتیجہ تھی؟ اسلام نے اس ملک کی قومی یکجہتی کے لیے کیا کردار ادا کیا جس کی 90 فیصد آبادی ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتی ہے؟ پاکستان کے عوام اور ریاست کے ساتھ اسلام کے تعلق کو عیاں کرنے کے لیے یہ سوالات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ پاکستان کے آغاز، اس کے سماجی اور سیاسی ارتقا اور اس کے موجودہ معاشی، سماجی اور سیاسی حقائق کا مطالعہ کرنے کے بعد سوال کے بارے میں عائشہ جلال کی رائے سے اتفاق کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

دو بڑے حقائق اس استدلال کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اول یہ کہ ہندوستان کے تمام بنیاد پرست اسلامی گروہوں نے بشمول جماعت اسلامی علیحدہ وطن کے قیام کی سخت مخالفت کی تھی۔ جناح کو جنہیں پاکستان کے حامی قائداعظم کے نام سے پکارتے تھے یہ مذہبی گروپ کافراعظم قرار دیتے تھے، پاکستان (جس کا مطلب پاک لوگوں کی سرزمین تھا) کافرستان کہا گیا، یہ مخالفت اس پختہ نظریے پر مبنی تھی کہ پاکستان کی علیحدہ ریاست مذہب کے اصولوں کے مطابق نہیں ہوگی اور اس کے قیام کا مقصد محض ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سیاسی اور معاشی فوائد کا حصول ہے۔ جماعت اسلامی کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ دوقومی نظریہ اور اسلامی تصورات باہمی طور پر متصادم ہیں۔ مسلم لیگ کا یہ دعویٰ کہ ہندوستانی مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور ایک علیحدہ وطن کا حق رکھتے ہیں پان اسلام ازم سے متضاد ہونے کی وجہ سے رد کر دیا گیا۔ پان اسلام ازم کے مطابق دنیا بھر کے مسلمان ایک قوم ہیں اور اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس قوم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے یا مختلف علاقوں کے اعتبار سے الگ الگ قومی ریاستوں میں بانٹ دیا جائے۔

دوسری حقیقت دستورساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس کی تقریر میں جناح کا سیکولر پیغام ہے۔ انہوں نے اپنے نصب العین کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔

''آپ کو اپنے مندروں میں جانے کی آزادی ہے۔ آپ کو اپنی مسجدوں میں جانے کی آزادی ہے۔ پاکستان کی اس ریاست میں آپ کسی بھی دوسری عبادت گاہ میں جاسکتے ہیں۔ آپ کا تعلق کسی مذہب، ذات یا عقیدے سے ہے، امور مملکت کو اس سے کوئی سروکار نہیں...... ہم ایسے دور کا آغاز کر رہے ہیں جس میں کوئی امتیاز نہیں ہوگا، مختلف قوموں / برادریوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا۔ ہم سب ایک ہی ریاست کے شہری ہیں۔ برابر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے شہری ہیں۔ اور اب میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ بات آدرش کے طور پر اپنے پیش نظر رکھنی چاہیے اور آپ دیکھیں گے کہ کچھ عرصے بعد ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے...... مذہبی معنوں میں نہیں، کیونکہ وہ تو ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی معنوں میں اس ریاست کے شہری کی حیثیت سے۔''

جناح کی تقریر کا یہ حصہ، جس کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے، ریاست اور شہریوں کے تعلقات کے لیے ایک سیکولر بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اس کے باوجود صرف چھ ماہ بعد انہیں سندھ بار ایسوسی ایشن کو سختی سے یہ مشورہ دینا پڑا کہ وہ صوبائیت کو ترک کریں اور خود کو قربانیاں بلکہ جان تک دینے کے لیے تیار کریں تاکہ پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک عظیم اسلامی ریاست بنایا جا سکے۔ یہ ایک طرف تو اس ابہام کی ایک کلاسیکی مثال ہے جس میں پاکستان کی سیاست لپٹی ہوئی ہے اور جس سے ریاست کی قانونی حیثیت اور جواز کی کمزور بنیاد کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری جانب اس سے قیادت کے عدم تحفظ کا اظہار ہوتا ہے جسے اب اختیارات اور وسائل کی تقسیم کے اہم مسائل کا سامنا تھا۔ یہ مسائل مرکز اور صوبوں کے درمیان کشیدگی کا باعث تھے، بھارت کے ساتھ تنازعات اور تقسیم کی وجہ سے فسادات اور بڑے پیمانے پر لوگوں کے بے گھر ہونے کی وجہ سے شہریوں کی جان و مال کے تحفظ کے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ مرکزی حکومت کی پالیسیوں کے نتیجے میں لسانی اور نسلی اختلافات کو ہوا ملی جس سے قومی یکجہتی پیدا ہونے کے امکانات کو مزید نقصان پہنچا۔ ''پنجابی'' جو پاور اسٹرکچر مثلاً بیوروکریسی اور فوج پر چھائے ہوئے تھے۔ ''مسلم'' شناخت پر زور دیتے تھے جبکہ بنگالیوں، بلوچوں، سندھیوں اور پٹھانوں نے قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی اپنی شناخت از سر نو متعین کی اور اقتدار اور وسائل میں اپنے لیے معقول حصہ طلب کرنے لگے۔ وہ مرکزی حکومت آمرانہ اختیارات کو پنجابیوں کا غلبہ سمجھتے تھے۔ اردو کو قومی زبان قرار دینے جیسی پالیسیوں کے ردعمل میں قومیت کا احساس اور جذبات اور مضبوط ہو گئے۔ بنگالیوں کو خاص طور پر اس سے سب سے زیادہ شکایت تھی کیونکہ وہ عددی اکثریت میں تھے اور اردو سے انہیں کوئی علاقہ نہ تھا۔ بنگالی بھارت کی ایک بڑی زبان تھی اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اردو کو مسلط کر کے پاکستان میں ان کی سیاسی حیثیت کو جان بوجھ کر کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مرحلے پر کئی مشکل حالات سے گریز کے لیے اسلام جواز کے طور پر پیش کیا گیا۔ ایک طرف مرکزی حکومت کی پالیسیاں صوبوں کے درمیان سیاسی قوت اور اقتصادی وسائل کے حوالے سے اختلافات کو ہوا دیتی رہیں جبکہ دوسری جانب بنگالیوں اور سندھیوں کے لیے خاص طور پر سماجی اور ثقافتی حقوق کے اظہار کی گنجائش کم ہوتی چلی گئی۔ مرکزی حکومت قومی سیاست میں علاقائی مفادات کے حقیقی اظہار کو منفی صوبائیت قرار دیتی تھی۔ ان پالیسیوں کی مزاحمت یا ان پر نکتہ چینی کو شرپسندی یا بھارت کے ساتھ گٹھ جوڑ کا نتیجہ قرار دیا جاتا۔ یہ کسان میں عدم رواداری کے کلچر کا آغاز تھا۔

حکومت اور ریاست تو مذہبی اتحاد کی تلقین اور اس بات پر اصرار کر رہی تھیں کہ اسلام متحد کرنے والی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قوت ہے۔ سماج کے اعلیٰ طبقات بھی اسی کورس میں شامل ہو گئے کہ ہر قسم کی سماجی تقسیم کو ختم کرنے والی قوت اسلام ہے۔ ان کے لیے یہ بات زیادہ پرکشش تھی کہ اسلام نجی ملکیت کے حق پر زور دیتا ہے اور اس کے سماجی انصاف کے تصور کی تعریف وسیع تر معنوں میں ہے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے اسلام کو اپنی دولت کے تحفظ اور اس میں اضافے کے لیے استعمال کیا اور پھر اسے محروم طبقات کی توجہ اپنے پاس دولت اور اختیارات کے ارتکاز سے ہٹانے کے لیے کیا۔

اسلام کو ریاست کا نظریہ قرار دینے سے منتشر لوگوں کو بظاہر ایک متحد قوم کی شکل دینے میں مدد ملی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ریاست کو ایک ایسے معاشرے میں غلبہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا جس میں اقتدار کا ڈھانچہ مقامی تھا اور خاصا شکست خوردہ۔ اس سے اس ریاست کو قانونی جواز جو معاشرے میں کوئی جڑیں نہیں رکھتی تھی اور جس کی اتھارٹی کی بنیاد بقائے باہمی کے مشترکہ مفاد کے بجائے ایک انتہائی مرکزی انتظامی ڈھانچہ تھا۔ مسلم لیگ کی حکومت نے اسلام کو سنگین سماجی اور معاشی مسائل سے توجہ ہٹانے کے حربے کے طور پر استعمال کیا۔ اس سے مٹھی بھر مذہبی لیڈروں کو اپنا تسلط قائم کرنے اور اسلام کے کاندھے پر سوار ہو کر اقتدار کی عمارت میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔

وہ مذہبی گروہ جنہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی اب خود کو ریاست کا وفادار شہری ثابت کرنے اور شہری لوئر مڈل کلاس طبقے میں اپنے حمایت کرنے والوں کی ایک بنیاد قائم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ مسلم لیگ نے جب اسلام اور اسلامی نظریے کے نعروں کو استعمال کیا تو انہیں بھی یہ موقع مل گیا کہ وہ ان نعروں سے فائدہ اٹھائیں چنانچہ انہوں نے اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ شروع کر دیا۔ انہوں نے حکمران اعلیٰ طبقے کی طرز بود و باش پر انگلی اٹھانی شروع کی اور لیڈروں پر اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈالنے کے الزامات لگا کر تنقید شروع کر دی۔ یہ حملے کسی حد تک جائز بھی تھے، کیونکہ مسلم لیگ کی قیادت اپنے نقطہ نظر کے لحاظ سے سیکولر تھی اور صرف عوام کے لیے نعرے بازی کی حد تک اسلامی تھی۔ مسلم لیگی قیادت نے اس حملوں کا جواب مذہبی گروہوں پر جوابی حملوں کے ذریعے دینے کا فیصلہ کیا اور ان پر رجعت پسند اور کٹر قدامت پسند ہونے کے الزامات لگائے۔ انہوں نے آرتھوڈوکس اسلام کے مقابلے میں ''ترقی پسند اسلام'' کا نعرہ دیا۔

مذہبی قدامت پرست جوں جوں اپنے نظریات میں انتہا پسند ہوتے گئے اتنا ہی ریاست ان کے مطالبات کے سامنے جھکتی گئی۔ تعلیمی نصاب میں ''اسلامی نظریے'' کو شامل کرنے اور درسی کتابوں میں تاریخ کو اسلامی نقطہ نظر سے پیش کرنے کے لیے مذاکرات شروع کیے گئے۔ اسلام وہ ریفرنس پوائنٹ بن گیا جہاں سے ریاست کو اپنی سوشل پالیسی کا آغاز کرنا تھا۔ حکمران ٹولے اور اسلامی مذہبی گروہوں کا ریفرنس پوائنٹ اب مشترکہ ہو گیا تھا۔ لیکن ہر ایک کے اسلام کی قسم جدا جدا تھی۔ دوسرے لوگ بشمول اسلام کے خود ساختہ اسکالرز بھی اس شور میں شریک ہو گئے اور اپنے مفادات کے مطابق اسلام کی تعبیر پیش کرنے لگے۔ اس بارے میں بڑے پیمانے پر کنفیوژن تھا کہ اسلام کیا ہے اور اسے ریاست میں کیسے نافذ کیا جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سے یہ مطلب اخذ کرنا درست نہیں ہوگا کہ قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں میں بحث کا محور صرف ریاست کی تعمیر میں اسلام کا کردار ہی تھا اور جو لوگ ریاست میں اپنی پوزیشن متعین کرا رہے تھے ان کی توجہ کا مرکز بھی یہی تھا۔ صوبائی خود مختاری، سیاسی اقتدار اور وسائل کی مساویانہ تقسیم اس وقت بھی اہم مسئلے تھے، ان کی وجہ سے بھی ریاست کے خلاف جس کی نمائندگی مرکزی حکومت کر رہی تھی، بداعتمادی اور نفرت میں اضافہ ہوا۔ اتفاق رائے کے اس بحران میں درحقیقت اسلام بھی ایک ایسا مسئلہ بن گیا جس پر کوئی اتفاق رائے نہ تھا۔

مسلم لیگ کی حکومت نے 1949 میں دستور ساز اسمبلی میں ''قرارداد مقاصد'' پیش کی۔ اس قرارداد میں پوری کائنات پر اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا گی۔ اس اقتدار اعلیٰ کو پاکستان کے عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے بروئے کار لائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اور اسے ایک مقدس امانت سمجھ کر، قانون کے سامنے برابری اور مساوی مواقع، فکر، اظہار، مذہب، عقیدے، عبادت اور انجمن سازی کی بنیادیں آزادیوں کی ضمانت دی جائے گی، لیکن قانون اور اخلاق عامہ کی حدود میں رہتے ہوئے قرارداد میں وعدہ کیا گیا کہ اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق، جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی انصاف کے اصولوں کی پاسداری کی جائے گی۔ یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ اقلیتوں کو اپنے عقائد پر عمل کرنے اور اپنے جائز اور قانونی مفادات کے تحفظ کی پوری آزادی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ریاست کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو اس قابل بنائے کہ انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں اپنی زندگیاں قرآن کریم اور سنت کے طے کردہ اصولوں کی روشنی میں اسلامی تعلیمات اور اسلام کے تقاضوں کے مطابق منظم کریں۔

قرارداد مقاصد وسیع معنی الفاظ پر مشتمل تھی اور اس کی کئی طرح سے توضیح کی جا سکتی تھی۔ ہندو ارکان نے اسے جناح کی افتتاحی تقریر سے بڑا انحراف سمجھا اور اسمبلی کے اس سیشن کا بائیکاٹ کیا جس میں مسلم ارکان نے متفقہ طور پر قرارداد مقاصد کی منظوری دی۔ قرارداد کے محرک اور پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان کو خود اس کے مضمرات کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ معلوم نہیں تھا۔ مذہبی قدامت پرستوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان کے نقطہ نظر سے تو ہر چیز، سماجی طرز عمل اور طور طریقوں سے لے کر حکومت کی پالیسیاں تک اس زمرے میں آتی ہیں کہ انہیں ''اسلامی اصولوں'' کے مطابق ہونا چاہیے۔ اسلام کے تحت جمہوریت، آزادی، رواداری، مساوات اور سماجی انصاف وہی تھا جس کی توضیح ان قدامت پرستوں نے کی ہو۔ حکومت کی جانب سے پاکستانی معاشرے کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کے لیے پالیسیوں اور اقدامات کے نفاذ میں ناکامی پر حکومت پر تنقید کی جاتی اور اسے قرارداد مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں ناکامی قرار دیا جاتا اور حکومت کی قانونی حیثیت پر حملہ کرنے کا جواز بنایا جاتا۔ قدامت پرستوں نے اور زور و شور کے ساتھ یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ ریاستی نظام کے تمام سماجی اور سیاسی اصول اسلام میں موجود ہیں۔ حکومت اس دعوے سے انکار نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس نے (قرارداد مقاد کی شکل میں) اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بات پر قومی اتفاق رائے کا اعلان کی اہوا تھا کہ پاکستانی معاشرے کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔تاہم حکمران خواص، خصوصاً سول اور فوجی بیوروکریسی، اب تک مذہبی انتہا پسندی اختیار کرنے اور مذہبی کٹرپن کو قانونی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

مذہبی گروہوں کو اسلام کے بارے میں اپنے تصورات کے حوالے سے عوام کی حمایت حاصل نہیں تھی اور ان کی سیاسی بنیاد بہت تنگ تھی۔عوام کی حمایت سے ان کی محرومی کا اظہار 1951 کے صوبائی انتخابات میں ہوا جو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوئے اور تقسیم ملک کے بعد رائے عامہ کا پہلا اظہار تھے۔پنجاب میں ایک بنیاد پرست جماعت، جماعت اسلامی نے 53 امیدوار کھڑے کیے جو ایک کے سوا سب کے سب ہار گئے۔دوسری بنیاد پرست جماعتوں کو بھی کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔خواتین میں ان کی عدم مقبولیت کا اندازہ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے اجلاس سے ممکن ہے جو اپریل 1951 میں انتخابی نتائج کا جائزہ لینے کے لیے منعقد ہوا تھا۔مجلس شوریٰ نے یہ بات نوٹ کی کہ خواتین کا حق رائے دہی استعمال کرنا ان کے لیے مردوں کے مقابلے میں زیادہ باعث پریشانی تھا لہٰذا وہ دستوری سکیم میں جو ان دنوں زیر بحث تھی اپنے مطالبات شامل کرانے کے لیے کوئی عوامی تحریک چلانے کی غرض سے عوام کو آمادہ کرنے میں ناکام رہی۔

بااثر حیثیت کے حامل افراد کے خیالات اور نظریات کا اندازہ 1955 میں عائلی قوانین کا جائزہ لینے اور انہیں سماجی حقائق کے مطابق بنانے کے لیے قائم کیے جانے والے کمیشن کی رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔یہ رپورٹ 1956 میں پیش کی گئی اور اس میں مسلمانوں کی سماجی ترقی کا جائزہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا۔

مسلمانوں کی ہمہ گیر پسماندگی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمان عوام بدلتے ہوئے حقائق اور ان نئے عوامل کی شمولیت کی اہمیت کو سمجھنے میں ناکام رہے جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھے۔آجر کا مزدوروں کے ساتھ، جاگیردار کا ہاری کے ساتھ، سرمائے کا محنت کش کے ساتھ اور مرد کا عورت کے ساتھ رویہ اس طرح تبدیل ہوا ہے اور ہو رہا ہے کہ اب اسے پہچانا بھی نہیں جا سکتا۔ان تبدیلیوں کے لیے ایک جدید زاویہ نظر کی ضرورت ہے، ایک نئے ضابطہ کردار اور زندگی کے ہر شعبے کے لیے نئی قانون سازی اور قانونی اور عدالتی نظام کو از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔جب دنیا تیزی سے ترقی کر رہی ہو تو کوئی بھی قوم خاموش تماشائی بن کر ایک کنارے پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔کوئی بھی قوم خواہ چھوٹی ہو یا بڑی الگ تھلگ رہ کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔موجودہ دور میں ہر قوم کو یا تو اپنی کشتی پوری مہارت اور پختگی کے ساتھ اپنی مقررہ منزل کی جانب لے جانا ہوگا، یا پھر خود کو بہاؤ کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا پڑے گا اور تیزی سے بڑھتے ہوئے طوفان میں گھر جانا اس کا مقدر بن جائے گا۔

نظریاتی مسائل، ریاستی ڈھانچے میں مذہب کا کردار، شہریت، مساوات اور نمائندگی سے متعلق متضاد نظریات نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی جس میں اتفاق رائے پیدا کرنا مشکل ہو گیا۔قائد کی وفات کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعد مسلم لیگ کی حکومت داخلی آویزشوں کی وجہ سے کمزور ہونا شروع ہوگئی اور قیادت کا بحران بڑھنے لگا، ان عوامل نے مل کر آئین کی تشکیل میں بھی تاخیر پیدا کی۔ پاکستان کا پہلا آئین، آزادی کے تقریباً نو سال بعد 23 مارچ 1956 کو نافذ ہوا، قرارداد مقاصد آئین کا پیش لفظ بنی، اگرچہ اسلام کو سرکاری مذہب نہیں قرار دیا گیا تاہم یہ اہتمام ضرور کیا گیا کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نافذ نہیں کیا جائے گا اور موجودہ قوانین کو ان اصولوں کے مطابق بنایا جائے گا۔ صدر کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اسلامی تحقیق اور اعلیٰ اسلامی تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کریں تاکہ اس سے صحیح اسلامی خطوط پر ایک مسلم معاشرے کی تعمیر نو میں مدد مل سکے۔ یہ اسلام کی خدمت کے لیے محض زبانی جمع خرچ تھا کیونکہ دو سال کی مدت کے دوران جب تک یہ آئین نافذ رہا ان دفعات پر عملدر آمد کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

آئین کے نفاذ سے وہ اختلافات ختم نہیں ہوئے جو ریاستی ڈھانچے کو گھیرے ہوئے تھے، ان میں سب سے زیادہ متنازعہ مسئلہ مخلوط انتخاب کا اصول تھا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر مذہبی اور صوبائی سطحوں پر اختلاف تھا۔ مذہبی پارٹیاں اور مغربی پاکستان کی بڑی سیاسی قوتیں جداگانہ انتخابات کی حامی تھیں۔ مشرقی پاکستان کی اکثریتی رائے عامہ مخلوط انتخاب کی پرزور حامی تھی۔ مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت اور اسلامی جماعتیں ہر اس شخص کو غدار قرار دیتیں جو مخلوط انتخاب کی حمایت کرتا تھا، انہوں نے مشرقی پاکستان کی ہندو اقلیتوں پر الزام لگایا کہ وہ اس طرز نیابت کی حمایت اس لیے کر رہی ہیں کہ وہ اس مسئلے پر مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا سکیں۔ حکمران اسے دو قومی نظریے کی نفی سمجھ کر اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ اس اعتراض پر حسین شہید سہروردی کے تبصرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو قومی نظریے پر ملک کے دونوں حصوں کے نظریات میں کتنا اختلاف تھا۔ قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے مخلوط انتخابات کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

مسلمانوں نے دو قومی نظریہ ہندوستان کی تقسیم اور جغرافیائی اعتبار سے ملحق ایسے یونٹس پر مشتمل ریاست کے قیام کے لیے پیش کیا تھا جہاں وہ عددی طور پر اکثریت میں تھے۔ اب جبکہ یہ ریاست وجود میں آگئی ہے تو دو قومی نظریہ مسلمانوں کے لیے بھی اب قوت سے محروم ہو گیا ہے۔ آج ہم یہ نہیں چاہتے کہ ملک میں علیحدگی پسندی کے رجحانات کو فروغ ملے، بلکہ ہم ایک قوم کی تشکیل چاہتے ہیں۔ لہٰذا میں مخلوط انتخاب کی پرزور وکالت کروں گا کیونکہ اس سے مختلف مذہبوں کو ماننے والے شہریوں کے درمیان شکوک وشبہات، بے اعتمادی اور نفرت کے بیجوں کو تباہ کرنے میں مدد ملے گی۔

صدر مرزا نے 1958 میں آئین کو منسوخ کر دیا۔ ایوب خان کے سرگرم تعاون سے انہوں نے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا جس کی وجہ سے یکجہتی کا بحران اور سنگین ہو گیا۔

قانونی جواز کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے والی ایک کنفیوزڈ اور نااہل حکومت کی جگہ جبر پر قائم ایک ایسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقتدرہ نے لے لی جو ایک خود ساختہ جمہوریت کے فارمولے کو اوپر سے مسلط کرنا چاہتی تھی۔ چونکہ سول اور فوجی بیورو کریسی روایتی طور پر مذہبی جماعتوں کو قریب نہیں آنے دیتی تھیں، مارشل لا سے قبل انتظامیہ نے بڑی مذہبی جماعتوں کے ساتھ فاصلہ برقرار رکھا۔ لیکن اب فوجی حکومت اس قابل نہیں تھی کہ مذہبی جماعتوں کی اس اہمیت کو کم کر سکے جو انہوں نے حاصل کر لی تھی۔ اس کے ذمہ دار دو بڑے عوامل تھے۔

اول یہ کہ فوجی حکومت بھی سابق حکمران ٹولے کی طرح ''ماڈرن اسلام'' کو مشرقی پاکستان، سندھ اور بلوچستان کی اختلافی آوازوں کو دبانے کے لیے استعمال کرتی رہی۔ ایوب خان نے مئی 1959 میں اپنی تقریر میں اپنے اسلامی فلسفے کی اس طرح وضاحت کی:

جب زندگی اور مذہب کے درمیان رشتہ کٹ جاتا ہے تو زندگی کسی نہ کسی سمت میں جاری رہتی ہے، لیکن مذہب ایسی بے جان شے بن جاتا ہے جس میں نہ لچک اور نہ ترقی کی صلاحیت باقی رہتی ہے اور یہ مسجدوں اور خانقاہوں کی حدود میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے جبکہ انسانیت نے سائنس اور فلسفے میں زبردست ترقی کر لی ہے، مذہب صدیوں سے جامد رہا ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے بت پرستی کا خاتمہ کر دیا اور مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے مذہب کو ایک بت کی شکل دے دی ہے۔

اسلام کے بارے میں اس جدید سوچ سے مذہبی انتہا پسندی کی مخالفت جھلکتی ہے، لیکن ریاست اپنی پالیسی کے اعلانات کے باوجود اسلامی اصطلاحات استعمال کرتی رہی۔ اس وجہ سے اسلامی مذہبی گروہوں کو مسلم لیگ کی عطا کردہ مراعات کی بنیاد پر اپنے قدم جمائے رکھنے کا موقع مل گیا۔ جماعت اسلامی نے ایوب خان کی حکومت پر اسے غیر اسلامی اور کسی حد تک جائز طور پر غیر جمہوری قرار دے کر زبردست تنقید کی۔ ایوب خان نے بھی سب سے زیادہ بلند آہنگ مذہبی گروپوں کو کچلنے کے لیے جابرانہ اقدامات کیے اور ان کی صفوں میں شہیدوں کا اضافہ کیا۔ جون 1962 میں ایوب خان نے ایک نیا آئین دیا۔ اس آئین کے نفاذ کے وقت ریاست کے نام کے ساتھ ''اسلامی'' کا لفظ شامل نہیں تھا۔ اگرچہ صدر ایوب نے اسلامی آئیڈیالوجی کے بارے میں ایک مشاورتی کونسل اور ایک اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کیا لیکن ان میں وہی علما شامل کیے گئے جو ان کی لائی ہوئی اصلاحات کی حمایت کرتے تھے۔

دوسرا سبب سیاسی جماعتوں اور ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگانا تھا۔ سیاسی جبر، بنیادی حقوق اور آزادیوں سے انکار اور سول اور فوجی بیورو کریسی کے اختیارات میں بے تحاشہ اضافہ ایوب دور کی خصوصیات تھیں۔ بعد میں کی جانے والی ایک ترمیم سے قبل آئین میں بنیادی حقوق کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ البتہ ان کا ذکر صرف پالیسی کے اصولوں اور قانون سازی کے اصول کے طور پر کیا گیا تھا جو کہ ناجائز تھا۔ ابتدا میں سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی تاہم بعد میں انہیں محدود سرگرمیوں کی اجازت مل گئی۔ سیاسی عمل پر بہت دباؤ تھا اور اسے کنٹرول میں رکھا گیا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاسی قوتیں کمزور اور منتشر رہیں، دوسری جانب بنیاد پرست گروہوں نے خود کو مذہبی اداروں کی حفاظت میں منظم کیا اور ان اداروں کی آڑ میں اپنا سیاسی اور نظریاتی پروپیگنڈہ جاری رکھا۔ تقریر اور اجتماع کی آزادی کو اتنی سختی سے مسدود کر دیا گیا تھا کہ سیاسی بے چینی اور عدم اطمینان کا اظہار صرف مساجد سے مذہبی پروپیگنڈے کے ایک حصے کے طور پر ہوتا تھا، لہٰذا مساجد اختلاف کا مرکز بن گئیں اور سیاسی معاملات اس دور میں مذہب کے ساتھ اور زیادہ گڈمڈ ہو گئے۔

ایوب دور کے آخری برسوں کی ایک خاص بات مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی کا ظہور تھا جس کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں اقتصادی اور سیاسی محرومیوں کے سبب بے چینی تلخی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس تلخی نے بنگالی قومیت پرستی اور ریاست پر پنجابی بالادستی کے خلاف نفرت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ملک کے دونوں حصوں میں ایوب حکومت کے خلاف تحریک شروع ہو گئی، بڑھتی ہوئی بے چینی کے پیش نظر مارچ 1969 میں ایوب خان دستبردار ہو گئے اور زمام اقتدار آرمی کمانڈر جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے سپرد کر گئے۔

اگرچہ احتجاجی تحریک کو مذہبی جماعتوں کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور وہ اس میں سرگرمی سے حصہ لے رہی تھیں، لیکن بنیادی طور پر یہ تحریک سیاسی جبر کے خلاف تھی۔ اس کا واضح اظہار عوام نے مارشل لا کے تحت ہونے والے 1970 کے انتخابات میں کر دیا۔ ان انتخابات کو عام طور پر آزادانہ اور منصفانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ انتخابات میں دو پارٹیاں ابھر کر آئیں، مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ، دونوں پارٹیوں نے سیاسی اور معاشی مسائل کی بنیاد پر الیکشن لڑا تھا۔ تمام مذہبی پارٹیاں مل کر بھی قومی اسمبلی کی صرف 5.75 فیصد نشستیں حاصل کر پائیں۔ جماعت اسلامی کو محض ایک فیصد حصہ ملا۔

بھٹو نے اسلامی سوشلزم کے نعرے پر الیکشن لڑا، پیپلز پارٹی کے منشور میں اعلان کیا گیا تھا کہ 'اسلام ہمارا دین اور جمہوریت ہماری سیاست ہے۔' علما نے اس کی پرزور مخالفت کی، ان میں سے کئی نے تو فتوے جاری کیے کہ سوشلزم کفر ہے اور جس نے اس کا پرچار یا حمایت کی یا اس کے حق میں ووٹ دیا وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔ اس کے باوجود بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں زبردست کامیابی حاصل کی اور 56 فیصد نشستیں جیت لیں۔ یہ واحد الیکشن تھا جس میں اسلامی ریاست کے لیے روایتی اور بنیاد پرستی کے پروگراموں کا مقابلہ اسلامی سوشلزم سے تھا اور یہ پروگرام ایک ایسی پارٹی کی طرف سے پیش کیا گیا تھا جسے علما نے تقریباً متفقہ طور پر اسلام دشمن قرار دے دیا تھا۔

اپنی قطعی اکثریت (قومی اسمبلی کی 51 فیصد نشستیں) کے باوجود عوامی لیگ کو حکومت بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ پنجابی اکثریت والی فوج اور نوکر شاہی اس بات کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی کہ وہ اس اقتدار سے محروم ہو جائے جس پر اس نے طویل عرصے سے اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ مشرقی پاکستان میں عوامی تحریک کے خلاف فوجی آپریشن شروع کیا گیا۔ مغربی پاکستان کی فوج اور سیاستدانوں کے غیر مفاہمانہ رویے نے اپوزیشن کو قومیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پرست سے علیحدگی پسند بنا دیا۔ مغربی حصے کے سخت رویے کو کئی سیاسی مورخ بھٹو کے اثر ورسوخ اور ہتھکنڈوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا مفاد یقیناً اسی میں تھا کہ انہیں ملک کے اس حصے میں اقتدار مل جائے جہاں ان کی واضح اکثریت تھی، بجائے اس کے کہ وہ پارلیمنٹ میں ایک بڑی اپوزیشن کی قیادت کریں۔ جو بھی ہوا ہو، بہر حال حقیقت یہی ہے کہ پاک بھارت جنگ میں شکست کے بعد بنگلہ دیش وجود میں آیا اور دسمبر 1971 میں بھٹو نے مغربی پاکستان میں اقتدار سنبھال لیا۔

سیاسی طور پر بھٹو اقتدار میں آنے کے بعد اتنے جمہوری اور لبرل ثابت نہیں ہوئے جتنے وہ 1970 کی انتخابی مہم کے دوران نظر آتے تھے۔ اگر چہ نیا آئین جو 1973 میں نافذ ہوا، تمام اہم سیاسی قوتوں کے اتفاق رائے سے منظور ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود قومی یکجہتی پیدا نہ ہو سکی۔ اس آئین کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ یہ اعلان 1956 اور 1962 کے دساتیر میں نہیں کیا گیا تھا۔ بھٹو کی مرکزیت پسند حکمرانی کے سبب سرحد اور بلوچستان کی سیاسی قوتوں کی اکثریت بیزار ہو گئی۔ سندھ کی اردو بولنے والی آبادی میں نسلی بے چینی ایک سیاسی قوت کی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ بھٹو کی پالیسیوں میں دیہی سندھ کی ترقی اور سندھیوں کو سول بیورو کریسی میں شامل کرنے کے سلسلے میں ایک واضح جھکاؤ تھا۔ بھٹو خود سندھی تھے اور یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ دیہی سندھ کی آبادی خود کو ہمیشہ اقتدار کے ڈھانچے سے باہر سمجھتی تھی، فوج اور بیورو کریسی میں عملاً ان کی کوئی نمائندگی نہیں تھی۔ شہری سندھ کی اردو بولنے والی آبادی کے مقابلے میں دیہی عوام زیادہ پسماندہ تھے۔ بھٹو کے دور حکومت میں اردو بولنے والی آبادی کو اپنی مراعات اور استحقاق میں کمی کا سامنا کرنا پڑا جسے نسلی امتیاز سمجھا گیا۔ پنجاب میں بھی بے اطمینانی کی لہریں اٹھیں جو کہ اب تک اقتدار پر غالب تھا۔

بھٹو کے دور حکومت میں بھی عمومی آمرانہ رویہ کسی حد تک برقرار رہا۔ سیاسی مخالفین اور صحافیوں کو ہراساں اور ذلیل کیا گیا، سیاسی کارکنوں پر بڑے پیمانے پر تشدد کیا گیا۔ اقتصادی طور پر سماجی اصلاحات سے کسانوں اور بے زمین ہاریوں کی حالت میں تبدیلی نہیں آئی اور بڑے جاگیرداروں کے ہاتھوں ان کی غلامی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مختلف نسلی اور صوبائی مفادات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکامی پر بھٹو نے بھی اسلامی نعروں کا سہارا لینا شروع کر دیا۔ وہ پاکستان کی معیشت کو عربوں کی تیل کی دولت کے ذریعے توسیع دینے کے لیے عرب ممالک سے بھی مضبوط تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس مرحلے پر کچھ اسلامی پارٹیوں نے مساوات اور سماجی انصاف کو اسلام کا ایک اہم جزو قرار دے کر اس پر زور دینا شروع کیا لیکن ان کی سوشلزم کے 'بدیشی' نظریے کی مخالفت برقرار رہی۔ بھٹو کی مقبولیت کا سبب ان کے معاشی اصلاحات اور سماجی تبدیلیوں کے نعرے تھے لہٰذا اب اسلامی پارٹیوں نے مذہبی عقائد کے بجائے اسلام کے سماجی انصاف کے نعرے کے ذریعے بھٹو کا قد کم کرنے کی کوشش کی۔ بھٹو نے 1974 میں ہی علما کے دباؤ کے سامنے کمزوری کا مظاہرہ کر دیا تھا، جب انہوں نے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صدر اور وزیر اعظم کے عہدوں کے حلف کے الفاظ میں ترمیم کرنے سے اتفاق کیا جس کے ذریعے انہیں بطور خاص اس امر کا اعلان کرنا ہوتا ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ بھٹو مذہبی گروپوں سے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ فوج پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور مذہبی جوش جذبے کو فوج ان کی گرتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر استعمال کر سکتی تھی۔ 1977 میں بڑے پیمانے پر اپوزیشن اور ہنگامہ آرائی اور تشدد کا سامنا کرنے کے بعد وہ سمجھنے لگے کہ وہ علما کو مراعات دے کر اپنی حکومت بچا لیں گے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ شریعت لا چھ ماہ میں نافذ کر دیا جائے گا۔ انہوں نے شراب، جوئے اور نائٹ کلبوں پر فوری پابندی عائد کر دی اور ہفتہ وار چھٹی اتوار کے بجائے جمعہ کو کرنے کا اعلان کیا۔ اگر چہ اس ایجی ٹیشن میں جس کے نتیجے میں 1977 میں بھٹو کی حکومت معزول ہوئی اسلامی پارٹیوں کا ایک نمایاں کردار تھا، لیکن اس بات کی بہت کم شہادت ملتی ہے کہ بھٹو کی بڑھتی ہوئی غیر مقبولیت کا مذہب سے کوئی تعلق تھا۔ 5 جولائی کو آرمی چیف آف سٹاف ضیا الحق نے عین اس وقت اقتدار سنبھال لیا جب بھٹو دوسری سیاسی قوتوں سے سمجھوتہ کرنے والے تھے۔ اس طرح مارشل لا کے ایک اور دور کا آغاز ہوا۔ ضیا الحق نے جس دن اقتدار سنبھالا اور قوم سے خطاب کیا اسی دن انہوں نے اپنی پالیسی کا رخ متعین کر دیا۔ انہوں نے اس اسلامی جذبے کی تعریف کی جس نے اپوزیشن کی تحریک کو ولولہ دیا اور کہا کہ ''اس سے ثابت ہو گیا کہ پاکستان جو اسلام کے نام پر وجود میں لایا گیا تھا، صرف اسلام سے وابستگی کے ذریعے ہی اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے۔ اسی لیے میں اسلامی نظام کے نفاذ کو اس ملک کی بنیادی ضرورت سمجھتا ہوں۔'' ضیا نے فوج کے ہاتھوں میں ریاستی قوت کو قانونی جواز دینے کے لیے اسلامی نظریے کو استعمال کیا۔ ان کے گیارہ سالہ دور حکومت میں مذہب اور فوجی حکومت کا باہمی رشتہ پاکستان میں جمہوریت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا۔

اپریل 1977 میں بھٹو کے خلاف پاکستان نیشنل الائنس کی تحریک میں بنیاد پرست پارٹیاں اس کا ایک چھوٹا مگر اہم جزو تھیں۔ پی این اے نے مساجد کو بڑے پیمانے پر مؤثر طور پر استعمال کیا۔ اگر چہ وہ تعداد میں کم تھے اور انہیں بڑے پیمانے پر عوام کی حمایت بھی حاصل نہیں تھی تاہم مذہبی گروپوں کو اپنے حلیفوں پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ وہ حکومت کا تختہ الٹنے کی مشترکہ کوششوں میں استعمال ہونے کے ساتھ دوسروں کو بھی استعمال کر سکتے تھے، ظاہر ہے کہ بھٹو حکومت کو مذہبی عناصر کو مطمئن کرنے اور عالم اسلام سے حمایت حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس تھا، جیسا کہ آخری لمحات کی کوششوں کے طور پر ان کے اسلامائزیشن کے اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کوشش اگر چہ ان کی حکومت کو بچانے میں ناکام ثابت ہوئی، لیکن اس سے اس تصور کو تقویت ملی کہ بنیاد پرستی اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ وہ کسی بھی حکومت کو ہلا سکتی ہے اور یہ تھیوکریسی کی جانب ایک اور قدم آگے تھا۔ مارشل لا حکومت نے، جس نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹا، نہ صرف اس عمل کو جاری رکھا بلکہ اسلامائزیشن کو اپنا خصوصی حق بنا لیا۔ مذہب کو اپنے برسر اقتدار رہنے کے مینڈیٹ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اس حکومت نے مذہبی پارٹیوں کو اپنے ساتھ اشتراک کے مواقع فراہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیے، اوران کے اثر ورسوخ میں ایسا اضافہ کیا، جس کا اس سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، ملک پر زیادہ تر ایسے قوانین کے تحت حکومت کی جاتی رہی جو فوجی حکومت اور ایسے قدامات پرست اور بنیاد پرست عناصر کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھے جنھیں عوام کی بہت کم حمایت حاصل تھی۔ ضیا کو اگر چہ بہت کم عوامی تائید حاصل تھی لیکن ان کی ملٹرائزیشن اور اسلامائزیشن کی پالیسیوں نے ریاستی اداروں اور جمہوریت اور انسانی حقوق کے بارے میں ان کے رویوں پر گہرے اثرات چھوڑے۔ ملٹرائزیشن نے پہلے ہی کمزور سول سوسائٹی کو نقصان پہنچایا جبکہ اسلامی بنیاد پرستی سے رواداری اور مکالمے کی گنجائش مزید کم ہوگئی۔ فوجی عدالتوں نے صحافیوں، سیاسی کارکنوں، ٹریڈ یونین کارکنوں اور ان دوسرے لوگوں کو سخت سزائیں دیں جنھوں نے فوجی حکومت کے قانونی اور اخلاقی جواز کو چیلنج کیا۔ سندھ اور کہیں کہیں بلوچستان میں مسلح مزاحمت بڑھنے لگی جسے فوجی طاقت سے کچل دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی قوانین کے تحت سزائیں دی جانے لگیں، عوام خوفزدہ ہو گئے اور اختلاف کرنے والوں کی زبان بندی ہوگئی۔

ضیا کی اسلامائزیشن کا سب سے بڑا نشانہ خواتین اور مذہبی اقلیتیں تھیں۔ امتیازی سلوک کو ایسے قوانین کے ذریعے قانونی حیثیت دے دی گئی جن کی وجہ سے خواتین اور مذہبی اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری بنا دیا گیا۔ توہین رسالت کے قانون کو غیر مسلموں اور اقلیتی فرقوں کے خلاف تادیبی کارروائی کے لیے استعمال کیا گیا۔ اگر چہ ضیا کو نفاذ اسلام کے سلسلے میں علامتی اقدامات سے آگے جانا پڑا لیکن وہ طاقتور حلقوں کے مفادات میں مداخلت نہ کر سکے، لہٰذا ان کی اسلامائزیشن بڑی چنیدہ رہی اور اس سے صرف معاشرے کے کمزور طبقات ہی متاثر ہوئے۔ صنعت کاروں، جاگیرداروں اور تاجر برادریوں کے معاشی مفادات کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ حکومت مذہبی پارٹیوں اور ان کے اداروں کی دل کھول کر سرپرستی کرتی رہی۔ اس دور میں یہ گروہ نہ صرف حکومت کے سول اداروں بلکہ فوج میں بھی در آئے۔ اس سے حکومتی اداروں میں جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے حمایت بُری طرح متاثر ہوئی۔ ذرائع ابلاغ کو پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہی حال تعلیمی پالیسی کا تھا۔ اسلام کی اس توضیح پر زور تھا جو حکومت کی سرپرستی میں قدامت پسند کر رہے تھے جس کی وجہ سے نہ صرف غیر مسلموں میں عدم تحفظ پیدا ہوا، بلکہ فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد اتنا بڑھ گیا کہ پاکستان میں اس کی مثال پہلے کبھی نہیں ملتی۔ مذہب اب چونکہ اقتدار کی بنیاد بن گیا تھا مختلف فرقوں اور مکاتب فکر نے اقتدار میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی، ماضی میں ریاست نے جو جدید اسلام اختیار کیا تھا، اس میں اور مذہبی جماعتوں کے کٹر اسلام میں فرق ختم کر دیا گیا۔ ریاست نے اسلام کا کٹر اور بنیاد پرست نظریہ اختیار کر لیا۔

اسلامائزیشن پر عوامی ردعمل

اگر چہ پاکستانی معاشرہ بھاری اکثریت سے مسلمانوں پر مشتمل ہے لیکن اس معاشرے میں وہ ثقافتیں بھی رچی بسی ہیں جو برصغیر میں اسلام کی آمد سے قبل یہاں موجود تھیں۔ اسلام نے مختلف علاقائی ثقافتوں کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خدوخال میں تبدیلیاں ضرور کیں، لیکن وہ ان میں سے کسی کو بھی مکمل طور پر جذب نہیں کر سکا۔ برصغیر کے ان حصوں میں جن پر اب پاکستان مشتمل ہے، اسلام کی جس شکل نے جڑ پکڑی اس نے اسلام کے آرتھوڈوکس تصور کو چیلنج کیا تھا۔ اس پر ''صوفی ازم'' کا اثر زیادہ تھا۔ اس نے پنجاب، سندھ اور بنگال میں مقامی روایات اور علامتوں کو جن کی اصل اکثر ہندو تھی، برقرار رکھا، یہ بھی درست ہے کہ اسلام اپنے مساوات کے اصولوں کے باوجود پاکستان میں طبقات، ذات پات، قبیلہ اور خاندان سے وابستگیوں کو ختم نہیں کر سکا۔ بلوچستان اور سرحد میں جہاں ہندو برائے نام تھے اسلام نے قبائلی رسوم ورواج کے ساتھ مصالحت کر لی۔

پاکستان کی مسلم آبادی کی ثقافتوں اور روایات کی بوقلمونی، ان کے زبردست معاشی، لسانی اور سماجی اختلافات کی مانند تھی۔ ان اختلافات کی وجہ سے شہری اور دیہی علاقوں کے مذہبی رسوم ورواج میں بھی فرق تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب کی بنیاد پر قومی یکجہتی کے جذبات پیدا کرنا بھی کوئی ٹھوس تجویز نہیں تھی۔ لہٰذا ایسا لگتا ہے کہ نظریاتی بحث صرف ریاستی حکام، بالادست طبقات اور مذہبی آرتھوڈوکسی تک محدود تھی جبکہ آبادی کی اکثریت کے نزدیک اس بحث کا ان کی سماجی اور معاشی ضروریات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ بات مذہبی پارٹیوں کے لیے عوامی حمایت کے فقدان سے ظاہر ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد 1951 میں پنجاب میں پہلے عام انتخابات سے لے کر 1997 کے حالیہ انتخابات تک کٹر مذہبی جماعتوں کو کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ان کی حمایت پنجاب میں شہری مڈل کلاس، تاجروں، دکانداروں، بعض پیشہ ور اور طلبہ کے گروہوں اور سندھ میں اردو بولنے والی آبادی، جو زیادہ تر کراچی میں ہے، تک محدود تھی۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں البتہ کچھ مذہبی گروہوں کی کارکردگی نسبتاً بہتر رہی، جس کی بنیاد اسلام کی عوامی تشریح ہے جس میں مساوات کے عقیدے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مذہبی گروپوں کی پرزور مخالفت کے باوجود پاکستان کے عوام نے دومرتبہ ایک خاتون کو وزیر اعظم منتخب کیا۔ یہ مزید اس بات کا ثبوت ہے کہ ان جماعتوں کا عوام پر کوئی اثر ورسوخ نہیں ہے۔

ضیا نے پنجاب کی قدامت پسند اور بنیاد پرست سیاسی پارٹیوں اور خاص طور پر جماعت اسلامی کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا۔ مارشل لا کے گیارہ سالہ دور حکومت میں انہیں فوجی حکومت کی بھرپور سرپرستی ملی۔ اسی دور میں وہ اہم اداروں میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ریاستی اقتدار کے ڈھانچے میں اپنے اثر ورسوخ کو بروئے کار لا کر حکومت سے بیزار عوام پر اپنے نظریات مسلط کرنے کی کوشش کی۔ ان کی تنظیمی صلاحیتیں، عوام کو کھینچ لانے کی صلاحیت سے زیادہ تھیں۔ وہ اندرونی اور بیرونی ذرائع سے بھاری مقدار میں فنڈز حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ یہ فنڈز یا تو کمیونزم کی مخالفت کے نام پر یا مبہم جو اسلامی فرقہ پرستی کے نام پر حاصل کیے گئے۔ ان کے حامی اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن بہت جنگجو ہیں اور سڑکوں پر ایجی ٹیشن اور تشدد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جس سے نمٹنا انتظامیہ کے لیے ہمیشہ سے ایک مشکل کام رہا ہے۔ جمہوری عمل کے ذریعے اقتدار کے حصول میں ناکامی پر ان کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوریت پر نکتہ چینی کرتے ہیں کہ یہ اسلامی اقدار اور حکمرانی کے تصور کے منافی ہے۔ حال ہی میں بعض انتہا پسند گروپوں نے جن میں جماعت اسلامی بھی شامل تھی، انتخابات ہی کو ٹھکرا دیا اور 13 فروری 1997 کو ہونے والے عام انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔

ریاستی اقتدار کے اداروں میں بنیاد پرست گروہوں کے اثر ورسوخ میں اضافہ، جنگ باز فرقہ پرست دھڑوں کی افزائش، اسلام کے روایتی اور آرتھوڈوکسی نظریات سے اختلاف رکھنے والوں سے عدم رواداری، بنیاد پرست مذہبی پارٹیوں سے الحاق رکھنے والے طلبہ کے مسلح اور جنگجو گروپوں کے ہاتھوں تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کا یرغمال بن جانا، اور سب سے بڑھ کر امتیازی اور جابرانہ قوانین۔ یہ سب ضیا کا ورثہ ہیں جو 1986 میں بحال ہونے والی سول حکومت کے حصے میں آیا۔ ضیا کی حکومت کا گیارہ سال تک برقرار رہنا اسلامی گروہوں کی حمایت کے سبب نہیں تھا۔ ریاستی جبر اور فوجی انتظامیہ کی بھرپور حمایت اس کے بڑے اسباب تھے۔ ضیا نے جاگیرداروں اور کاروباری طبقات کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا جنہیں اس نے 1985 کے بعد اپنی حکومت کو سویلین چہرہ دینے کے لیے نئے سیاسی بندوبست میں استعمال کیا۔

1988 میں جنرل ضیا کی موت کے بعد جمہوریت کی بحالی کے عمل کے سلسلے میں جماعتی بنیاد پر پہلے عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں قدامت پرست پارٹیوں کو بہت کم حمایت ملی۔ تاہم انہیں پارلیمنٹ کے ایوان بالا یعنی سینیٹ میں بالواسطہ الیکشن کے ذریعے علما کے لیے مخصوص نشستوں پر داخل کیا گیا۔ آئین میں یہ ترمیم ضیا نے کی تھی۔ دوسری آئینی ترامیم کے ذریعے نمائندہ اسمبلیوں کے اختیارات کم کر دیے گئے اور صدر کے اختیارات بڑھا دیے گئے اور انہیں اپنی صوابدید پر اسمبلیوں کو توڑنے کا اختیار بھی دے دیا گیا۔ 1988 کے عام انتخابات کے بعد سے اہم سیاسی جماعتیں پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی رہی ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ ضیا کی سرپرستی میں قائم کی گئی اور ابتدامیں وہ ان فوجی اور اسلامی نعروں سے بہت متاثر تھی جو ضیا استعمال کرتے تھے، جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی ضیا کے سیاسی جبر کا سب سے بڑا نشانہ تھی اور سماجی اور اقتصادی اصلاحات کی توقع پر اسے عوام کی حمایت ملی۔ لیکن دونوں میں سے کوئی بھی پارٹی مذہبی جماعتوں کی جانب سے سیاسی عمل میں خلل اندازی کو مؤثر طور پر روکنے میں کامیاب نہ ہو سکی، دونوں نے ان گروہوں کے ریڈیکل مطالبات کے سامنے کمزوری کا مظاہرہ کیا۔

سویلین حکومت ایسے انتظامات کے تحت بحال ہوئی کہ حکومت کے اہم اور کلیدی شعبوں پر فوج کی بالادستی برقرار رہے گی۔ ایسے سیاسی عمل کی پیدائشی کمزوریوں کی وجہ سے سیاسی جماعتوں کو جمہوریت کے استحکام کے لیے کام کرنے کا بہت کم موقع دیا گیا۔ دوسری جانب کرپشن اور سیاسی کشیدگی اور معاشی بحران کے خاتمے میں ان کی ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی حکومتیں اعتماد اور اعتبار سے محروم ہو گئیں۔ اس سے مذہبی گروہوں کو جمہوریت کو اور زیادہ شدت کے ساتھ مطعون کرنے کا موقع مل گیا۔ سیاسی جماعتیں بہت تنگ بنیاد پر استوار کی جاتی رہیں اور ان پر جاگیرداروں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور صنعتکاروں کا غلبہ ہے۔ وہ اپنی حکمرانی کی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے مذہبی نعروں کا سہارا لیتی ہیں۔ اگر چہ "مذہبی نظریئے" پر بحث میں اب وہ شدت نہیں رہی لیکن اب بھی قدامت پرستوں کے دباؤ کے جواب میں سیاسی جماعتیں محض اسلام کے جدید نظریات کے دلائل پیش کرتی ہیں۔

چنانچہ ایسا لگتا ہے کہ یہ بحث اپنا دائرہ مکمل کر چکی ہے۔ لیکن ایک اہم تبدیلی کے ساتھ۔ اس بحث میں اب ایک تیسری جہت کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ جو سیکولر سول آرڈر کی حمایت کی صورت میں ہے۔ اب تک ریاست کی نوعیت، اس کے اداروں اور حقوق کی حیثیت کے بارے میں تمام دلائل اسلامی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے دیے جاتے تھے۔ خواہ وہ لبرل اور پروگریسو اسلام ہو یا انتہا پسندوں کا پیش کردہ کٹر اور سخت اسلامی تصور۔ سیکولر عناصر پاکستان کی سیاست سے مکمل طور پر غیر حاضر کبھی نہیں رہے، لیکن سیکولر پاکستان کے بارے میں کھلی بحث کو ہمیشہ غداری، نظریہ پاکستان کے لیے خطرہ اور اسلام کے لیے خطرہ قرار دیا گیا۔ سیکولر نظام کی حمایت میں دلیل پہلے سوشلزم کے نظریات سے اخذ کی جاتی تھی، اب ایسے استدلال کی بنیاد انسانی حقوق اور جمہوریت کا فروغ ہے، یہ وہ مقصد ہے جو مذہبی ہنگامہ آرائی کے ماحول میں حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر چہ کسی طور پر بھی یہ مؤقف زیادہ مقبول نہیں ہے لیکن اس کے حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اس مؤقف کو مختلف ڈسپلن کے لوگوں نے اختیار کیا ہے، اس مؤقف کے اظہار کی گنجائش پیدا ہوئی ہے۔ حسب توقع اس موقف کے حامیوں پر سب سے سخت حملہ مذہبی گروہوں اور فوجی انتظامیہ کی جانب سے ہوا ہے۔

اگر چہ یہ بحث جاری ہے، قومی یکجہتی اور نظام حکومت کے اہم مسائل بدستور حل طلب ہیں۔ عوام کی اکثریت کے فوری اور اہم مسائل، غربت، سماجی ناانصافی اور معاشی عدم مساوات کے خاتمے پر اب بھی کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ مملکت کی پچاسویں سالگرہ قوم اس مایوسی کے ساتھ منا رہی ہے کہ ریاستی ادارے شاید ہی کبھی ان کی بنیادی ضروریات کو پورا کر سکیں یا انہیں سماجی اور سیاسی تعصب سے بالاتر ہو کر آزادانہ طور پر انصاف مل سکے۔ مایوسی اور ناامیدی کے اس ماحول میں مذہبی انتہا پسندوں کو مسائل کو اپنے فائدے کے لیے اچھالنے اور معاشرے کے کمزور طبقات خصوصاً نوجوانوں میں مذہبی جذبات ابھارنے کا سنہری موقع مل گیا ہے۔

نتائج اور سفارشات

جمہوری ترقی:

پاکستان میں جمہوری نظام بہت نازک اور دباؤ تلے ہے۔ انتخابات کے ذریعے اسے جو قانونی جواز ملا ہے وہ محض برائے نام ہے، اس سے عوام میں شراکت کا احساس پیدا نہیں ہوا۔ اختیارات میں عدم توازن اور سماجی اور سیاسی زندگی کی مختلف سطحوں پر عدم مساوات برقرار ہے جس کی وجہ سے مواقع کی دستیابی بھی غیر مساوی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فوجی آمریت کے طویل ادوار کی وجہ سے جمہوری عمل محدود ہے۔ پارلیمانی جمہوریت کو بدستور ان آئینی پابندیوں سے خطرہ ہے جو اقتدار میں فوجی اسٹیبلشمنٹ کا حصہ برقرار رکھنے کے لیے اس پر مسلط کی گئیں۔ تاہم پارلیمنٹ کی جانب سے اپنی بالادستی برقرار رکھنے کی حالیہ کوششیں حوصلہ افزا ہیں۔

پاکستان کی جمہوری ترقی کے لیے قومی یکجہتی کے مسائل بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وفاقی نظام حکومت اسی صورت میں کامیاب ہوسکتا ہے جب اس کی تکمیل صوبائی خودمختاری کے ساتھ کی جائے۔

پاکستان میں آبادی کے تنوع کو تسلیم کیا جائے اور مختلف نسلی گروپوں کے مفادات کا خیال رکھا جائے تاکہ لوگوں میں شراکت کا احساس پیدا ہوا۔

ریاست کے لیے ایک نظریاتی بنیاد کے نام پر جارحانہ دعوؤں سے عدم رواداری کی مختلف صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ مذہب ملک کی آبادی کو اول اور دوئم درجے کے شہریوں میں تقسیم کرنے کا باعث بنا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر شہریوں کو اکثریت اور اقلیت میں تقسیم کرنا جمہوریت کے لیے صحت مند علامت نہیں ہے۔

پاکستان میں ریاست اور سول سوسائٹی کے درمیان باہمی تعامل کی کوئی روایت نہیں ہے۔ اسٹیٹ اتھارٹی اور ٹریڈ یونین تحریک یا سیاسی جماعتوں کے درمیان آئے دن محاذ آرائی کی جگہ ریاست کے اداروں میں چیک اینڈ بیلنس کے لیے سول سوسائٹی کے ادارے جگہ نہیں لے سکے۔ حالیہ برسوں میں پاکستان میں کسی حد تک سول سوسائٹی ابھرتی نظر آئی ہے، تاہم، ریاستی اداروں کو ابھی پورے طور پر ان کے وجود کو تسلیم کرنا اور ان کی مداخلت کی قانونی حیثیت کو جائز سمجھنا باقی ہے۔

اظہار رائے اور انجمن سازی کے بنیادی حقوق کے استعمال میں خاصی بہتری آئی ہے۔ ان مثبت علامات کو سماجی رویوں میں تبدیلی لانے اور جمہوریت کی نشوونما کے لیے ایک بہتر ماحول پیدا کرنے کے لیے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ ان آزادیوں کو لاحق خطرات ختم کیے جانے چاہئیں۔

اگرچہ 1988 کے بعد سے شراکتی جمہوریت کے امکانات میں اضافہ ہوگیا ہے تاہم حکومت پر مرکزی کنٹرول کم ہونا چاہیے تاکہ نچلی ترین سطح پر بھی جمہوریت جڑ پڑ سکے۔ اگر اقتدار کا مرکز مختصر ہوتو مطلق العنانی کے رجحانات جنم لیتے ہیں۔ آمریت اور خواص کی حکمرانی کا مؤثر علاج اختیارات کی نچلی سطحوں تک تقسیم ہے۔

نمائندہ اداروں کی کارکردگی سے جمہوریت کے فروغ میں بہت کم مدد ملی ہے۔ ریاست تک رسائی کے وسائل بہتر نہ ہونے کی وجہ سے عوام کی توقعات کی تکمیل ناممکن ہوگئی۔ اس سے سرپرستی کے کلچر نے فروغ پایا ہے کیونکہ سرپرست اور سائل کے رشتے میں شکایات کے ازالے کے اداروں تک رسائی کی آزادی محدود ہو کر رہ جاتی ہے لیکن ان طور طریقوں کو ختم کرنے کا عزم زیادہ واضح طور پر نظر نہیں آتا۔ جمہوریت کو اگرچہ ایک طرز حکمرانی کے طور پر اپنایا گیا ہے لیکن ریاست اور معاشرے کی سطحوں پر ابھی اس نے جڑیں نہیں پکڑی ہیں۔ جاگیردارانہ نظام اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کی روایات، طبقاتی تقسیم اور امتیاز و عدم رواداری کا ماحول اب بھی برقرار ہے اور ریاست اور اس کے اداروں کو جمہوری بنانے کی راہ میں حائل ہے۔ غریب عوام، خواتین اور اقلیتیں عام طور پر بے اختیار اور نمایاں طور پر غیر جمہوری طور طریقوں اور رویوں کا شکار ہیں۔

نمائندہ اداروں کی کارکردگی بذات خود قابل اطمینان نہیں۔ پارلیمانی نمائندگی کے چند مخصوص سماجی اور معاشی طبقات کے ہاتھوں میں مجتمع ہو جانے سے مختلف گروپوں کے مفادات کی نمائندگی میں عدم توازن پیدا ہو گیا ہے۔ ایسی پالیسی کی جس سے ملک کو مجموعی طور پر فائدہ پہنچتا ہو اور جن سے ان طبقات کی مراعات محدود ہوتی ہوں، شدت سے مزاحمت کی جاتی ہے۔ عوامی نمائندے عوام کے مفادات کے حق میں ذمہ دارانہ طرز عمل کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہے ہیں اور ان کے لیے سیاست محض سیاسی جماعتوں کے درمیان ''اینٹ کا جواب پتھر'' کا کھیل بن کر رہ گئی ہے۔ تاہم جمہوریت کے امکانات کا نمائندہ اداروں کے استحکام سے بہت گہرا تعلق ہے اور ان اداروں کی کارکردگی پر اس کا زیادہ انحصار ہے۔

سفارشات

1- اس بات کی کوشش کی جائے کہ حکمرانی کے مسائل کے بارے میں قومی اتفاق رائے پیدا ہو سکے۔ قومی مسائل کے بارے میں فیصلوں میں چھوٹے صوبوں کو زیادہ شریک کیا جائے اور ان پالیسیوں میں آبادی کے تنوع کا لحاظ رکھا جائے۔ ریاست کو مختلف عناصر کی اپنی شناخت کے قانونی اظہار کی کوششوں کو دبانے اور کچلنے سے گریز کرنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس قومی یکجہتی اور مفاہمت کی کوشش ترقیاتی کاموں اور جمہوریت کے استحکام سے وابستہ مشترکہ مفاد کا احساس اجاگر کر کی جائے۔

2- ترجیحی بنیاد پر اختیارات کی تقسیم پر توجہ دی جائے۔ بلدیاتی اداروں کو حکمرانی کا بنیادی ادارہ بنایا جائے اور فوری طور پر بلدیاتی انتخابات کرانے کے انتظامات کیے جائیں۔ بلدیاتی قوانین میں ترمیم کی جائے اور نچلی سطح پر اقتدار منتقل کر کے اختیارات کی تقسیم کو اور زیادہ مؤثر بنایا جائے۔ بلدیاتی اداروں کو حکومت کی تیسری سطح کے طور پر تسلیم کیا جائے اور اس کے لیے آئین میں ترمیم کی جائے۔ آئین میں درج عہد کے مطابق مزدوروں، کسانوں، خواتین اور نوجوانوں سمیت ان اداروں میں تمام طبقات کی نمائندگی ک اہتمام کیا جائے۔

3- سیاسی جماعتوں کے لیے لازم ہے کہ وہ جمہوری کلچر کو فروغ دیں اور خود اپنی تنظیموں میں انتخابات کرا کے جمہوری عمل سے وابستگی کا مظاہرہ کریں۔ پارٹیوں کو اپنی رکنیت کی سماجی اور معاشی بنیادیں وسیع کر کے بڑے پیمانے پر شراکت کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

-4 پارٹیوں کے پارلیمانی طرزِ عمل میں انقلابی اصلاح کی ضرورت ہے۔ سیاسی محاذ آرائی سے سیاسی عمل کو بہت نقصان پہنچا ہے اور اس کے نتیجے میں حکمرانی میں غلطیاں ہوئی ہیں۔ جمہوری ترقی کی خاطر حریف پارٹیوں کو ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ ذمہ دارانہ رویے کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

-5 سول سوسائٹی کے لیے ایک زیادہ سازگار ماحول پیدا کیا جائے۔ مثلاً این جی اوز کے کام کرنے پر پابندیاں ختم کی جائیں۔ الیکٹرونک میڈیا کو حکومت کے کنٹرول سے آزاد کیا جائے۔ الیکٹرونک میڈیا اور اخبارات کو ملک میں ترقی پسندانہ اور روشن خیال نظریات کے فروغ کے لیے زیادہ سرگرم کردار ادا کرنا چاہیے۔ سول سوسائٹی کے اداروں میں احتساب کا نظام قائم کیا جائے اور ان کی کارکردگی شفاف بنائی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ریاست کے اداروں کی کارکردگی کا جائزہ بھی لیتے رہیں۔

-6 تدریسی آزادی کی ضمانت دی جائے، یونیورسٹیوں اور دیگر اعلیٰ اداروں میں سرکاری مداخلت ختم کی جائے۔ تحقیقی سرگرمیوں، نصابی کتب کی تیاری اور طلبہ کے معاملات کی انتظام کاری میں مداخلت بند کی جائے۔ تعلیمی کاموں کو ریاستی نظریے کے مطابق بنانے کی کوششوں کی سختی سے مذمت کی جانی چاہیے۔

-7 ایسے قوانین کو جو ان بنیادی حقوق پر قدغن لگاتے ہیں جن کی آئین نے ضمانت دی ہے منسوخ کیا جائے۔ ان قوانین کو ریاست سیاسی انتقام اور مخالفین کے خلاف کارروائی کے لیے استعمال کرتی ہے۔ پریس کی آزادی پر پابندیاں یا ایسے طور طریقے فوری طور پر ختم کیے جائیں جن سے ریاست کو پریس کی آزادی کو کنٹرول کرنے کا موقع ملے۔ صحافیوں، وکلا، انسانی حقوق کے سرگرم کارکنوں اور ماہرین تعلیم کے خلاف غیر جمہوری کرداروں کی دھمکیوں کو جن کا مقصد ان کو آزادی اظہار اور اپنے پیشہ ورانہ فرائض سے روکنا ہوتا ہے، مجرمانہ سرگرمی قرار دیا جائے اور ان کے خلاف باقاعدہ طور پر کارروائی کی جائے۔

-8 پورے ملک میں رائے دہی کے حق کو یکساں طور پر نافذ کیا جائے۔ جداگانہ انتخاب کا نظام ختم کیا جائے تاکہ اقلیتوں کا حق شراکت بہتر ہو سکے۔ 1997 کے انتخاب میں پہلی بار وفاق کے وزیر انتظام علاقوں میں بالغ رائے دہی کے نظام کی توسیع ای حوصلہ افزا علامت ہے۔ ان علاقوں کو بھی پالیسی اور قانون سازی کے اس عمل میں شامل کیا جائے جس کا اطلاق ملک کے دوسرے علاقوں پر ہوتا ہے۔

-9 مذہبی آزادی اور آزادی اظہار کو کچلے بغیر، مذہبی عدم رواداری کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔ جبکہ ان آزادیوں کو بھی دوسروں کی سلامتی اور وقار کے احترام کے تابع ہونا چاہیے۔ ذرائع ابلاغ اور سول سوسائٹی کے دوسرے اداروں کو مذہبی کٹرپن کے چیلنج کی مزاحمت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ انہیں ان مسائل پر رائے عامہ تیار کرنی چاہیے، اس سے حکومت کے قدامت پرست عناصر کے سامنے جھکنے کی حوصلہ شکنی ہوگی اور عدم رواداری کے خاتمے کے لیے ضروری اقدامات کے لیے اس کا عزم مستحکم ہوگا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

-10 مذہبی آزادی پر اثر انداز ہونے والے قوانین منسوخ کیے جائیں، اس سلسلے میں احمدیوں کے خلاف قوانین کا ذکر خاص طور پر ضروری ہے۔ ایسے قوانین کو بھی منسوخ کیا جانا چاہیے جو مذہبی بنیاد پر انتقامی کارروائی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ توہین رسالت کے قانون پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس قانون پر خاص طور پر اس لیے بھی نظر ثانی کی جائے کہ مذہبی انتہا پسند اسے غلط طور پر استعمال نہ کر سکیں۔

-11 مذہبی اور فرقہ ورانہ جرائم سے دانش مندی کے ساتھ نمٹا جائے لیکن ذمہ دار افراد کے خلاف کارروائی میں غلط بنیاد پر مبنی لحاظ نہ برتا جائے تاکہ یہ تاثر نہ ملے کہ مذہب کے نام پر جرائم کے ارتکاب پر کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔

-12 ریاست کے اداروں اور عوام دونوں کی جانب سے خواتین کے مساوات، امتیازی سلوک سے آزادی اور تشدد سے تحفظ کے حقوق کے زیادہ احترام کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔ سماجی رویوں کو تبدیل کرنے کے لیے قانون سازی کو سرکاری پالیسی کی مکمل حمایت حاصل ہونی چاہیے، تبھی وہ قوانین مؤثر ہوں گے۔ خواتین کے بنیادی حقوق کو مذہب، ثقافتی روایات اور رسم و رواج کی قربان گاہ پر قربان نہ کیا جائے۔ خواتین کے خلاف امتیازی قوانین کی اصلاح کی جائے اور انہیں خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیازی سلوک کے انسداد کے عالمی کنونشن کے مطابق بنایا جائے جس کی پاکستان فروری 1996 میں توثیق کر چکا ہے۔

-13 مثبت اقدامات کے ذریعے خواتین کی سیاسی شراکت کو بڑھایا جائے۔ سیاست کے بڑے دھارے میں خواتین کو شریک کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں۔

-14 CEDAW اور بچوں کے حقوق سے متعلق کنونشن کی توثیق سے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے معاہدات کی توثیق کے سلسلے میں پاکستان کا ریکارڈ بہتر ہوا ہے۔ تاہم بیشتر بڑے انسانی حقوق کے معاہدات کی توثیق ابھی ہونا باقی ہے۔ پاکستان کو خاص طور پر سیاسی اور سوشل حقوق کے اور معاشی، سیاسی اور ثقافتی حقوق کے میثاقوں کی توثیق کرنا چاہیے۔ ان معاہدات کو معیار تسلیم کیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ریاست کے طرز عمل کو جانچا جائے۔

قانون کی حکمرانی اور نظام انصاف

عدالتی نظام سے انصاف کی فراہمی میں ناکامی سے قانون کی حکمرانی کا احترام کم ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں عوام میں قانون سے گریز کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ یہ تصور عام ہو گیا ہے کہ عدالتی نظام مؤثر نہیں رہا اور اس کو حکومت کی انتظامیہ کی زیادتیوں کا جواز بنا لیا جاتا ہے۔ بہت سے قوانین عوام کے تصور عدل سے مطابقت نہیں رکھتے لہٰذا عوام ان کی حمایت نہیں کرتے، جو کہ قانون کی حکمرانی کے فروغ کے لیے بہت ضروری ہے۔ جنس، مذہب، معاشی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سماجی حیثیت کی بنیاد پر امتیاز برتنے والے قوانین نفرت اور بے اطمینانی پیدا کرتے ہیں۔ غیر نمائندہ طریقوں سے قانون سازی یا ان عناصر کے دیے ہوئے قوانین جن کی اپنی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا جاتا ہے کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام ان قوانین کو اپنا تصور نہیں کرتے۔ ان حالات میں نظام انصاف کی دیانت پر یقین اور اس پر اعتماد کو برقرار رکھنا دشوار ہوتا ہے۔ عدلیہ کی آزادی کو یقینی بنانے کے اقدامات کے ساتھ ساتھ عدالتی نظام کو درست کرنے کے اقدامات بھی ضروری ہیں۔ نظام انصاف کی کمزوریوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بحران سے جابرانہ اقدامات کا رجحان تقویت پکڑتا ہے۔ خصوصی عدالتوں اور غیر معمولی قوانین پر انحصار سے منفی نتائج مرتب ہوئے ہیں۔ اسلامی تعزیری قوانین اور فیڈرل شریعت کورٹ کے قیام کے ذریعے ایک متوازی نظام قانون وجود میں آ گیا ہے جس سے معاملات بے حد الجھ گئے ہیں۔ اس سے نہ انصاف کی فراہمی میں مدد ملی ہے اور نہ قانون کے نفاذ میں۔

سفارشات

1- پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کے امکانات اسی صورت میں روشن ہو سکتے ہیں جب مقننہ زیادہ ذمہ داری کے ساتھ قانون سازی کرے۔ آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی صرف ہنگامی حالات میں کی جائے۔ ایک ہی آرڈیننس کو بار بار نافذ کرنے کا طریقہ نمائندہ حکمرانی کی روح کے خلاف ہے۔ اگر آرڈیننس کا اجراء ناگزیر ہو تو اسے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ اسے قانون کے مطابق نافذ کیا جا سکے۔

2- پارلیمنٹ میں جو بل پیش کیے جائیں ان کی پبلک مباحثے کے لیے باقاعدہ تشہیر کی جائے اور ان کی منظوری سے پہلے ان کا تنقیدی جائزہ لینے کا موقع فراہم کیا جائے۔

3- پارلیمنٹ میں تمام پارٹیاں اتفاق رائے سے فیصلہ کریں کہ اس وقت نافذ تمام آرڈیننسوں کا جائزہ لیا جائے اور پارلیمنٹ کی قانون سازی کی کارروائی کے ذریعے ان کو ریگولرائز کیا جائے یا ان میں ترمیم کی جائے یا انہیں منسوخ کیا جائے، تاہم ہر کارروائی سے پہلے پارلیمنٹ میں بحث ضروری ہے اور عوام کو ان مباحث میں شرکت کے مواقع ملنے چاہئیں۔

4- عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کرنے کا عمل تیز کرنا ضروری ہے، اس عمل میں بعض مشکلات اور رکاوٹیں ہیں جنھیں اگر جلد دور نہ کیا گیا تو وہ سسٹم کا حصہ بن جائیں گی اور اس اصلاحی عمل کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ ایسا ہوا تو ممکن ہے کہ قانون کی حکمرانی اور نظام انصاف پر سے عوام کا اعتماد مکمل طور پر اٹھ جائے۔

5- لازم ہے کہ انصاف عام قوانین کے تحت عام عدالتوں کے ذریعے فراہم کیا جائے۔ خصوصی قوانین اور ٹریبونلز نے عدالتی نظام کے اعتبار کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور قانون کے سامنے برابری کے اصول کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زک پہنچائی ہے۔ سنگین جرائم اور دہشت گردی کی روک تھام کی کوشش میں جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے وہ مقدمات کی منصفانہ سماعت اور باقاعدہ کارروائی کے اصولوں اور معیار سے کہیں فروتر ہے۔

6- عدلیہ اور وکلا برادری کو قانون کی حکمرانی کے احترام کی بحالی کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ان امتیازی اور جابرانہ قوانین کی نشاندہی کی جائے جو برسر اقتدار خواص کے مفادات کو پروان چڑھانے کے لیے وضع کیے گئے ہیں، اور ان کی تنسیخ کے لیے زوردار مہم چلائی جائے۔ عدالتی طرز عمل ایسا ہو کہ اس سے مساوی طور پر، کسی رعایت اور خوف کے بغیر، انصاف کی فراہمی کے احترام کا اظہار ہو۔ عدلیہ کو سماجی تعصبات اور خصوصاً خواتین کے خلاف تعصّبات سے بالاتر ہونا چاہیے اور اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ عالمی انسانی حقوق میں وضع کردہ معیارات کا یکساں اطلاق ہو۔

7- دوسرے اداروں کی طرح عدلیہ کا بھی احتساب ہونا چاہیے۔ عدالتی احتساب کے لیے مناسب طریق کار مرتب کرنے کے اقدامات کی عدلیہ کی تائید وحمایت کرنی چاہیے۔ توہین عدالت کے قانون میں عدالتی طرز عمل پر منصفانہ تبصروں اور عدلیہ کے فیصلو پر تعمیری نکتہ چینی پر غیر ضروری پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ قانون میں اس طرح ترمیم کی جائے کہ ایک ادارے کے طور پر عدلیہ کے احترام کو نقصان پہنچائے بغیر تبصرے اور تنقید کی اجازت ہو۔

8- اعلیٰ عدالتوں کی جانب سے باقاعدگی سے معائنوں اور سخت تادیبی کنٹرول کی مدد سے ماتحت عدالتوں کی نگرانی کی جائے اور انصاف کی یکساں فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ فیڈرل جوڈیشل اکیڈمی ججوں کو زیادہ بامقصد تربیت دے اور انسانی حقوق کے معیارات کے بارے میں ان کا شعور بڑھانا چاہیے۔

9- عوامی مفاد میں مقدمہ بازی کے امکانات کی بہتر تعریف کرنا ضروری ہے تاکہ ایسی تحریک بے نتیجہ ثابت نہ ہو۔ جوڈیشل ایکٹوازم کی حدود مقرر کرنا بھی ضروری ہے۔ بار ایسوسی ایشن، دوسری غیر سرکاری تنظیموں اور ہیومن رائٹس گروپوں کو چاہیے کہ اس عمل کے بارے میں مباحثے شروع کریں۔

10- عدالتی معاملات میں تاخیر بڑی تشویش کی بات ہے۔ ترجیحی بنیادوں پر ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے گزشتہ سے پیوستہ کام کیا جا سکے۔ ماتحت اور اعلیٰ عدالتوں میں کام کا جو طریقہ جاری ہے وہ دقیانوسی اور پرانا ہے۔ اس سے نہ صرف تاخیر ہوتی ہے بلکہ انصاف کا معیار بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس طریق کار میں قرار واقعی تبدیلی سے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

فرد کی زندگی، آزادی اور ذات کا تحفظ

پاکستان میں تحفظ کے حقوق کی انتہائی سنگین خلاف ورزیاں کی جا رہی ہیں۔ ایک طرف تو ریاست خود تشدد کر رہی ہے اور دوسری جانب وہ شہریوں کی زندگی، آزادی اور ان کی املاک کو ان غیر ریاستی عناصر کے ہاتھوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محفوظ رکھنے میں ناکام رہی ہے، جو جرائم یا دہشت گردی میں مصروف ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں پر کسی قاعدے یا قانون کا اطلاق نہیں ہوتا اور وہ بڑی بے خوفی کے ساتھ عوام کے حقوق پامال کرتی ہیں۔ ان ایجنسیوں کے طرز عمل سے عام شہریوں میں اعتماد کی بجائے خوف پیدا ہو رہا ہے۔ یہ فورسز نہ صرف قانون کے نفاذ کے سلسلے میں انتہائی بربریت کا مظاہرہ کرتی ہیں بلکہ پولیس کے خود مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے بارے میں سنگین شکایات ہیں۔ اس کا اعتراف ان فورسز کے اعلیٰ افسران خود بھی کر چکے ہیں۔

نسلی تعلقات سے نمٹنے میں انتظامیہ کی ناکامی اور مذہب یا فرقے کے نام پر جرم کرنے والوں کے ساتھ نرمی برتنے سے فرد کا تحفظ کا حق کمزور اور غیر محفوظ ہو گیا ہے۔ ریاست کے قوانین اور پالیسیوں سے مذہبی عدم رواداری کو فروغ ملا ہے، خاص طور پر ضیا الحق کے اسلامائزیشن کے عمل کے دوران، یکے بعد دیگرے حکومتوں نے مذہب سے متعلق مسائل کے بارے میں حساسیت کا ہوا کھڑا کر کے عدم رواداری کو روکنے میں اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ذرائع ابلاغ اور مساجد سے نفرت انگیز پروپیگنڈے اور مذہبی تنظیموں کی مطبوعات سے ایسے تشدد کو بڑھاوا ملا ہے جو مذہبی عدم رواداری سے پیدا ہوتا ہے۔

سندھ میں مختلف نسلی گروہوں کی شکایات کا ریاست نے مناسب جواب نہیں دیا، ریاست کی پالیسیوں کے خلاف ان کے ردعمل کو محض امن وامان کا مسئلہ سمجھا گیا۔ اسے ایک سیاسی صورت حال نہیں سمجھا گیا جس کے لیے گہری تحقیق وتفتیش اوران پالیسیوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے جو اس صورت حال کا موجب بنی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ریاست کو اپنے مفاد کی خاطر نسلی کشیدگی کو ہوا دینے کی غیر ذمہ دارانہ روش بھی ترک کر دینی چاہیے۔ انٹیلی جنس سروسز کو کنٹرول کیا جائے اور نہ صرف سندھ بلکہ پورے ملک کی سیاست میں ان کی ضرر رساں مداخلت کو سختی سے ممنوع قرار دیا جائے۔ اگر چہ دہشت گردی سے کسی صورت میں بھی حرف نظر نہیں کیا جا سکتا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ ریاست خود دہشت گردی کا جواب دہشت گردی سے دے رہی ہے جس کا اظہار ماورائے عدالت قتل، پولیس کی تحویل اور جیل میں حراست کے دوران تشدد اور اذیت رسانی، بلا مقابلہ چلائے نظر بندی اور عوام کو ہراساں کرنے کی صورت میں ہو رہا ہے۔

کنٹرول، آمریت، جبر اور تشدد سے پیدا ہونے والے سماجی رجحانات نے معاشرے کے کمزور طبقات کی سلامتی اور آزادی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ بانڈڈ لیبر، غلامی اور غلامی جیسے طور طریقے آج بھی پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات شرمناک حد تک زیادہ ہیں اور ریاستی انتظامیہ کی جانب سے اس کی مناسب روک تھام کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے جاتے۔

سفارشات

1- قومی سطح پر سیاسی حل کے ذریعے نسلی کشیدگی کم کی جائے۔ اس مقصد کے لیے ان تنظیموں اور افراد کی مدد لی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے جن پر اس تنازعے کے تمام فریق اعتبار کرتے ہوں۔ قومی مصالحت کا عمل شفاف ہونا چاہیے اور تمام فریقوں کا کردار عوام کے سامنے واضح ہونا چاہیے۔ ریاست یا تنازعے کے دوسرے فریقوں کے خلاف مصالحت کے عمل کے دوران بدنیتی کے جو الزامات لگائے جائیں ان کی تحقیق عدالتی کارروائی کے ذریعے کرائی جائے۔ اگر اس قسم کی کسی کوشش کو قابل اعتماد بنانا ہے تو سب سے پہلے خود ریاست کو اپنی نیک نیتی ثابت کرنا ہوگی۔

-2 پولیس سسٹم کی مکمل تنظیم نو کی ضرورت ہے۔ پولیس کے اختیارات محدود کیے جانے چاہئیں اور اسے عدالتی کنٹرول کے تحت لایا جائے۔ پولیس کی از سر نو تربیت ہونی چاہیے اور اس کا کردار قانون نافذ کرنے والا ادارہ نہیں بلکہ خدمت کرنے والا ادارہ ہونا چاہیے۔ فورس کی تربیت میں انسانی حقوق کے اصولوں کی تفہیم بھی شامل ہونی چاہیے۔ پولیس کی اصلاحات پر اس سے کہیں زیادہ سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے جس کا اب تک مظاہرہ کیا گیا ہے۔ مختلف پولیس ریفارمز کمیٹیوں کے کاموں کا اب تک کوئی پبلک اعلان نہیں کیا گیا ہے۔

-3 ماورائے عدالت قتل، سرکاری تحویل میں اموات اور اذیت رسانی اور غیر قانونی حراست کی شکایات کا عدلیہ کو نوٹس لینا چاہیے۔ ارتکاب کرنے والے ذمہ دار افراد کو سزا ضرور دی جانی چاہیے۔ یہ سزا صرف محکمانہ قوانین کے تحت تادیبی کارروائی تک محدود نہیں رہنی چاہیے بلکہ ایسی کارروائیوں پر فوجداری قوانین کے تحت مقدمے چلائے جائیں۔

-4 قانون کے نفاذ اور تحقیقات کے لیے کئی مختلف فورسز کی تعیناتی سے باقاعدگیاں کرنے اور زیادتیوں کو چھپانے میں مدد ملتی ہے۔ قانون کے نفاذ میں زیادہ یکسانیت پیدا کی جائے۔ پیرا ملٹری فورسز کا استعمال ہر حال میں بند ہونا چاہیے۔

-5 جیلوں کی صورت حال نا قابل قبول حد تک خراب ہے جس کا نتیجہ وقار انسانی کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان حالات کی اصلاح کے لیے جیل ریفارمز کمیشنوں کی سفارشات پر مناسب طور پر عمل ہونا چاہیے۔ عدالتی حکام جیلوں کی سختی سے مانیٹرنگ کریں اور غیر سرکاری مانیٹرز کو بھی زیادہ رسائی ہونی چاہیے۔ مقدمات میں تاخیر سے سزا سے پہلے نظر بندی کی مدت غیر ضروری طور پر طویل ہو جاتی ہے۔ عدالتی نظام میں اس طرح تبدیلی کی جائے کہ مقدمات کے فیصلے جلد ہو سکیں۔

-6 ظالمانہ، غیر انسانی اور توہین آمیز سزائیں ختم کی جائیں۔ پاکستان کو سزائے موت کے خاتمے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

-7 بین الاقوامی برادری پاکستان پر زور دے کہ وہ اقوام متحدہ کے ایذا رسانی سے متعلق کنونشن کی توثیق کرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ضابطہ اخلاق کی پابندی کرے۔

8- بانڈڈ لیبر کے خاتمے کے ایکٹ 1990 کے نفاذ کے باوجود استحصال کا یہ مذموم طریقہ ختم نہیں ہوا۔ اس کے خاتمے کے لیے ریاستی اختیارات کا سختی سے استعمال کیا جائے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو مقررہ سزائیں دی جائیں۔

9- خواتین کے خلاف تشدد سے نہ صرف درگزر کیا جاتا ہے بلکہ اکثر اوقات ریاستی ادارے اور عدلیہ مجرموں کو معاف بھی کر دیتی ہیں۔ خواتین کے خلاف تشدد کے بارے میں سماجی رویے تبدیل ہونے تک حکومت کو پوری قوت کے ساتھ اس کی مذمت کرنی چاہیے۔ خواتین کے خلاف تشدد کرنے والوں سے کوئی نرمی نہ برتی جائے اور انہیں سزائیں دی جائیں۔ خواتین کے حقوق کا مناسب احترام کیا جائے۔ ان کے حقوق کی خلاف ورزی کو، رسم ورواج، ثقافتی طور طریقے اور مذہبی تصور کے نام پر رعایت دے کر معاف نہ کیا جائے۔ خواتین کو تحفظ کے نام پر ان کی آزادی اور نقل وحرکت کی آزادی کے بنیادی حقوق سے محروم نہیں کیا جانا چاہیے۔

10- ایسے تعزیری قوانین منسوخ کر دیے جائیں جو خواتین کے خلاف امتیاز روا رکھتے ہیں یا ان کی قانونی حیثیت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ فوجداری نظام انصاف کو خواتین کی خصوصی ضروریات کے بارے میں حساس بنایا جائے تاکہ پولیس اور تحقیقاتی ایجنسیوں سے واسطہ پڑنے پر ان کی سلامتی کو خطرہ نہ ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوری کلچر کے فروغ کے لیے سیاسی جماعتوں کا کردار

(ڈاکٹر مہدی حسن)

جب ہم جمہوریت سے بات شروع کرتے ہیں تو سیاسی جماعتوں کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے کیونکہ سیاسی جماعتوں کی موجودگی کے بغیر جمہوریت قائم نہیں ہوسکتی اور جمہوریت کے بغیر سیاسی جماعتیں کام نہیں کرسکتیں۔

جمہوریت کا آغاز تقریباً 350 سال قبل یورپ میں ہوا تھا اور سیاسی جماعتوں کی تاریخ 200 برس پرانی ہے۔ یورپ میں جب نشاط ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی اور عام آدمی کی علم تک رسائی ہوئی تو پھر جمہوریت کا ارتقاء ہوا۔ بادشاہ اور چرچ نہیں چاہتے تھے کہ علم عام آدمی تک پہنچے اس لیے کتاب شائع کرنے پر موت کی سزا رکھی گئی تھی لیکن اس کے باوجود لوگ کتابیں چھاپتے رہے اور سزائیں بھگتتے رہے مگر علم عام آدمی تک پہنچتا رہا اور ان کی طاقت میں اضافے کا سبب بنتا رہا۔ اس کے بعد اصلاح کلیسا تحریک چلی جس کے باعث مذہب اور ریاست کی علیحدگی ہوئی اور چرچ کا مذہب پر سے تسلط ختم ہوا۔ ان دو تحریکوں کے نتیجے میں یورپ میں صنعتی انقلاب آیا جس کی بدولت وہاں ایک صنعتی متوسط طبقہ وجود میں آیا۔ اس طبقے کے پاس معاملات طے کرنے اور سودا بازی کرنے کے اختیارات آئے اور اس کی حیثیت مضبوط ہوئی۔ کسان کے پاس لین دین کے اختیارات اتنے زیادہ نہیں ہوتے جتنے صنعتی مزدور کے پاس ہوتے ہیں۔ کیونکہ کسان کی زندگی کا دارومدار زیادہ تر قدرتی قوتوں پر ہوتا ہے۔ اگر بارش نہ ہو تو کسان دعا کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا جبکہ صنعتی مزدور کی ایک دن کی سرگرمی سے معاشرہ بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

اگر ریلوے ورکرز یا پی ٹی سی ایل کے ورکرز یا کسی بھی صنعتی ادارے کے مزدور ایک دن کی ہڑتال کر دیں تو پورے ملک میں ہر چیز اثر انداز ہوتی ہے۔ تو جب لین دین اور معاملات طے کرنے کے اختیارات متوسط طبقہ کے آدمی کو منتقل ہونا شروع ہوئے تو اس دور کو ہم جمہوریت کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آج سے اڑھائی تین ہزار سال قبل یونان کی تہذیب میں جمہوریت تھی اور شہری ریاستوں میں جمہوری نظام حکومت استوار تھا۔ لیکن وہ جمہوریت اور آج کی جمہوریت بہت مختلف ہے۔ اس وقت بادشاہ امراء طبقے میں سے اپنے لیے مشیر چن لیتا تھا اور ان کی مشاورت سے نظام حکومت چلاتا تھا۔ کسی قسم کے انتخابات نہیں ہوتے تھے۔ امراء طبقہ کے مشیروں پر مشتمل ایک پارلیمنٹ، سینٹ یا کونسل ہوتی تھی جس کی مدد سے بادشاہ حکومت کا نظام چلاتا تھا۔ غلاموں، عورتوں اور عام آدمی کو بادشاہ کا مشیر مقرر ہونے یا اس کو مشورہ دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ آپ آج کی جمہوریت سے اس کا رشتہ نہیں جوڑ سکتے۔ بعض لوگ بہت اسرار کرتے ہیں کہ اسلامی نظام میں بھی جمہوریت موجود ہے۔ اسلامی نظام کی اصطلاح بہت گمراہ کن ہے کیونکہ نظام کسی مذہب یا تہذیب کا پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ لوگوں کی ضروریات کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور وقت کے تقاضوں اور معاشرتی ڈھانچے کی تبدیلی کے ساتھ ہی نظام بھی تبدیل ہوتا ہے۔ اسلامی فلسفہ خدا کا دیا ہوا ہے جبکہ سیاسی نظام انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آج سے 1400 برس قبل کا نظام لاگو ہونا چاہیے۔ دیکھیں وہ نظام اس وقت کے لوگوں کی ضروریات کے مطابق تھا لیکن آج 1400 سال بعد معاشرے میں بہت زیادہ تبدیلیاں رونما ہوگئی ہیں۔ جس وجہ سے 1400 سال قبل کا نظام آج کہیں بھی لاگو نہیں کیا جا سکتا۔

جمہوریت کی ابتداء اس وقت ہوئی جب بادشاہ کے اختیارات کو کامیابی کے ساتھ چیلنج کیا جانے لگا۔ جب بادشاہ نے اپنے مشیر مقرر کرنے شروع کیے تو ان مشیروں اور پیشہ وارانہ افراد نے خود کو انجمنوں اور یونینوں میں منظم کرنا شروع کر دیا۔ ان انجمنوں اور یونینوں نے بعد میں بننے والی سیاسی جماعتوں کے لیے مرکز کا کام کیا۔ ادیبوں اور شعراء کی انجمنیں موجود تھیں اور وہ اپنے مسائل پر بحث کرتے تھے۔ لوگ مختلف ہوٹلوں اور کلبوں میں بیٹھ کر اپنے مسائل زیر بحث لاتے تھے۔ فرانس اور انگلینڈ میں آج سے سوا دو سو سال قبل بہت سی سیاسی جماعتیں ہوٹلوں، شراب خانوں اور کلبوں کے نام پر بھی بنیں کیونکہ ان لوگوں نے وہاں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ اس کے بعد انتخابات کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی بہت زیادہ تبدیلیاں ہوئیں۔ شروع شروع میں انتخابات میں ووٹ ڈالنے کے لیے جائیداد اور تعلیم کی شرط عائد تھی۔ تاہم بعد ازاں یہ شرط ختم کر دی گئی اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر تمام بالغ افراد کو انتخابات کے عمل میں حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی۔

پاکستان میں 1970 میں پہلی مرتبہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر لوگوں کو ووٹ ڈالنے کا حق ملا۔ ہندوستان میں سیاسی جماعتوں کا آغاز برطانیہ کی آمد کے بعد ہوا۔ 1857 کے واقعہ کے ہندوستان کی سیاست پر دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ 1857 کے بعد ہندوستان برطانیہ کی کالونی قرار دیا گیا اور برطانوی پارلیمنٹ کے قوانین یہاں پر رائج ہونا شروع ہوئے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے لوگوں کے لیے سب سے پہلی مثبت تبدیلی آئی یہ کہ بادشاہ یا ملکہ ناقابل دکھائی تھا۔ ہندوستان کے لوگوں کو پہلا تحریری آئین ملا۔ بادشاہ/ ملکہ دور انگلستان میں رہتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے اور وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔ ہندوستان کے لیے برطانوی پارلیمان نے سب سے پہلا قانون 1858 میں بنایا جس کے تحت ہندوستان کو برطانوی سلطنت کے ماتحت قرار دیا گیا۔ دوسرا قانون پولیس ایکٹ 1861 تھا جو پاکستان میں 2002 تک نافذ العمل رہا۔ چونکہ ہم لوگ برطانیہ کی کالونی تھے اور ان کے غلام سمجھے جاتے تھے، اس لیے برطانیہ نے عوام دوست پولیس کا نظام قائم نہیں کیا بلکہ پولیس کا ایسا نظام قائم کیا گیا کہ جس کے ذریعے لوگوں کو کنٹرول کیا جا سکے۔ لوگوں کو زیر کنٹرول اور زیر تسلط رکھنے والا نظام لایا گیا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ہماری پولیس کا جو رویہ لوگوں کے ساتھ رہا ہے، وہ آزادی سے پہلے والا ہی تھا کیونکہ انگریزوں نے پولیس کا محکمہ لوگوں کی خدمت کے لیے نہیں بلکہ ان پر جبر اور تشدد روا رکھنے کے لیے قائم کیا تھا۔

اکثر پولیس کے تربیتی مراکز میں پڑھانے جاتا ہوں تو میں وہاں ایک مثال بیان کرتا ہوں کہ ایک دفعہ میں نیویارک میں تھا اور بس سٹاپ پر کھڑا تھا کہ ایک سات، آٹھ سال کی بچی جس کے پاس سکول کا بستہ تھا وہاں پر آئی تو اپنی جوتی کا تسمہ بند کروانے کے لیے ایک پولیس اہلکار کے پاس گئی جب وہ واپس آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے پولیس اہلکار کے سوا کسی اور کو مدد کے لیے کیوں نہیں کہا۔ بچی نے جواب دیا کہ اس کی ماں نے اس کو ہدایت کی ہے کہ جب کبھی مشکل پیش آئے تو پولیس والوں سے مدد لے لینا۔ ہمارے ہاں اگر کوئی آدمی مشکل میں ہو اور اس وقت اس کی نظر کسی پولیس اہلکار پر پڑ جائے تو وہ سب سے بڑی مشکل کا شکار ہو جاتا ہے۔ تو ہماری پولیس کا یہ رویہ اس رویے کی عکاسی کرتا ہے جو برطانوی سامراج کی قائم کردہ پولیس کا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے پہلی سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے 1906 میں وجود میں آئی اس سے قبل 1885 میں آل انڈیا کانگریس کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم ہوئی۔ ان دونوں جماعتوں کے ابتدائی منشور میں یہ بنیادی نقطہ شامل تھا کہ برطانوی اقتدار سے وفاداری کی جائے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا نقطہ نظر وہی تھا جو سید احمد خان کا تھا کہ برطانوی تاج اور سلطنت سے وفادار رہنا ان کے لیے مفید ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ ان لوگوں پر مشتمل تھی جو سمجھتے تھے کہ برطانیہ کی ہندوستان آمد سے ان کے مفادات کو نقصان پہنچا ہے۔ اس جماعت میں زیادہ تر نواب شامل تھے۔ 1929 میں مجلس احرار ہند بنی۔ 1936 میں جمعیت علمائے ہند اور خاکسار تحریک قائم ہوئی۔ 1942 میں جماعت اسلامی نے جنم لیا۔ 1937 کے انتخابات جو 1935 کے ایکٹ کے تحت ہوئے تھے میں مسلم لیگ کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ یہ تھی کہ جماعت امراء کا کلب تھی اور عام لوگوں تک اس کی رسائی نہیں تھی اور نہ ہی عام لوگوں کی اس جماعت تک رسائی تھی اور انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جماعت کی عام لوگوں تک رسائی ہونا ضروری ہوتا ہے۔ 1946 کے انتخابات میں مسلم لیگ نے 86 مسلم سیٹوں میں سے 78 جیتیں اور 8 سیٹیں دیگر مسلم سیاسی جماعتوں کو نہیں ملیں بلکہ کانگریسی مسلمانوں کو ملیں۔ مجلس احرار ہند نے انتخابات میں حصہ لیا تھا جبکہ جمعیت علمائے ہند نے کانگریس کی حمایت کی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1946 کے انتخابات میں مسلم لیگ نے اس لیے کامیابی حاصل نہیں کی تھی کہ وہ ایک منظم سیاسی جماعت تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مطالبہ پاکستان کے مقبول نعرے کی وجہ سے اسے کامیابی ملی۔ ''لے کر رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان'' کے نعرے کی مسلم لیگ ترجمان تھی جس وجہ سے مسلمانوں نے اسے ووٹ دیے۔ پاکستان کے بننے کے بعد سے 13 مسلم لیگیں وجود میں آ چکی ہیں اور سب کا دعویٰ یہ رہا ہے کہ ان کا جنم پاکستان کی خالق مسلم لیگ سے ہوا ہے۔ جنرل ایوب کے دور میں تین مسلم لیگیں بنیں۔ ایک کنونشن مسلم لیگ، دوسری کونسل مسلم لیگ اور تیسری ایک نوجوان زاہد سرفراز نے نوجوانوں کی مسلم لیگ قائم کی تھی۔ 1970 کے انتخابات بالغ حق رائے دہی اور ایک آدمی، ایک ووٹ کی بنیاد پر منعقد ہوئے تھے۔ ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پر انتخابات منعقد کروانے کا مطلب یہ تھا کہ صوبوں میں آبادی کے لحاظ سے سیاسی جماعتوں کو نمائندگی ملے گی۔ یہ پہلے دن سے مشرقی بنگال کا مطالبہ رہا تھا کہ انہیں آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دی جائے اور ان کا یہ مطالبہ 1970 میں پہلی بار تسلیم کیا گیا۔ 1954 میں ون یونٹ بنایا گیا۔ موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں کو ملا کر ایک یونٹ بنایا گیا اور مشرقی بنگال کا ایک یونٹ مانا گیا۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو 50,50 فیصد نمائندگی دی گئی۔ 1970 کے انتخابات میں 63 سیاسی جماعتوں نے حصہ لیا۔ ایک بات قابل غور ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے 1906 سے لے کر 1947 تک کہیں بھی اور کسی بھی جلسے یا میٹنگ میں اسلامی نظریہ حیات یا پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی بات نہیں کی۔ پوری تحریک پاکستان میں آپ کو یہ چیز نظر نہیں آئے گی بلکہ پاکستان کے قیام کے بعد مذہبی جماعتیں اور مذہبی نظریات آہستہ آہستہ ارتقاء پذیر ہوئے اور بالآخر انہوں نے پورے ملک کو یرغمال بنا لیا۔

پاکستان کی سیاست میں مذہبی عناصر کی شمولیت کا آغاز 1948 میں ہوا جب مجلس احرار نے احمدیوں کے خلاف تحریک چلائی جس کے نتیجے میں 1953 میں لاہور میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا۔

اس وقت ملک میں 162 سیاسی جماعتیں کام کر رہی ہیں جن میں سے 87 الیکشن کمیشن کے پاس رجسٹرڈ ہیں۔ 60 سے زائد مذہبی سیاسی جماعتیں، گروہ اور کالعدم مذہبی تنظیمیں ملک میں کام کر رہی ہیں۔ پوری دنیا میں سیاسی جماعت کی جو رائج تعریف وہ یہ ہے کہ سیاسی جماعت سے مراد ''ایک ایسی مستقل تنظیم ہے جو اقتدار حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کی خواہش رکھتی ہے''۔ تعریف کو مدنظر کیا جائے تو عارضی طور پر قائم ہونے والے پریشر گروپ اور ٹریڈ یونینیں وغیرہ سیاسی جماعت کی تعریف پر پورا نہیں اترتے۔ تمام ممالک میں ایک مستقل ادارہ ہوتا ہے جسے فوج کہتے ہیں۔ ترقیاتی یافتہ ممالک میں فوج کا ادارہ مضبوط اور منظم ہے۔ پاکستان میں بھی فوج کا ادارہ مضبوط اور منظم ہے۔ پاکستان اور دیگر غیر ترقی یافتہ ممالک کی فوج مناسب حالات میں اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے اور اسے زیر استعمال لاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ممالک کی فوج ایک مستقبل ادارہ ہے اور اقتدار پر قبضہ کرنے اور اسے استعمال کرنے کی خواہش بھی رکھتی ہے چنانچہ ان ممالک کی فوج کو ہم سیاسی جماعت کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ عالمگیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سطح پر منظور شدہ اور رائج شدہ سیاسی جماعت کی تعریف پر پورا اترتی ہے۔ یہ جو آئے روز سیاسی رہنماؤں کی طرف سے بیانات سامنے آتے رہتے ہیں کہ اب انہوں نے مارشل لاء کا راستہ روک دیا ہے یہ غلط ہے کیونکہ پاکستان کی موجودہ سیاسی جماعتیں اس قابل نہیں کہ وہ فوج جیسے منظم ادارے کا مقابلہ کر سکیں۔ اگر وہ واقعی مارشل لاء کے نفاذ کا راستہ روکنا چاہتے ہیں تو انہیں خود کو منظم اور مضبوط کرنا ہوگا۔

سیاسی جماعتوں کے لیے چند چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ تمام سیاسی جماعتوں کے پاس اراکین سازی کا ایک فارم ہوتا ہے اور جو آدمی کسی سیاسی جماعت کا رکن بننا چاہے اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس فارم کو پر کرے۔ اپنے متعلق تمام تفصیلات سے پارٹی کو آگاہ کرے۔ دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ رکن جماعت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مستقل بنیادوں پر اپنی جماعت کو چندہ دے۔ چندہ لینے کا نظام پاکستان کی کسی بھی سیاسی جماعت میں نہیں ہے۔ یہ جماعتیں اپنے اندرون و بیرون ممالک حمایتیوں سے عطیات وصول کرتی ہیں۔ جماعت کا ٹکٹ لینے والے اس موقع پر جماعت کو عطیات دیتے ہیں۔ جو 1970 میں ہزار، دو ہزار روپے تک محدود ہوتے تھے لیکن اب ایک امیدوار اپنی جماعت کو ٹکٹ لیتے وقت 50 لاکھ تک چندہ دیتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں سیاسی جماعتوں کو عطیات دینے سے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اس کی دو مثالیں میں بیان کرنا چاہوں گا کہ جارج ڈبلیو بش نے اپنی دوسری مدت کے انتخابات کے دوران تیل کی ایک کمپنی سے ایک لاکھ ڈالر بطور عطیہ لیے تھے تاکہ وہ اس رقم کو اپنی انتخابی مہم پر خرچ کر سکے تو اسے اس جرم پر جوابدہ ہونا پڑا تھا۔ اسی طرح دو سال قبل جرمنی کے چانسلر نے عطیہ لیا تھا جس بنا پر اسے بھی عدالتوں کے سامنے جوابدہ ہونا پڑا تھا۔ عطیات لینے کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ دولت کی سیاست جنم لیتی ہے مطلب یہ کہ جس کے پاس دولت ہوگی صرف وہ ہی انتخابات میں حصہ لے سکے گا اور سیاست کر سکے گا اور دوسرا نقصان یہ ہے کہ کرپشن جنم لیتی ہے۔ منظور وٹو نے اپنی وزارت اعلیٰ کے دور میں مسلم اخبار کی سالگرہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ 1970 کے انتخابات میں ان کے 16,000 روپے خرچ ہوئے تھے مگر اب 50 لاکھ روپے خرچ ہو گئے ہیں۔ میں بھی اس وقت شرکاء میں موجود تھا۔ میں نے اٹھ کر سوال کیا کہ وٹو صاحب اگر یہ اسمبلی پانچ برس کا اپنا دورانیہ مکمل کرتی ہے تو آپ کی تنخواہ زیادہ سے زیادہ دس لاکھ روپے بنے گی۔ باقی 40 لاکھ کا نقصان آپ کیسے پورا کریں گے تو اس وقت پنجاب اسمبلی کے سپیکر حنیف رامے جو پروگرام کی صدارت کر رہے تھے نے جواب دیا کہ 40 لاکھ کا نقصان تو 15 دنوں میں پورا ہو سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب لوگ ٹکٹ لینے کے موقع پر جماعت کو عطیات دیتے ہیں تو اقتدار میں آ کر جی بھر کر کرپشن کرتے ہیں۔ ٹکٹ دینے کے موقع پر میں جب بھی پارٹی رہنماؤں سے اس طریقہ کار کو اختیار کرنے پر اعتراض کرتا ہوں تو میرا اعتراض مسترد کر دیا جاتا ہے۔ 1997 کے انتخابات کے موقع پر جس امیدوار کو ٹکٹ دینے کی میں نے مخالفت کی تو مجھے جواب ملا کہ ڈاکٹر صاحب اس آدمی نے چالیس لاکھ روپیہ بطور عطیہ جماعت کو دیا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور جس آدمی کو ٹکٹ دینے کی آپ سفارش کر رہے ہیں وہ انتخابات کے موقع پر ایک خیمہ لگانے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا۔ میں نے متعدد بڑے سیاسی رہنماؤں سے پوچھا کہ ان کی جماعت کے پاس کتنے فنڈز پڑے ہیں۔ یہ فنڈز کہاں سے آتے ہیں اور کہاں خرچ ہوتے ہیں اور ان تمام فنڈز کو خرچ کرنے کے اختیارات کس کے پاس ہیں۔ کسی بھی جماعت کے مرکزی رہنماؤں کو نہیں علم تھا کہ ان کی جماعت کے پاس اس وقت کتنے فنڈز ہیں اور انہیں خرچ کرنے کا اختیار یا چیکوں پر دستخط کرنے کا اختیار کس کے پاس ہے۔ شاید جماعت کے سربراہ کو ان تفصیلات کا علم ہو باقی کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ میرے خیال میں پارٹی کارکنوں سے چندہ لینے کا عمل سیاسی جماعتوں کے لیے بہت زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ ملک کی بڑی سیاسی جماعتیں مثلاً مسلم لیگ (ن) مسلم لیگ (ق) اور پیپلز پارٹی دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کے کارکنوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ فرض کریں کہ اگر ایک جماعت کے کارکن کروڑوں نہ ہوں بلکہ صرف بیس لاکھ ہوں اور ہر رکن فی مہینہ دو روپے فنڈ دے جو کہ ایک بے روزگار آدمی بھی دے سکتا ہے تو ہر مہینے جماعت کو 40 لاکھ روپیہ چندہ ملے گا اور سال کا چار کروڑ اسی لاکھ بنتا ہے۔ اور پانچ سال بعد انتخابات منعقد ہوتے ہیں تو ان کے پاس تقریباً 22 کروڑ بنتے ہیں اور انہیں کسی قسم کے عطیات لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب آپ اراکین جماعت سے چندہ نہیں لیتے تو آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ کی جماعت کے کتنے اراکین ہیں۔ یہاں تو اخبارات کے بیانات سے ہی پتہ چلتا ہے کہ فلاں آدمی اپنے لاکھوں حمایتیوں سمیت فلاں جماعت میں شامل ہو گیا ہے لیکن اس دعوے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ 1977 کے انتخابات سے قبل 1976 میں اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں کہ بلوچستان کے اتنے افراد پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ میں نے ان اخبارات کے اعداد و شمار اکٹھے کیے تو معلوم ہوا کہ جتنی تعداد بیان کی گئی تھی وہ بلوچستان کی کل آبادی سے تین گنا زیادہ تھی۔ میں نے 21 مئی کو نوائے وقت میں ''مجھے بلا لو یا خود آ جاؤ'' کے عنوان سے آرٹیکل لکھا اور اس غلط بیانی کو آشکار کیا۔

جماعت کے اراکین سازی میں ایک اور بنیادی اہمیت کی حامل چیز یہ ہے کہ جماعت کے رہنماؤں کا انتخاب ہونا چاہیے نہ کہ ان کی نامزدگی ہو۔ اوپر سے لے کر نچلی سطح تک تمام پارٹی رہنماؤں کا انتخاب ہونا چاہیے لیکن اس ملک میں کبھی بھی رہنما منتخب نہیں ہوتے بلکہ جماعتی عہدوں پر ان کی نامزدگی ہوتی ہے۔ کیونکہ جماعت کے کوئی باقاعدہ رجسٹرڈ شدہ اراکین ہی نہیں ہوتے جو اس سلسلے میں اپنے ووٹ ڈالیں اور اپنے جماعتی عہدیداران کا انتخاب کریں۔

اس کے بعد تنظیم سازی کا مسئلہ آتا ہے کہ جماعت کا ڈھانچہ کس نوعیت کا ہے۔ اس کی کتنی شاخیں ہیں اور ان شاخوں کے عہدیداروں کو ان کے متعلق فیصلہ سازی کا اختیار ہے یا نہیں۔ جماعت کے کتنے اور کون کون سے عہدیداران ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے اندر لامرکزیت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ لامرکزیت کی چار اقسام ہیں۔ پہلی قسم وفاقی لامرکزیت ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ وفاق کے یونٹوں میں قائم جماعت کی شاخوں اور یونٹوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی سطح پر فیصلہ سازی کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہو۔ایسا پاکستان میں کبھی بھی نہیں رہا کیونکہ فیصلہ سازی کا اختیار صرف مرکزی قیادت کے پاس ہوتا ہے اور وہی فیصلے کرتی ہے۔اس چیز کا پاکستان کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ 1970 کے انتخابات میں مشرقی پاکستان نے مشرقی بنگال میں ایک کے سوا تمام سیٹیں جیت لیں اور پی پی نے پنجاب اور سندھ میں اکثریت حاصل کی۔اس وقت مسلم لیگ ن صرف پنجاب تک محدود ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے مختلف حصے ایک دوسرے سے ثقافت، معاشرت، جغرافیہ اور معیشت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہیں۔سیاسی جماعت کی مرکزی قیادت ان وفاقی یونٹوں کے مسائل، عوام کی خواہشات اور ضروریات کو نہیں سمجھ سکتی۔ بلکہ جماعت کی صوبائی یا علاقائی شاخ ہی وہاں کے عوام کی ضروریات وامنگوں کو سمجھ کر ایک پالیسی اختیار کرسکتی ہے۔اگر ہماری سیاسی جماعتیں اپنے وفاقی یونٹوں کی شاخوں کو وہاں کی سطح سے متعلق پالیسی سازی کا حق دیں تو وہ جماعت حقیقی لحاظ سے ایک مرکزی سیاسی جماعت بنے گی اور جمہوریت کے استحکام میں مددگار ثابت ہوگی۔

دوسری قسم مقامی لامرکزیت ہے جس کا مطلب ہے کہ سیاسی جماعت اپنے مقامی عہدیداران کو اس بات کا اختیار دے کہ وہ مقامی سطح پر پائے جانے والے مسائل کے بارے میں پالیسی اختیار کرسکیں اور مرکزی قیادت اس پالیسی کو منظور کرے۔لامرکزیت کی تیسری قسم سماجی لامرکزیت ہے جس کا مطلب ہے کہ تمام سماجی طبقوں کو جماعت کے پالیسی ساز اداروں میں شامل کیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے طبقوں کے مفادات کا تحفظ اور ترجمانی کرسکیں۔ لامرکزیت کی چوتھی قسم نظریاتی لامرکزیت ہے جس سے مراد ہے کہ مختلف نظریاتی گروہوں کو سیاسی جماعت میں شامل کیا جائے اور ان کی آراء کا احترام کیا جائے۔پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں میں لامرکزیت کی ان چاروں اقسام میں سے ایک بھی شامل نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں جمہوریت کے فقدان کا شکار ہیں اور اسی وجہ سے وہ ملک میں جمہوریت کے فروغ میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتیں۔ جب تک کہ وہ اپنے اندر جمہوریت نہ لے آئیں۔

جمہوریت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔جمہوریت کی ایک تعریف جو ترقی یافتہ ممالک میں دوسری، تیسری کی جماعتوں میں پڑھائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ

"Government by the people,
of the people and for the people"

ہمارے ہاں بھی یہ تعریف رائج ہے مگر ہم نے اس کے ہجے تبدیل کردیئے ہیں ہم نے اسے ایسے کردیا ہے۔

"Government buy the people, off
the people and far the people".

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوریت کی دوسری تعریف ہے کہ جس میں آپ دوسروں کے اختلاف رائے کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ نہایت خوبصورت تعریف ہے کہ جس میں اختلاف رائے کو سنا جاتا ہے اور اہمیت دی جاتی ہے۔ جمہوریت کی تیسری تعریف یہ ہے کہ لوگوں کا کوئی حکمران نہ ہو اور وہ خود اپنے حکمران ہوں۔ ان تینوں تعریفوں میں سے ہمارے ہاں عملی لحاظ سے کوئی تعریف بھی رائج نہیں ہے۔ سیاسی جماعتیں ملک کے بنیادی معاملات و مسائل کے حوالے سے مثبت رائے عامہ پیدا کرتی ہیں۔ تاہم ہمارے ہاں تو یہ حال ہے کہ پی پی پی، ایم کیو ایم اور اے این پی کے علاوہ کسی بھی سیاسی جماعت کا دہشت گردی کے حوالے سے کوئی واضح نقطہ نظر نہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ عوام کے اندر اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے ایک رائے عامہ اور نقطہ نظر کیسے پیدا کریں گے۔ یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ دہشت گردی کو صرف عوام ہی شکست دے سکتے ہیں۔ فوج یہ کام نہیں کر سکتی۔ اگر فوج ایک علاقہ دہشت گردوں سے خالی کرلے گی تو اس کے جانے کے بعد وہ پھر وہاں آ جائیں گے۔ عوام کو قائل کرنے کی ضرورت ہے اور عوام کے اندر دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کا عزم اور ایک لائحہ عمل پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام صرف سیاسی جماعتیں ہی کرسکتی ہیں کہ وہ ملک کے عوام کی سیاسی تعلیم و تربیت کریں اور انہیں منظم کریں۔ سیاسی جماعتوں کو اپنی خامیوں کا بغور جائزہ لینا اور ان کے خاتمے کے لیے تگ و دو کرنی چاہیے۔ ملک میں موجود 162 سیاسی جماعتوں میں سے 60 سے زائد مذہبی جماعتیں اور گروہ ہیں اور تین یا چار کے علاوہ باقی تمام مذہبی جماعتیں اور گروہ جمہوری اور انتخابی طریقہ کار پر یقین نہیں رکھتیں۔ باقی جو یقین رکھتی ہیں ان میں سے متعدد سیاسی جماعتیں تانگہ جماعتیں ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ لاہور میں تانگے چلتے تھے اور تانگہ بان کو لائسنس بنوانا پڑتا تھا اور اسے اپنے سمیت پانچ سے زائد افراد تانگے پر بٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہماری کئی سیاسی جماعتوں کے پانچ سے زائد اراکین نہیں اس لیے وہ تانگہ جماعتیں ہیں اور کئی جماعتیں صرف ایک رکن پر مشتمل ہیں اور میڈیا ان ایک رکنی جماعتوں کے سربراہوں کو میڈیا پر گفتگو کرنے کا سب سے زیادہ موقع دیتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں۔ میڈیا کو بھی اس سلسلے میں مثبت کردار ادا کرنا چاہیے۔ ہماری موجودہ حکومت جو یہ کہتی ہے کہ ملک میں جمہوریت اور 1973 کا آئین بحال ہو گیا ہے میرا اس بات سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ جب تک آئین سے آٹھویں ترمیم کا خاتمہ نہیں ہوتا جو کہ ایک آمر نے کی تھی، اس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ 1973 کا آئین اپنی اصل روح میں بحال ہو گیا۔ علاوہ ازیں اور بھی متعدد ترامیم ہوئیں جن میں ذوالفقار علی بھٹو کی جانب سے کی گئی بعض ترامیم بھی شامل ہیں جنہیں آئین کی کتاب سے ہٹانے کی ضرورت ہے۔

تو مذکورہ بالا خامیوں کا سیاسی جماعتوں کو جائزہ لینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ صحیح معنوں میں جمہوریت کی بحالی اور استحکام میں کوئی کردار ادا کرسکیں۔ شکریہ

اس کے بعد شرکاء نے سوالات کئے اور ڈاکٹر مہدی حسن صاحب نے جو جوابات دیئے ان کی تفصیل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درج ذیل ہے۔

سوال۔ اگر فوج اقتدار میں آتی ہے تو کیا آج کی آزاد عدلیہ اس کی حمایت کرے گی اور اگر عدلیہ اس کا ساتھ نہ دے تو پھر فوجی حکومت کی قانونی حیثیت کیا ہوگی۔

جواب۔ فوج اگر اقتدار میں آئے تو اس کی حیثیت ہمیشہ غیر قانونی اور غیر آئینی ہوتی ہے۔ عدلیہ کے پاس اسے غیر آئینی قرار دینے کے اختیارات اس وقت تک نہیں ہوتے جب تک عدلیہ کو سیاسی جماعتوں اور عوام کی حمایت حاصل نہ ہو۔

سوال۔ پاکستان کے آئین میں بلتستان کا لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ لیکن پاکستان کی افسر شاہی اور سیاسی جماعتیں وہاں کا نظام اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق چلا رہی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

جواب۔ بلتستان کا لفظ پاکستان کے آئین میں اس لیے شامل نہیں ہے کیونکہ بلتستان ایک متنازعہ علاقہ ہے اور اس کا کیس اقوام متحدہ میں زیر سماعت ہے۔ چونکہ ہر علاقے میں حکومتی نظام اور انتظامیہ کی موجودگی ضروری ہے اسی لیے بلتستان میں بھی انتظامیہ نظام حکومت چلا رہی ہے ہاں اگر انتظامیہ اچھی ہوگی تو وہاں اچھا نظام ونسق ہوگا اور اگر انتظامیہ بری ہوگی تو برا نظام ونسق ہوگا۔

سوال۔ بلتستان اور گلگت کو صدر پاکستان نے 7 ستمبر 2009 کو ایک حکم نامے کے ذریعے صوبائی حیثیت دے دی تھی۔ اس کی آئینی حیثیت کیا ہے؟

جواب۔ اگر بلتستان اور گلگت کے لوگوں کو اس حکم نامے سے اختلاف ہے تو انہیں اس کا اظہار ضرور کرنا چاہیے اور کم از کم اسمبلی سے ایک قرارداد ہی منظور کروالیں اس سلسلے میں۔ لیکن مرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر ایک علاقہ متنازعہ ہے اور پاکستان کے زیر کنٹرول ہے تو اسے انتظامی افسران کی بجائے منتخب نمائندوں کے ذریعے چلایا جاتا ہے تو یہ اچھی بات ہے۔

سوال۔ قرارداد مقاصد کے پاکستان کے جمہوری وسیاسی ماحول پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ کیا پارلیمنٹ کو فرد کے مذہب کا تعین کرنے کا اختیار حاصل ہے؟

جواب۔ ریاست وحکومت کو لوگوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنے کا ہرگز کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ قرارداد مقاصد ایک خاص مذہب کے حامل لوگوں کو دیگر لوگوں پر فوقیت دینے کے لیے لائی گئی اور اس کے پاکستان کے جمہوری وسیاسی ماحول پر شدید برے اثرات مرتب ہوئے۔

سوال۔ ہمارا موجودہ سیاسی نظام آدھے سے زیادہ مذہب کی بنیاد پر قائم ہے۔ کیا موجودہ پارلیمنٹ اس سلسلے میں کوئی قانون سازی کرسکتی ہے کہ لوگ ریاستی معاملات میں مذہب کو استعمال نہ کریں؟

جواب۔ موجودہ پارلیمنٹ میں یہ کام کرنے کی اہلیت نظر نہیں آتی۔ موجودہ سیاسی جماعتوں کے ایجنڈے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں یہ بات شامل نہیں ہے۔مگر میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔

سوال۔سیاسی جماعتیں معاشرے میں بنیادی مثبت تبدیلیاں لاسکتی ہیں۔ہمارے متعدد مسائل سیاسی جماعتوں کے پیدا کردہ ہیں۔کیا یہ ممکن ہے کہ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق پاکستان کی بڑی سیاسی جماعتوں کے مرکزی رہنماؤں کی تربیت کرے؟

جواب۔ہم نے بہت دفعہ انہیں مدعو کیا اور ان کی ورکشاپس کیں لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔اگر آپ اپنے علاقے کے سیاستدانوں کو مدعو کر سکتے ہیں تو ضرور کریں ہم بھی شریک ہوں گے اور اپنی بساط کے مطابق ان سے سیاسی و معاشرتی معاملات پر گفتگو کریں گے اور ان کی مشاورت کریں گے۔

سوال۔سیاسی جماعتوں میں فوج کا کیا کردار رہا ہے اور کیا یہ درست ہے کہ متعدد سیاسی جماعتیں فوج کی ہدایت کے مطابق کرتی ہیں۔

جواب۔یہ بات بالکل درست ہے کہ بیشتر سیاسی جماعتیں فوج نے خود بنائیں اور کئی ان کی ہدایات پر کام کرتی ہیں۔چند ایک سیاسی جماعتیں فوج سے متصادم رہی ہیں۔پیپلز پارٹی ہمیشہ فوج سے کشیدگی کی حالت میں رہی اور اس کے باعث فوج سے نقصان بھی کافی زیادہ اٹھایا۔

سوال۔کیا یہ جمہوریت ہے کہ ایک بے گناہ آدمی کو قتل کروا کے قاتل کو ہیرو قرار دیا جائے۔اور کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے؟

جواب۔یہ نہ تو جمہوری اصولوں کے مطابق ہے اور نہ ہی اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے۔ایک ماہ قبل ایک ٹی وی چینل نے جامعہ ازہر کے تین پروفیسروں سے ٹیلی فون کے ذریعے میری بات کروائی اور جامعہ الذہر مذہب کے حوالے سے پوری اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔سلمان تاثیر والے واقعے پر ہی بات چیت ہوئی۔ان تینوں نے تین ایسی باتیں کیں جو یہاں کے مولوی کے لیے قابل غور ہیں۔ایک انہوں نے یہ کہا کہ اسلام کے فلسفہ کے مطابق سلمان تاثیر کے قاتل کو سر عام سزائے موت دی جائے۔دوسری بات یہ کہ حدیث کا استعمال پاکستان میں انتہائی قابل اعتراض ہے اور بیشتر من گھڑت احادیث بیان کردی جاتی ہیں۔تیسری بات انہوں نے یہ کی کہ فتوی دینے کے لیے ایک معیار مقرر کیا جائے اور ایک خاص طریقہ کار وضع کیا جائے۔

سوال۔یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک عام آدمی قومی یا صوبائی اسمبلی کا انتخاب جیت سکے؟

جواب۔آپ لوگوں کے درمیان جاکر ان کے مسائل سے آگہی حاصل کریں۔ان مسائل کا اصل حل بتائیں اور ان کی ہمدردیاں حاصل کریں۔لوگ آپ کو ووٹ بھی دیں گے اور انتخابی مہم چلانے کے لیے آپ کی مالی مدد بھی کریں گے۔ایسی مثالیں پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ میں ہمیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے خود غریب امیدواروں کو نہ صرف ووٹ دیے بلکہ ان کی مالی معاونت بھی کی تاکہ وہ انتخابات کا خرچ برداشت کرسکیں۔ویسے تو یہ فریضہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاسی جماعتوں کا ہے کہ وہ اپنے غریب امیدواروں کا انتخابی خرچہ برداشت کریں۔

سوال۔ پاکستان میں اس نظام سے جان کب چھوٹے گی؟

جواب۔ بغیر کوشش کیے اس نظام سے جان نہیں چھوٹے گی اور موجودہ سیاسی جماعتوں میں تو کوئی اہلیت نظر نہیں آتی کہ وہ ایک اچھا نظام متعارف کروائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انقلاب محض باتوں سے یا ٹیلیفون سے نہیں آتے بلکہ اس کے لیے صحیح سمت میں درست اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال۔ کیا ذوالفقار علی بھٹو کی جانب سے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دلوانا جائز تھا؟

جواب۔ یہ مکمل طور پر ایک امتیازی اور ناجائز اقدام تھا۔

سوال۔ سیاسی جماعتوں میں پائی جانے والی مذکورہ خامیوں کے باعث ہمیں کس سیاسی جماعت کی حمایت کرنی چاہیے اور جمہوریت کا مستقبل کیا ہے؟

جواب۔ جس جماعت میں کم خامیاں ہوں اور جو آپ کے خیالات کے قریب ہو اس کی حمایت کریں۔

(بشکریہ: جہد حق۔ مئی 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں آمریت کے مختلف ادوار۔ایک سرسری نظر

(ڈاکٹر مہدی حسن)

ریٹائرڈ چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف یورپ کے دس روزہ دورے کے دوران ناروے، سوئزرلینڈ، فرانس اور برطانیہ میں بہت شدومد کے ساتھ اپنے آٹھ سالہ دور حکومت کی کامیابیوں کے بارے میں مغربی لیڈروں اور بین الاقوامی میڈیا کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ان کوششوں میں کئی بار انہیں غصہ بھی آیا اوران کا لہجہ تلخ بھی ہوا،بعض لوگ تو یہ کہتے بھی سنے گئے کہ پرویز مشرف وینز ویلا کے صدر شاویز کے نقش قدم پر چل پڑے ہیں۔کیونکہ بہت سے موقعوں پر ان کے لہجے میں جھنجلاہٹ بھی واضح نظر آئی تھی۔انہوں نے اس دورے کے دوران زیادہ زور پاکستان کی اقتصادی ترقی اور عسکریت پسند مذہبی انتہا پسندوں کے خلاف اپنی پالیسی کی کامیابی اوراس مہم کی راہ میں درپیش رکاوٹوں کے بارے میں مغربی حکام اور میڈیا کو قائل کرنے پر دیا۔ انہیں یہ ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ تقریباً گزشتہ ایک سال سے تمام مغربی میڈیا اور امریکی انتظامیہ کے اہم کارندے مسلسل پاکستان کے بارے میں ایسے بیانات دے رہے ہیں جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان بطور ریاست کے ناکام ہو چکا ہے اور اس کا شیرازہ بکھرنے کے بعد مہلک ہتھیاروں کا ذخیرہ جس میں ایٹمی ہتھیار اور میزائل سسٹم بھی شامل ہے طالبان اور القاعدہ کے عسکریت پسندوں کے قبضے میں آجائے گا۔جنہیں یہ ''جہادی'' مغرب کے خلاف استعمال کریں گے۔امریکی حکام اور تجزیہ کار اس خدشے کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتے ہیں جیسے پاکستان نے اپنے ایٹم بم اور میزائل کسی الماری میں سجا کر رکھے ہوئے ہیں جس میں چین کا بنا ہوا تالا لگا کر اس کی چابیاں کسی فوجی میس یا دفتر میں کسی کھونٹی پر لٹکی ہوئی ہیں اور مولانا فضل الرحمان یا قاضی حسین احمد کے کچھ شاگرد''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگا کر الماری سے ایٹم بم نکال لیں گے، کندھوں پر میزائل رکھیں گے اور انہیں لے جا کر سوات میں فضل اللہ، قبائلی علاقے میں بیت اللہ محسود یا لال مسجد کے مولانا عبدالعزیز کی خدمت میں پیش کر دیں گے جو فوراً ایٹم بم میزائلوں پر نصب کر کے یورپ، امریکہ اور اسرائیل پر داغ دیں گے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان کے بارے میں ریاست کی کمزوری کے حوالے سے یہ تاثر کیوں پیدا کیا جا رہا ہے اس کا تجزیہ کرنے کے لیے پاکستان میں صدر پرویز مشرف کی ''بلاشرکت غیرے'' آٹھ سالہ حکومت کے حالات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ جب صدر پرویز مشرف اور ان کے ساتھی جرنیلوں نے نواز حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تھا اس وقت پاکستان کو اپنا ایٹمی تجربے کئے ایک سال ہوا تھا۔ پاکستان کی یہ کامیابی اہل مغرب کو بالکل پسند نہیں آئی تھی اور مغرب کے میڈیا نے پاکستان کے ایٹمی اسلحہ کو اسلامی بم کا نام دیا تھا۔ حالانکہ باقی ایٹمی طاقتوں کے اسلحہ کو کرسچن بم، کمیونسٹ بم، ہندو بم یا یہودی بم کا نام نہیں دیا حالانکہ اسلامی بم کی اصطلاح اس تضحیک یا طنز کو ظاہر کرتی ہے جو مغربی ممالک پاکستان کے بارے میں اکثر استعمال کرتے ہیں۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے 1974 میں ایٹمی اسلحہ کی اہلیت حاصل کرنے کی پالیسی کا اعلان کیا تھا تو اس وقت بھی مغرب کے بڑے اور اہم ملکوں خصوصاً امریکہ نے اس پر بہت واویلا کیا اور بھٹو پر بہت دباؤ ڈالا تھا کہ وہ اپنے اس ارادے سے باز رہے اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ کسنجر نے یہ دھمکی دی تھی کہ ''ہم تمہیں عبرت کا نشان بنا دیں گے'' اور آخر کار انہوں نے اپنے لاڈلے جنرل ضیاء الحق کے ذریعے نہ صرف بھٹو کا تختہ الٹ دیا بلکہ فوجی آمر کے ذریعے بھٹو کو پھانسی کے پھندے پر بھی لٹکایا۔ ضیاء الحق کی بدترین فوجی آمریت کے دوران پاکستان کے ایٹمی اثاثوں اور پاکستان کی کامیاب پیش رفت پر امریکہ یا اہل مغرب کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ حالانکہ جنرل ضیاء الحق سے بڑا مذہبی شدت پسند پاکستان نے ابھی تک کوئی پیدا نہیں کیا اور آج کی دنیا کے تمام بڑے شدت پسند اور دہشت گرد اسامہ سے لے کر عبدالعزیز تک اس کے شاگرد ہیں جنہیں امریکی منصوبہ سازوں کے ساتھ مل کر ضیاء الحق نے تیار کیا تھا۔

صدر پرویز مشرف کے 1999ء کے اقدام کو بین الاقوامی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی تھی اسی لیے انہوں نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی بجائے ''چیف ایگزیکٹو آفیسر'' کا لقب اختیار کیا تھا حالانکہ یہ عہدہ ملکوں کے سربراہوں کا نہیں بلکہ کمپنیوں اور تجارتی اداروں کا ہوتا ہے۔ گیارہ ستمبر کے امریکہ میں دہشت گرد حملے کے ایک ماہ بعد امریکی جنگ پسندوں نے افغانستان پر فوج کشی کا فیصلہ کیا تو انہیں ایک بار پھر پاکستان کی مدد اور تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی، اس بار یہ مدد مذہبی انتہا پسندوں کو ختم کرنے کے لیے درکار تھی جنہیں خود امریکہ نے پاکستان کی فوجی حکومت کی بھرپور مدد سے تیار کیا تھا اور انہیں یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ''فاتح کمیونزم'' ہیں۔ مذہبی انتہا پسند تیار کرتے وقت بھی پاکستان میں فوج برسراقتدار تھی اور انہیں ختم کرنے کی کوشش کے وقت بھی اقتدار فوج کے پاس تھا۔ دونوں موقعوں پر پاکستان کے عوام ان فیصلوں میں شامل نہیں تھے۔ تاہم ان دونوں موقعوں پر امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ملکوں کو پاکستان میں جمہوریت نہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا جیسے ان جمہوریت کے دل دادہ ممالک کو مشرق وسطیٰ کی بادشاہتوں اور امارتوں پر کوئی تکلیف نہیں ہے۔ وہاں انہیں صرف صدام حسین کی آمریت ناگوار گزرتی تھی جبکہ ایران کا بادشاہ رضا شاہ پہلوی ان کا سب سے لاڈلا حکمران تھا۔ پانچ سال تک صدر پرویز مشرف بھی اہل مغرب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خصوصاً امریکی انتظامیہ کی آنکھوں کا تارا بنے رہے اور باوجود اس کے کہ وہ پاکستان کے تمام فیصلے خود اکیلے جی ایچ کیو میں بیٹھ کر کرتے تھے ان کے طرز حکومت پر کسی مغربی مبصر کو اعتراض نہیں ہوا۔ پاکستان کے عوام نے امریکہ کی بالادستی قبول کرتے ہوئے مشرف انتظامیہ کی پالیسیوں کی بہت بھاری قیمت ادا کی ہے۔ طالبان نے جو پاکستان کے بہت دوست اور پاکستانی فوج کے اتحادی تھے، امریکہ کا سب سے اہم اتحادی ہونے کی وجہ سے پاکستان کو اپنا اول ہدف قرار دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالبان کے ''سیکنڈ ہوم'' قبائلی علاقے سے لے کر بڑے شہروں کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور، سرگودھا اور اسلام آباد تک ان کے نشانے پر آ گئے۔ اور عراق کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ دہشت گردی کے واقعات پاکستان میں رونما ہوئے جن کا سلسلہ جاری ہے۔ افغانستان میں امریکہ اور نیٹو افواج کی ناکامی اور عراق میں امریکہ کی ویتنام سٹائل ہزیمت نے جب امریکی رائے عامہ کو بش انتظامیہ کے خلاف کر دیا اور صدر بش کی ''مقبولیت'' کا گراف بہت زیادہ گر گیا تو امریکی منصوبہ سازوں نے بش انتظامیہ کی ناکامی کا ذمہ دار صدر پرویز مشرف کو قرار دیا اور بالکل اسی انداز میں پاکستان کے قبائلی علاقوں میں فوج کشی کی خواہش بلکہ دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ جس طرح انہوں نے عراق پر مہلک ہتھیاروں کا بہانہ بنا کر اور افغانستان پر اسامہ بن لادن کا نام لے کر حملہ کیا تھا۔

صدر پرویز مشرف تنہا حکومت کرتے کرتے اپنے مشیروں کی غلط فہمیوں کی وجہ سے تیزی سے غیر مقبول ہوتے گئے، سوئی گیس فیلڈ میں رونما ہونے والے ڈاکٹر شازیہ خالد کیس میں دخل اندازی سے لے کر 9 مارچ 2007ء کو چیف جسٹس کو برخواست کرنے تک انہوں نے متعدد ایسے اقدامات کئے جن کے نتیجے میں انہیں 3 نومبر 2007ء کو ایک بار پھر آئین معطل کر کے ججوں کو فارغ اور میڈیا کو پابند کرنا پڑا۔ اس تمام عرصے میں انہیں اپنے لیے بنائی گئی ایک سیاسی پارٹی کی طرف سے کسی قسم کی مدد میسر نہیں ہوئی کیونکہ موقع پرست سیاستدانوں کے اس گروہ میں اتنی سیاسی اہلیت ہی نہیں تھی۔ اس جماعت کی حمایت صرف جنرل کی وردی کے قصیدے پڑھنے تک محدود رہی اور آدھی درجن وزیروں اور دو وزرائے اعلیٰ کی وردی کی گردان کے باوجود انہیں بادل نخواستہ وردی اتارنا پڑی۔ پرویز مشرف اور ان کے ممدوح بش کی غیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے مغربی میڈیا اور منصوبہ سازوں نے اپنے پروگرام کی کامیابی کے لیے نئے اتحادی ڈھونڈنے کی پالیسی کے تحت بے نظیر بھٹو پر اپنی توجہ مبذول کی اور انہیں پرویز مشرف کا متبادل بنا کر پیش کیا امریکہ کی یہی حمایت بے نظیر بھٹو کی شہادت کا سبب بنی۔ اب پرویز مشرف پر مغرب کا سب سے بڑا اعتراض جمہوریت کی بحالی میں ناکامی ہے۔ اس کے جواب میں پرویز مشرف نے ریٹائرمنٹ کے باوجود مخصوص جرنیلی لہجے میں مغربی جمہوری معاشرے میں یہ اعلان کیا کہ مغرب میں جمہوریت پھلنے پھولنے میں دو سو سال سے زائد کا عرصہ لگا ہے۔ پاکستان میں ساٹھ سال میں جمہوریت کیسے آ سکتی ہے۔ چنانچہ پرویز مشرف کا یہ بیان پاکستان کے عوام کی توہین پر مبنی ہے۔ پرویز مشرف یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں ان سے پہلے کوئی مخلص حکمران نہیں آیا اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان نے اپنی قومی زندگی کی ابتداء 12 اکتوبر 1999 کو کی تھی جبکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے جسے قائداعظم ''مسلم انڈیا'' کہتے تھے محمد علی جناح کی زیر سرکردگی ایک کامیاب جمہوری تحریک کے ذریعے سے پاکستان حاصل کیا تھا۔ پاکستان کی تخلیق کسی جرنیل نے فوج کشی کے ذریعے سے نہیں کی تھی۔ دوسری تاریخی حقیقت یہ ہے کہ بھارت جس کی جمہوریت کو تمام دنیا تسلیم کرتی ہے ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا تھا یہ دونوں ممالک آزادی سے قبل ایک ہی آقا کے غلام تھے اور آزادی کے بعد ہمیں یکساں مواقع میسر آئے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بھارت میں کسی غلام محمد، کسی میجر جنرل سکندر مرزا، جنرل ایوب خان، جنرل یحییٰ، جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف نے غیر آئینی طور پر اقتدار حاصل نہیں کیا۔ ان کے کسی جرنیل نے یہ نہیں کہا کہ ''آئین کیا ہوتا ہے۔ اٹھارہ صفحے کا ایک پمفلٹ ہے جسے میں جب چاہوں پھاڑ کر پھینک دوں''۔ وہاں کسی جرنیل نے کبھی یہ بیان نہیں دیا کہ ''فلاں سیاستدان کو فوج سخت ناپسند کرتی ہے''۔ پاکستان میں جمہوریت اس لیے نہیں آسکی کہ یہاں ساٹھ سال میں سے چونتیس سال فوج نے براہ راست حکومت کی ہے اور فوج اپنی ساخت، تنظیم اور مزاج کے علاوہ تربیت کے تحفظ سے جمہوریت یا سیاسی سوجھ بوجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ لہذا جب کوئی جرنیل اقتدار پر قبضہ کرتا ہے تو وہ سب سے پہلے سیاست، سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں کو مغلوب کرتا ہے۔ پھر یہ اعلان کرتا ہے کہ پاکستان کے عوام بھی جمہوری نظام کی اہلیت نہیں رکھتے، لہٰذا کبھی انہیں ایوب خان کی ''بنیادی جمہوریت'' کی تربیت گاہ مہیا کی جاتی ہے۔ کبھی یحییٰ خان کا ''وفاقی اسلامی آئین'' انہیں پیش کیا جاتا ہے جو آدھا ملک جنگ میں ہار جانے کے بعد دینے کی کوشش کی جاتی ہے تو کبھی انہیں یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ اسلام میں سیاست اور سیاسی جماعتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا انہیں ضیاء دور میں مجلسِ شوریٰ، غیر جماعتی انتخاب اور جہادی گروپوں کے ذریعے ''اسلامی جمہوریت'' سکھائی جاتی ہے۔ ان تین مختلف جرنیلی جمہوری تجربوں کے بعد آج کل عوام ''پائیدار جمہوریت'' کے تجربے سے گزر رہے ہیں۔ جس میں کئی درجن جج نظر بند ہوتے ہیں اور صدر مملکت یہ اعلان کرتے ہیں کہ آئندہ منتخب حکومت کو میری پالیسیوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ اگر یہی پائیدار جمہوریت ہے تو یقیناً پاکستان کو ایک جمہوری ملک بننے میں دو سو سال کا عرصہ درکار ہے اور اگر پاکستان کی سیاست میں جرنیل موقع پرستوں کو اسی طرح گلے لگاتے رہے تو پھر یہ عرصہ دو سو سال سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔

(بشکریہ: روزنامہ وقت 28 جنوری 2008)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بجٹ میں انسانی حقوق کے لیے مختص شدہ رقم۔ایک جائزہ

(ڈاکٹر پرویز طاہر، ڈاکٹر نادیہ طاہر)

تعارف

انسانی حقوق کے تناظر سے ملکی معیشت کی نگرانی پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے ایجنڈے میں سرفہرست ہے۔ بجٹ معاشی و معاشرتی سطح پر سرکاری پالیسیوں اور منصوبوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ مختلف شعبوں کے لیے مصارف کی تخصیص سے حقیقی معنوں میں معلوم ہوتا ہے کہ ریاست قومی سلامتی (National Security) کے پہلو کو کتنا کم اہم قرار دیتی ہے اور انسانی تحفظ (Human Security) کے پہلو کو کتنا زیادہ اہمیت کا حامل سمجھتی ہے۔ پاکستان جیسے وفاق میں، وفاقی اور صوبائی بجٹوں کا مجموعی جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ایک جامع نکتہ نظر قائم کیا جاسکے۔ آئین میں اٹھارویں ترمیم کے باعث صوبوں کو اختیارات کی منتقلی کے بعد یہ کام زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ وفاقی اور صوبائی بجٹ 2012-2011 سترہ (17) وفاقی وزارتوں کی صوبوں کو منتقلی کے بعد منظور ہونے والے پہلے بجٹ ہیں۔ متعدد ڈونر فنڈ ڈ منصوبوں کے نفاذ کے باوجود، صنفی بنیادوں پر بجٹ کا تجزیہ کرنا ایک ادھورا خواب ہی ہے۔ خواتین، بچوں، پسماندہ اور پسے ہوئے طبقوں کے لیے تخصیص شدہ مصارف کو الگ الگ کر کے دیکھنا مشکل کام ہے۔

انسانی تحفظ

وفاقی بجٹ میں قومی سلامتی اور قرضہ جات کی واپسی کو توجہ کا مرکز بنانے کا سلسلہ جاری ہے۔ انسانی تحفظ میں عسکری اسلحہ جات کی بجائے انسانی زندگی اور وقار کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر بچے بامقصد تعلیم کے حصول کے لیے سکول جانے کی بجائے مرتے رہیں، بیماری کا خاتمہ نہ کیا جائے، بے روزگاری عام ہو، غذائی قلت اور غربت شدید نوعیت اختیار کر جائے، لسانی اور فرقہ وارانہ تشدد شدت اختیار کر جائے تو اس صورت میں انسانی تحفظ مفقود

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوجاتا ہے۔انسانی ترقی کی رپورٹ (HumanDevelopment Report1994) میں انسانی تحفظ کا مطلب ''خوف اور احتیاج سے نجات'' قرار دیا گیا ہے۔اس میں ''بھوک، بیماری اور دباؤ سے تحفظ، نیز روزمرہ معمولات زندگی میں اچانک اور نقصان دہ خلل اندازی سے تحفظ بھی شامل ہے...... چاہے وہ خلل گھروں میں، ملازمتوں میں یا معاشروں میں وقوع پذیر ہو''۔

وفاقی بجٹ 2012-2011 میں 495.2 روپے دفاع کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔اس سرکاری تعریف میں صرف دفاع ڈویژن اور دفاعی سروسز کے منظور شدہ مطالبات شامل ہیں۔درحقیقت دفاعی مصارف میں متعدد ادائیگیاں شامل ہوتی ہیں۔پہلی مد میں وزارت دفاع کی جانب سے ایئرپورٹ سکیورٹی فورس، موسمیات، پاکستان سروے، فوجی چھاؤنیوں میں وفاقی تعلیمی اداروں کے مصارف اور دفاع ڈویژن اور فوجی چھاؤنیوں میں وفاقی تعلیمی اداروں کے ترقیاتی مصارف آجاتے ہیں۔ان اضافہ جات کے ساتھ دفاعی بجٹ 505.7 ارب روپے تک چلا جاتا ہے۔دوئم یہ کہ دفاعی پیداوار ڈویژن کے حالیہ اور ترقیاتی مصارف کی مد میں مزید 2 ارب روپے کا اضافہ ہوجاتا ہے۔سوئم، سال 2000 کے دفاعی بجٹ سے حاصل شدہ پنشن کی رقم 73.2 ارب روپے بنتی ہے۔ آخری بات یہ کہ تقریباً 1.1 ارب روپے وقتاً فوقتاً کے بجٹ اور فوج کے زیر کنٹرول یونیورسٹیوں کے 7 ترقیاتی منصوبوں کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ان اضاضہ جات کی بدولت دفاعی بجٹ 495.2 ارب سے بڑھ کر 582 ارب روپے بن جاتا ہے۔اطلاعات کے مطابق، بجٹ میں ہنگامی ذمہ داری کی مد میں رکھی جانے والی 150 ارب روپے کی رقم کو مسلح افواج کی ترقی کے منصوبے میں استعمال کیا جائے گا۔ایٹمی پروگرام اور خفیہ اداروں کے مصارف کی نشاندہی انتہائی مشکل کام ہے۔582 ارب روپے کا دفاعی بجٹ کل بجٹ کا اکیس فیصد اور وفاقی بورڈ آف ریونیو کی جانب سے جمع شدہ ریونیو کا 29.8 فیصد بنتا ہے۔دفاعی بجٹ جی ڈی پی کا 2.8 فیصد ہے۔یہ اتنے ہی جی ڈی پی کے حامل دیگر ممالک کے بجٹ سے بہت زیادہ ہے۔چنانچہ 582 ارب روپے کے سرکاری دفاعی بجٹ کے مقابلے میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی جانب سے تمام سوشل سیکٹر کے لیے 440 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔آخرالذکر، اولذکر کے مقابلے میں 24.3 فیصد کم بنتا ہے۔

قانون کی حکمرانی

پاکستان کے اندرونی امن عامہ کی صورتحال 9/11 کے واقعہ کے وقت سے بہت زیادہ خراب ہے۔فرقہ وارانہ کشیدگی پہلے ہی متشدد صورت اختیار کرچکی ہے۔جڑواں ٹاورز پر حملے اور نتیجتاً عراق اور افغانستان پر امریکی حملے نے ریاستی رٹ نہ ہونے کے بڑھتے ہوئے مسئلے کو مزید سنگین کردیا ہے۔نتیجے کے طور پر، اندرونی تحفظ اور امن عامہ کے مصارف میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔یہ مصارف وفاقی وصوبائی حکومتوں کے بجٹ 02-2001 کے بجٹ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں 31ارب روپے تھے مگر 12-2011 کے بجٹ میں 211.53ارب روپے تک پہنچ گئے ہیں۔حقیقی مصارف میں مزید اضافہ ہوگا جس طرح کہ 11-2010 میں ہوا تھا۔ 11-2010 میں 26-193ارب روپے کے تخصیص شدہ بجٹ کے مقابلے میں 205.31ارب ہوئے خرچ ہوئے تھے۔امن عامہ ایک صوبائی شعبہ ہے۔ 12-2011 میں تخصیص شدہ 211.53ارب روپے میں سے وفاقی حکومت نے اپنے بجٹ میں سے 59.21ارب روپے مختص کئے ہیں۔ باقی رقم صوبائی بجٹوں میں شامل کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ رقم 62.93ارب روپے پنجاب بجٹ میں مختص کی گئی ہے،اس کے بعد سندھ میں 37.94ارب روپے،خیبر پختونخواہ میں 21.88ارب روپے اور بلوچستان بجٹ میں 10.2ارب روپے مختص کی گئی ہے۔

امن عامہ کے ادارے اور حکام اندرونی تحفظ کو درپیش خطرات کا سدباب کرنے، مجرموں کو گرفتار کرنے اور عدالتوں میں ان کے خلاف باضابطہ مقدمات چلانے کے ذمہ دار ہیں۔ بالآخر جسٹس انتظامیہ کو یقینی بنانا ہوگا کہ مجرموں کو قانون کے مطابق سزا ملے۔جسٹس انتظامیہ کے مصارف دو ارب سے بڑھ کر 10-2009 میں گیارہ ارب ہوگئے۔وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے بجٹ 12-2011 میں کل 14.83ارب روپے مختص کئے گئے تھے، جبکہ استعمال بجٹ سے زیادہ یعنی 15.94ارب روپے ہوئے تھے۔ 12-2011 کے بجٹ میں مزید زیادہ رقم مختص کی گئی ہے۔ جس کی نکات دار تفصیل اس طرح ہے: وفاقی حکومت، 3.46ارب روپے؛ پنجاب، 8.25ارب روپے؛ سندھ، 3.89ارب روپے؛ خیبرپختونخواہ، 2.24ارب روپے اور بلوچستان 1.54ارب روپے۔

چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ قانون کی حکمرانی سے متعلقہ بجٹ مصارف میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ تاہم صرف رقم صرف کرنا ہی مسئلے کا حل نہیں ہے۔کمزور قانون کی حکمرانی کے نتیجے میں ہلاک شدگان، زخمیوں اور متاثرین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ٹارگٹ کلنگ، فرقہ وارانہ ہلاکتوں، خودکش بم دھماکوں، اغواء کاریوں، بنک ڈکیتیوں اور دیگر ڈکیتیوں کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔چند گرفتاریاں عمل میں لائی گئی ہیں تاہم گواہوں کی عدم موجودگی، برائے نام قانونی کارروائی اور عدالتوں کو درپیش دھمکیوں کے باعث بہت کم افراد کو سزائیں دی گئی ہیں۔

تعلیم

عالمی منشور برائے انسانی حقوق کے آرٹیکل 26 میں ہر انسان کے تعلیم کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے اور میثاق برائے معاشی، معاشرتی وثقافتی حقوق کے آرٹیکل 13 میں اسے مزید واضح کیا گیا ہے:

☆ پرائمری تعلیم تمام افراد کے لیے لازمی ہوگی اور انہیں مفت فراہم کی جائے گی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

☆ فنی اور تربیتی ثانوی تعلیم سمیت، ثانوی تعلیم کی تمام اقسام کو تمام افراد تک پہنچانے کے لیے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کئے جائیں گے بالخصوص بتدریج مفت تعلیم کے آغاز کے ذریعے۔

☆ تمام ممکنہ ذرائع، بالخصوص بتدریج مفت تعلیم کے آغاز کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کو صلاحیت اور برابری کی بنیاد پر تمام افراد کے لیے قابل رسائی بنایا جائے گا۔

آزادی کے 63 برس بعد 2010 میں پاکستانی آئین نے اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے تعلیم کے حق کو ایک بنیادی حق کا درجہ دیا ہے۔

تعلیم کے حق کو موثر بنانے کے لیے آئین میں آرٹیکل 26 (الف) شامل کیا گیا جس کے مطابق: ''ریاست قانون کے متعین شدہ طریقہ کار کے مطابق پانچ سے 16 برس کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی''۔ تعلیم ایک صوبائی شعبہ قرار دیا جا چکا ہے مگر وفاقی حکومت تعلیم کے شعبے میں صوبائی خودمختاری میں مداخلت کر رہی ہے۔ صوبے اب تعلیمی شعبے کے لیے مکمل طور پر ذمہ دار ہیں۔ وفاقی حکومت اب صرف اعلیٰ تعلیم اور بین الاقوامی طلباء کے تبادلے کے معیارات متعین کرنے تک محدود ہے۔ اعلیٰ تعلیم، نصاب، منصوبہ سازی اور پالیسی سازی اب صوبوں کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ پاکستان ایک کثیر الثقافتی ملک ہے۔

تعلیمی بجٹ کے سلسلے میں ایچ آر سی پی کے سفارش کردہ جی ڈی پی کی شرح فیصد میں اضافہ کرنے کی بجائے پہلے ہی مایوس کن مختص شدہ بجٹ میں مزید کمی کر دی گئی ہے۔ بین الاقوامی برادری کی سفارشات کی حمایت کرتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) تعلیمی شعبے کے لیے جی ڈی پی کا چار فیصد مختص کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ مالیاتی ذمہ داری اور قرضہ حد ایکٹ (ایف آر ڈی ایل) کے مطابق دس برسوں میں تعلیم پر صرف ہونے والے جی ڈی پی کی شرح فیصد دو فیصد ہونی چاہیے، جو 05-2004 کے 2.1 فیصد سے بڑھ کر 2014.15 میں 4.2 فیصد بن جاتا ہے۔ وفاقی حکومت کی اعلان شدہ تعلیمی پالیسی کے مطابق 2015 تک تعلیم کے لیے جی ڈی پی 7 فیصد بنتا ہے۔ ملکی تاریخ میں سب سے زیادہ 08-2007 میں تعلیم پر جی ڈی پی کا 2.4 فیصد مختص کیا گیا تھا۔ توقع تھی کہ انتقال اختیارات کے بعد ایک طرف جی ڈی پی کے مصارف کے غیر حقیقی اہداف کا احاطہ کیا جائے گا اور دوسری طرف اس میں مسلسل اضافے کو یقینی بنایا جائے گا۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ 11-2010 کے وفاقی اور صوبائی بجٹ میں تعلیم کے لیے مختص شدہ رقم جی ڈی پی کا 1.02 فیصد بنتی ہے۔ مذکورہ سال کے نظر ثانی شدہ اندازوں میں یہ تعداد 0.9 فیصد ہو جاتی ہے۔ 12-2011 کے لیے کل مختص کردہ بجٹ، رقوم کی شرح فیصد کے حساب سے دیکھا جائے تو تعلیم کے لیے صرف 4 فیصد بجٹ مختص کیا گیا ہے۔ 11-2010 کے بجٹ میں کل مختص کردہ رقم 170.5 ارب روپے تھی مگر نظر ثانی شدہ مصارف میں یہ رقم 5.5 فیصد کم ہو گئی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

12-2011 کے بجٹ میں مختص کردہ رقم پہلے سے زیادہ یعنی 190.3 ارب روپے ہے مگر ماضی کی طرف حقیقی مصارف میں کمی آنے کا امکان ہے۔

اگرچہ اٹھارھویں ترمیم کے باعث پرائمری تعلیم کو مفت اور لازمی قرار دے کر ایک بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے مگر 12-2011 کے بجٹ میں پرائمری تعلیم کے لیے 31.26 ارب روپے اور ثانوی تعلیم کے لیے 49.19 روپے مختص کیے گئے ہیں جو مل کر بھی یونیورسیٹوں، کالجوں اور اداروں کے لیے مختص شدہ 194.37 ارب روپے سے کم رقم ہے۔ چنانچہ اعلیٰ تعلیم کو ترجیح دی گئی ہے۔ ان ترجیحات کے ساتھ 2015 تک پرائمری تعلیم سے متعلقہ ''ہزار سالہ ترقی کا ہدف'' دونا قابل رسائی ہے۔ بجٹ سازوں نے بہتر شاگرد۔ اساتذہ کی شرح، ہدایاتی وقت، سکھلائی کا بہتر مواد، اساتذہ کی تربیت کے معیار میں بہتری اور بہتر درسی کتابوں کے معاملے کو ماضی کی طرح نظر انداز کیا ہے۔ انتقال اختیارات کے باعث مزید موزوں نصاب اور مادری زبان کے استعمال کی اجازت ملنی چاہیے جو کہ پرائمری کی سطح پر سب سے موثر ذریعہ تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ صوبائی بجٹوں میں ان معاملات سے کنارہ کشی کی گئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے رقم درکار ہے، مگر معیاری منصوبہ سازی سے معیاری تعمیل سازی کی طرف جانے کی ضرورت ہے جس میں نہ صرف داخلوں یا عمارات کو بلکہ طلباء، تدریسی عمل، اساتذہ کی تربیت اور فیکلٹی ریسرچ صلاحیت کے فروغ کو توجہ کا مرکز بنایا جائے۔ اعلیٰ تعلیم انتخابی اور استحقاق پر مبنی ہونی چاہیے اور اس کے اخراجات برداشت نہ کرنے والوں کو ریاستی معاونت ملنی چاہیے۔ مقدار کی پیمائش اور مبہم اخراجات متعین کرنے سے تعلیمی شعبے کو فائدے کی بجائے نقصان ہوا ہے۔ درحقیقت، پنجاب اور سندھ کے صوبائی بجٹ میں اب تعلیم کی بجائے امن عامہ کا شعبہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ بہتر نظم ونسق کے لیے بہتر تعلیم ضروری ہے، کیونکہ یہ نہ صرف اپنے حقوق بلکہ اپنے فرائض سے بھی بہرہ مند شہری پیدا کرتی ہے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سفارشات:

- ☆ تعلیم کے لیے کل ملکی پیداوار (جی ڈی پی) کا کم از کم چار فیصد بجٹ مختص کیا جائے
- ☆ لڑکیوں کے لیے نہ صرف سکولوں کی فراہمی کے انتظامات کیے جائیں بلکہ انہیں ایک محفوظ اور آرام دہ ماحول بھی فراہم کیا جائے
- ☆ پرائمری سکولوں میں پڑھائی کا ایک جامع ماڈل اپنایا جائے جس سے نہ صرف زیادہ داخلہ ہونے کے رجحان کو تقویت ملے بلکہ بچوں کا سکول میں ٹھہرنا بھی یقینی ہو جائے۔
- ☆ نصابی اصلاحات کے موضوع پر ایک بامعنی مذاکرے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔
- ☆ اعلیٰ تعلیم کو محض صاحب استطاعت افراد تک محدود ایک آسائش ہی نہ سمجھا جائے بلکہ مختلف شعبوں میں دانشوروں اور ماہرین کی ضرورت کو تسلیم کیا جائے اور قابل طلباء کو ریاستی معاونت فراہم کی جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صحت

عالمی منشور برائے انسانی حقوق (یو ڈی ایچ آر) کے آرٹیکل 25 (اے) کے مطابق ''ہر فرد کے پاس ایسے معیار زندگی کے حصول کا حق ہے جو اس کی اور اس کے اہل خانہ کی صحت اور خوشحالی کی ضمانت دے، بشمول......طبی امداد اور ضروری سماجی خدمات اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپے یا غیر کنٹرول حالات میں ذریعہ آمدن کی عدم موجودگی میں تحفظ کا حق''۔ پاکستانی آئین کے آرٹیکل 38 (اے) اور (ڈی) میں درج ہے ''کہ ریاست جنس، ذات، عقیدے اور نسل کے امتیازات سے بالاتر ہوکر عوام کی خوشحالی کو یقینی بنائے گی......جنس، ذات، عقیدے یا نسل کے امتیازات سے بالاتر ہوکر ایسے تمام شہریوں کو طبی امداد جیسی بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرے گی جو کمزوری، بیماری یا بے روزگاری کے باعث مستقل یا عارضی طور پر اپنی روزی کمانے کے قابل نہیں ہیں۔ انتقال اختیارات کے بعد، وفاقی وزارت صحت ختم ہوگئی ہے۔ صحت اب صوبائی شعبہ بن چکا ہے۔ جہاں تک وفاقی قانون سازی فہرست حصہ اول کا تعلق ہے تو وفاقی حکومت اب صرف بندرگاہ پر طبی قید کے معاملات تک محدود ہے۔ طبی پیشہ ور ماہرین کی ریگولیشن کو اب وفاقی فہرست، حصہ دوئم میں شامل کر دیا گیا ہے۔ متفقہ فہرست کے خاتمے کے باعث ادویات اور زہریلی ونقصان دہ ادویات، متعدی امراض یا انسانوں، جانوروں یا پودوں پر اثر انداز ہونے والے حشرات کی ایک صوبے سے دوسرے صوبے منتقلی کو روکنے اور ذہنی بیماری یا معذوری کے علاج معالجے کے مقامات سمیت ذہنی بیماری یا معذوری جیسے موضوعات صوبوں کے دائرہ اختیار میں ہیں۔ بیشتر منصوبے اور عوامی فلاح و بہبود کے معاملات اگرچہ صوبوں کو منتقل کر دیئے گئے ہیں، تاہم منتقلی کے متفقہ دور کے دوران منصوبہ بندی کمیشن کے بجٹ میں انہیں ظاہر کیا گیا ہے۔

12-2011 کے وفاقی وصوبائی حکومتوں کے بجٹ میں صحت کی کہانی تعلیم سے زیادہ تلخ ہے۔ 11-2010 کے بجٹ میں صحت کی مد میں کل خام ملکی پیداوار (جی ڈی پی) کا 0.55 فیصد مختص کیا گیا تھا۔ نظر ثانی شدہ تخمینہ جی ڈی پی کا 0.51 فیصد تھا۔ 12-2011 کے بجٹ میں اس سے بھی کم یعنی جی ڈی پی کا 0.42 فیصد صحت کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ مالیاتی ذمہ داری اور قرضہ حد (ایف آر ڈی ایل) ایکٹ 2005 کے تحت، یہ شرح 05-2004 میں 0.6 فیصد جی ڈی پی سے 14-2013 تک 1.2 فیصد جی ڈی پی ہونی چاہیے۔ یہ ہدف کسی بھی صورت پورا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے بجٹ 12-2011 میں صحت کا حصہ 2.03 فیصد ہے جو کہ گزشتہ بجٹ 2.22 فیصد اور 11-2010 کے نظر ثانی شدہ اندازوں 2.16 فیصد سے کم ہے۔ صحت کے وسائل میں اضافہ جو کہ ایچ آر سی پی کا مطالبہ تھا کی بجائے ان میں کمی واقع ہوئی ہے۔ صحت کو بنیادی حق تسلیم کرنے کی جانب کوئی پیش رفت نہیں ہورہی۔ 12-2011 کے بجٹ میں زیادہ تر رقوم بڑے ہسپتالوں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کلینکوں کے لیے مختص کی گئی ہیں۔ 95.69 ارب روپے کی کل رقم میں سے صرف 2.28 ارب روپے ماں و بچے کی صحت اور 10.34 ارب روپے انسدادی اور بنیادی صحت کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ بنیادی طبی سہولیات کی رسائی کے سلسلے میں دیہاتی، شہری تفاوت کو دور کرنے کی شعوری کوشش نظر نہیں آتی۔ ہنگامی طبی امداد کے منصوبے ابھی تک ڈیزاسٹر مینجمنٹ انتظامات کا بنیادی حصہ قرار نہیں دیے گئے۔ لوگ 2011 کے سیلاب کی تباہ کاریوں کا شکار ہیں، جبکہ 2010 کے سیلاب سے کوئی سبق نہیں سیکھا گیا۔ آبادی کے منصوبے سمیت صحت کا صوبوں کو منتقل ہونے کے باعث امید کی جاتی ہے کہ دونوں مربوط ہو کر بار تخلیقی صحت کی سہولت فراہم کریں گے۔ بجٹ اس سمت کوئی رہنمائی نہیں کرتے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سفارشات:

☆ پاکستان میں صحت کی مد میں ہمیشہ کم وسائل مختص کیے گئے ہیں۔ صحت کو ایک بنیادی حق تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس روش کو ترک کیا جائے۔

☆ طبی سہولیات کے معیار کے سلسلے میں دیہاتی، شہری تفاوت کا خاتمہ کرنا چاہیے۔

☆ خواتین اور بچوں کی طبی ضروریات کو ترجیح دینے کے پختہ عزم کا اظہار کیا جائے۔

☆ 2010 کے سیلاب سے سبق سیکھتے ہوئے ڈیزاسٹر مینجمنٹ مینوئل میں ہنگامی طبی امداد کے منصوبوں کو بھی شامل کیا جائے۔

☆ آبادی کی منصوبہ سازی کو صحت کے نظام سے بھی مربوط کیا جائے۔

اقامت کاری

پاکستانی آئین کے آرٹیکل 38 (اے) میں درج ہے کہ ''ریاست لوگوں کی خوشحالی کو یقینی بنائے گی'' اور مذکورہ آرٹیکل کی شق (ڈی) کے مطابق ''جنس، ذات، عقیدے اور نسل جیسے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایسے تمام افراد کو خوراک، لباس، اقامت کاری، تعلیم اور طبی امداد فراہم کرے گی جو کمزوری، بیماری یا بے روزگاری کے باعث مستقل یا عارضی طور پر اپنی روزی کمانے کے قابل نہیں ہیں''۔

عالمی منشور برائے انسانی حقوق کے آرٹیکل 25(ا) کے مطابق: ''ہر فرد کے پاس ایسے معیار زندگی کے حصول کا حق ہے جو اس کی اور اس کے اہل خانہ کی صحت اور خوشحالی کے لیے موزوں ہو...... بشمول اقامت کاری کی سہولت......''

بین الاقوامی میثاق برائے معاشی، معاشرتی و ثقافتی حقوق کے آرٹیکل (الف) کے مطابق ''ہر فرد کے پاس اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لیے اچھے معیار زندگی کے حصول کا حق ہے جس میں مناسب خوراک، لباس،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقامت کاری اور زندہ رہنے کے حالات میں مسلسل بہتری کا حق شامل ہے''۔

پاکستان میں اقامت گاہوں کی قلت اسی لاکھ تک پہنچ چکی ہے اور اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس اندازے میں دیہاتی علاقے میں اقامت گاہوں کی قلت شامل نہیں ہے۔ 02-2001 سے آٹھ سالوں میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے کم خرچ اقامت گاہوں پر کل 2.51 ارب روپے خرچ کیے ہیں۔ نویں برس، یعنی 10-2009 میں بجٹی رقوم 4.7 ارب روپے مختص کی گئیں جس سے ملک میں جمہوری حکومتوں کی آمد کا اشارہ ملا۔ البتہ حقیقی مصارف 1.8 ارب روپے تھے۔ یہ رجحان حالیہ بجٹوں میں بھی جاری رہا۔ 2.94 ارب روپے کی رقم 11-2010 کے بجٹ میں مختص کی گئی تھی، مگر حقیقی مصارف تخصیص شدہ رقوم سے تقریباً ایک ارب کم یعنی 1.92 ارب روپے تھے۔ 12-2011 کے بجٹ میں 2.55 ارب روپے مختص کیے گئے جو کہ گزشتہ بجٹ سے کم ہیں۔ وفاقی حکومت نے کم آمدنی والے افراد کے لیے وزیر اعظم کے ایک لاکھ مکانات والے پروگرام کا اعلان کیا۔ 12-2011 کے بجٹ میں مختص شدہ رقم مایوس کن ہے، باوجود سالانہ منصوبہ 12-2011 میں کیے گئے دعوے کے کہ سکیم پر فوری بنیادوں پر عملدرآمد کیا جائے گا۔ پنجاب میں کم آمدنی والے افراد کے لیے آشیانہ ہاؤسنگ پراجیکٹ، بے گھر والوں کے لیے تین مرلہ ہاؤسنگ سکیم اور کم و متوسط آمدنی والوں کے لیے علاقہ ترقیاتی سکیم کا اجراء کیا گیا ہے۔ مختص شدہ رقم بہت کم ہے اور بہت کم استعمال میں لائی گئی ہے۔ مثلاً بجٹ 11-2010 میں 1.87 ارب روپے مختص کیے گئے، مگر صرف 23 فیصد رقم استعمال میں لائی گئی۔ 12-2011 میں 1.37 ارب روپے مختص کیے گئے جو کہ گزشتہ بجٹ سے کم رقم ہے۔ سندھ اور خیبر پختونخواہ میں مختص شدہ رقوم مایوس کن حد تک کم ہیں۔ خیبر پختونخواہ حکومت ہاؤسنگ سکیموں کے لیے ایک اراضی بینک تشکیل دینے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ بلوچستان نے بجٹ 11-2010 میں 0.53 ارب روپے مختص کیے، مگر مصارف اس سے دوگنا یعنی 1.18 ارب روپے تھے۔ بجٹ 11-2010 میں 1.11 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔

تمام آبادی کے لیے طویل المدتی ہاؤسنگ سکیموں کی بجائے، ناقص تجویز شدہ اور غیر موثر نفاذ شدہ مخصوص ہاؤسنگ سکیموں کا سلسلہ جاری ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن کے نئے فریم ورک برائے معاشی ترقی نے تجویز کیا ہے کہ اقامت گاہوں کی قلت کو نجی شعبے کے ذریعے پورا کیا جائے۔ دیہاتی علاقوں میں اقامت گاہوں کی قلت کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ شہروں میں عوامی استعمال کے لیے کھلے/سبز مقامات سکڑتے جا رہے ہیں۔ کرایہ داری قوانین نئے مسائل کا ازالہ کرنے میں ناکام ہیں۔ کچی آبادیوں کو باضابطہ کرنے کا سلسلہ ایک رواں پروگرام ہے۔ میزانیوں (Budgets) میں اس سلسلے میں ہونے والی پیش رفت کے متعلق کسی قسم کی معلومات نہیں ملتیں۔ تاہم 12-2011 میں اڑھائی لاکھ افراد کو اقامت گاہ فراہم کرنے کا ہدف ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سفارشات:

☆ حکومت کو چاہیے کہ وہ پورے ملک کے لیے اقامت کاری کے مسئلے کے حل کے لیے ایک طویل المدتی حکمت عملی ترتیب دے اور محض شہروں میں بعض مخصوص حلقوں کے لیے مکانات تعمیر کرنے پر توجہ صرف نہ کرے۔

☆ ملک بھر میں جھونپڑی آبادکاروں کے مسائل کا ازالہ کرنے اور غریب افراد کی اقامت کاری کی ضروریات کو پورا کرنے کے لے فوری طور پر ایک یکساں پالیسی تشکیل دی جائے۔

☆ عوامی استعمال کے لیے شہروں میں کھلے/سبز مقامات ہونے چاہئیں۔

☆ متضاد تعمیراتی ضوابط سے بچنے کے لیے، شہر کے تمام علاقوں کے لیے مربوط اور یکساں ضوابط تشکیل دینے کے لیے مرکزی اتھارٹی ہونی چاہیے۔

☆ سرمایہ کاری کے طور پر بڑے شہروں میں ہزاروں فلیٹ تعمیر کیے گئے ہیں اور ناقص کرایہ داری قوانین کے باعث خالی پڑے ہیں۔ان قوانین پر موثر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

ماحولیات

ماحولیاتی تحفظ اور قابل برداشت ترقی کے لیے تجویز شدہ قانونی ضوابط کے آرٹیکل 1,2,4 میں بیان کیا گیا ہے ''تمام انسانوں کے پاس اپنی صحت اور خوشحالی کے لیے موزوں ماحول کے حصول کا بنیادی حق ہے''۔

پاکستان کو متعدد ماحولیاتی مسائل کا سامنا ہے۔ان میں قدرتی وسائل سے ناقابل برداشت استفادہ اور بڑھتی ہوئی فضائی، آبی اور زمینی آلودگی شامل ہے۔ایک واضح ادارہ جاتی ڈھانچہ، پالیسی ضوابط، قوانین اور عدالتی ٹربیونلز تشکیل دیے گئے ہیں۔ان تمام کو موثر طریقے سے ماحولیاتی نظم ونسق کی شکل میں نافذ نہیں کیا گیا اور نہ ہی بجٹ میں ان کے لیے مالی وسائل مختص کئے گئے ہیں۔

عالمی بینک کے ایک تحقیقی سروے کے مطابق کاربن کے استعمال پر کم انحصار کر کے وسائل کے بہتر استعمال پر مشتمل ایک اچھی عالمی معیشت تشکیل دی جاسکتی ھے۔عالمی کل ملکی پیداوار (جی ڈی پی) کا دو فیصد زراعت، عمارات، توانائی، ماہی گیری، صنعتی پیداوار، سیاحت، نقل وحمل، پانی اور فضلہ ٹھکانے لگانے کے لیے مختص کیا گیا ہے۔نہ پاکستان اور نہ ہی دیگر ممالک مطلوبہ رقم صرف کرنے پر آمادہ ہیں۔پاکستان کم کاربن پر مشتمل معاشی ملک ھے مگر وسائل کا استعمال بہتر نہیں ہے۔ہمارے ہاں ماحولیاتی بوسیدگی کے مصارف جی ڈی پی کے 6 فیصد سے زیادہ ہیں۔تاہم اس کا ابھی تک ادراک نہیں کیا گیا کہ ماحولیاتی بوسیدگی کی قیمت پر حاصل کردہ معاشی فوائد برداشت نہیں کیے جاسکتے۔ضروری ادارہ جاتی ساز وسامان کی موجودگی اور ٹاسک فورسز برائے موسمی تبدیلی کے کام کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے باوجود سرکاری اہلکاروں اور فیصلہ سازوں نے موسمی تبدیلی اور ماحولیاتی بوسیدگی کے خطرات کے متعلق کبھی غور فکر نہیں کیا۔

بجٹ میں مختص وسائل اس رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں۔سی این جی کے استعمال کے علاوہ پاکستان ہزار سالہ ترقی کے ہدف 7...... ماحولیاتی استحکام کی ضمانت، کے سلسلے میں بہت پیچھے ہے۔اس ہدف میں جنگلاتی علاقہ کی ایک مخصوص حد، جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے محفوظ اراضی علاقہ، جی ڈی پی فی یونٹ برائے توانائی کا استعمال، صاف پانی اور صفائی کے وسائل تک رسائی شامل ہے۔وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے بجٹ 11-2010 میں ہزار سالہ ترقی ہدف 7 کے لیے 35.2 ارب روپے مختص کے گئے تھے،مگر صرف 31.8 ارب روپے استعمال کیے گئے۔ بجٹ 12-2011 میں یہ رقم بڑھا کر 37.2 ارب روپے کردی گئی ہے۔اٹھارہویں ترمیم کے نتیجے میں شعبہ ماحولیات صوبوں کو منتقل ہو گیا ہے۔انہیں انتقالی کے اس مسئلے سے اچھے طریقے سے نبٹنا ہوگا اور ساتویں قومی مالیاتی کمیشن کے تحت اپنے حصے میں قابل قدر اضافہ ہونے کے بعد انہیں اس شعبے میں بہت زیادہ وسائل مختص کرنے چاہئیں۔اگرچہ 37.2 ارب روپے کی کل رقم میں وفاقی فنڈنگ ایک چھوٹا سا جزو ہے، تاہم سندھ اور خیبر پختونخواہ نے اپنے بجٹ 11-2010 کی نسبت بجٹ 12-2011 میں کم رقم مختص کی ہے۔ 12-2011 میں پنجاب اور بلوچستان نے گزشتہ برس کی نسبت زیادہ رقم مختص کی ہے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سفارشات:

☆ حکومت کو ادراک کرنا چاہیے کہ ماحولیاتی بوسیدگی کی قیمت پر حاصل کردہ معاشی فوائد قابل قدر یا قابل برداشت نہیں ہوتے۔

☆ سرکاری اہلکاروں اور فیصلہ سازی کرنے والے تمام افراد کو ماحولیاتی تبدیلی اور ماحولیاتی ٹربیونلز، ماحولیاتی مجسٹریٹوں اور وفاقی و صوبائی اتھارٹیز برائے ماحولیاتی تحفظ (ای پی ایز) سمیت ماحولیاتی عدالتی نگران اداروں کو مستحکم کرنا چاہیے،انہیں سیاسی و بڑے تجارتی حلقوں کے دباؤ سے آزاد کیا جائے۔

☆ دنیا میں موجودہ زائد از ضرورت صرف پر قابو پانے کے لیے تمام معاشرتی طبقوں کو سادہ طرز زندگی کو فروغ دینا چاہیے۔

مہاجرین/اندرونی نقل مکانی/آفات

عالمی منشور برائے انسانی حقوق کے آرٹیکل ایک کے مطابق ''تمام انسان وقار اور حقوق کے اعتبار سے آزاد اور برابر ہیں۔انہیں عقل اور ضمیر ودیعت ہوا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کرنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہیے"۔

شدید بارشوں سے پیدا ہونے والے حالیہ سیلاب نے سندھ کو ڈبو دیا ہے اور لاکھوں افراد خوراک، طبی امداد اور رہائش گاہ کے متلاشی ہیں جس سے اس امر کی عکاسی ہوتی ہے کہ جولائی۔ستمبر 2010 میں آنے والے سیلاب سے سرکاری حکام نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ زلزلے، سیلاب، مہاجرین، اندرون نقل مکانی اور حالیہ پنجاب میں ڈینگی وباسمیت تمام مسائل حکام کے کنٹرول سے باہر ہیں۔2005 کے زلزلے کے بعد تشکیل ہونے والا پورا ڈیزاسٹر مینجمنٹ سٹرکچر غیر مستحکم ہے۔ انتہا پسندی کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کے نتیجے میں اندرون نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد کم ہوئی ہے مگر یہ اب بھی موجود ہیں۔ پاکستان میں تاحال رہائش پذیر 10 لاکھ افغان مہاجرین کی واپسی کی تاریخ میں 2012 تک توسیع کر دی گئی ہے۔

10-2009 کے وفاقی وصوبائی بجٹ میں قدرتی مصائب اور دیگر آفات کے لیے 11.1 ارب روپے مختص کیے گئے تھے۔ حقیقی مصارف مختص شدہ بجٹ سے 12.9 فیصد زیادہ، یعنی 12.5 ارب روپے تھے۔ اس سے اگلے سال (11-2010) کے بجٹ میں یہ رقم کم کر کے 5.01 ارب روپے کر دی گئی ہے۔ مالیاتی سال کے پہلے چوتھ میں آنے والے شدید سیلاب کے باعث اتنی کم رقم کی تخصیص کے غیر معقول فیصلے کی نشاندہی واضح ہوگئی ہے۔ بجٹ 12-2011 میں وہی غلطی دہرائی گئی اور صرف 8.04 ارب روپے مختص کیے گئے۔ متاثرہ صوبہ سندھ نے اپنے بجٹ 12-2011 میں صرف 0.28 ارب روپے مختص کیے ہیں، اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ گزشتہ برس حقیقی مصارف 10.4 ارب روپے تھے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سفارشات:

☆ ریاست کو یقینی بنانا چاہیے کہ افغان مہاجرین کی وطن واپسی رضا کارانہ ہو۔

☆ مہاجرین اور اندرون نقل مکانی کرنے والے افراد کی حفاظتی ضروریات اور امداد پر مناسب توجہ دی جائے۔ اس سلسلے میں ان کے مذہبی عقائد، عمر، جنس، کمزوری، یا جسمانی وذہنی معذوریوں کے باعث انہیں درپیش مشکلات کا خصوصی خیال رکھا جائے۔

☆ نقل مکانی کرنے والوں کے تحفظ اور معاونت، نیز اندرونی نقل مکانی کو روکنے کے لیے ایک جامع ڈھانچہ تشکیل دیا جائے۔

☆ آفات پر قابو پانے اور ان میں کمی لانے کے نظام میں بہتری لائی جائے۔

☆ نفاذ سازی کے ڈھانچے گاؤں کی سطح تک منتقل کیے جائیں تاکہ متاثرہ آبادی کو مدد فراہم کرنے کے لیے انتظامی امور اور نفاذ سازی کے کام میں بہتری آئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محنت

پاکستانی آئین کے متعدد آرٹیکلز مزدوروں کے حقوق سے متعلق ہیں۔ آرٹیکل 3 میں بیان ہے ''ریاست ہر قسم کے استحصال کے خاتمے اور ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق اور ہر ایک کو اس کے کام کے مطابق، جیسے بنیادی اصول کی بتدریج تکمیل کو یقینی بنائے گی''۔

آرٹیکل 11 (3-1) میں درج ہے، ''غلامی معدوم اور ممنوع ہے اور کوئی قانون اس کی کسی بھی شکل کو پاکستان میں رائج ہونے کی اجازت نہیں دے گا۔ تمام اقسام کی جبری مشقت اور انسانی سمگلنگ ممنوع ہے۔ 14 برس سے کم عمر کسی بھی بچے سے کسی فیکٹری یا کان میں یا کسی بھی جگہ کوئی پر خطر کام نہیں کروایا جائے گا''۔ آرٹیکل 7 (1) میں بیان ہے کہ ''پاکستان کے اقتدار اعلیٰ یا وقار، امن عامہ یا اخلاقیات کے تحفظ میں قانون کی جانب سے عائد کردہ مناسب پابندیوں کے تحت ہر شہری کو انجمنیں اور یونینیں قائم کرنے کا حق ہے''۔

آرٹیکل 37 (سی) میں لکھا گیا ہے ''ریاست کام کے سازگار اور انسانیت دوست حالات کار پیدا کرنے کا اہتمام کرے گی''۔

18 ویں ترمیم کے نتیجے میں محنت ایک صوبائی شعبہ بن چکا ہے اور اس سلسلے میں قوانین سازی کا اختیار صوبوں کو منتقل ہو گیا ہے۔

وفاقی بجٹ 12-2011 میں توانائی کو سب سے بڑی ترجیح قرار نہیں دیا گیا۔ اسے ذرائع نقل و حمل اور ابلاغ کے بعد رکھا گیا ہے۔ بجلی کی مد میں 4.45 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔ سالانہ منصوبہ 12-2011 میں تسلیم کیا گیا ہے کہ صنعتی پیداوار اور سروسز کے بڑھتے اہداف کے حصول کے لیے شعبہ توانائی میں بہت زیادہ وسائل صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ بجٹ میں واپڈا کے لیے 32.5 ارب روپے اور ایٹمی بجلی گھروں کے لیے 120.2 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔ منصوبے کے کل اخراجات 137 ارب روپے ہیں اور بقیہ رقم واپڈا اور پیپکو کو خود پیدا کرنا ہوگی۔ ان اداروں میں اصلاحات لانے والی تمام کوششیں ناکام ہو گئی ہیں۔ ان اداروں کے لیے ممکن نہیں کہ وہ مطلوبہ سطح تک وسائل خود پیدا کریں۔ پٹرولیم اور قدرتی وسائل کے لیے ایک ارب سے کم رقم مختص کی گئی ہے۔ یہ تمام طویل المدتی منصوبے ہیں۔ چنانچہ پیداواری شعبوں کی توانائی کی ضروریات کو پورا کرنے میں کچھ وقت لگے گا جو ملازمتوں کے لیے نیک شگون نہیں ہے۔ اصلاحات پر مبنی توانائی کے تحفظ اور سپلائی میں فوری اضافہ جات کرنے کی صلاحیت کے موثر استعمال پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔

کم از کم تنخواہ اور مزدوروں کی پنشن میں اضافہ ہوا ہے۔ تنخواہ 16.17 فیصد کے ساتھ 6000 سے 7000 روپے ہو گئی جو کہ گزشتہ تین برسوں کے دوگنے افراط زر کا ازالہ نہیں کر سکی۔ عالمی میثاق برائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشی، سماجی وثقافتی حقوق کے نفاذ کے لیے قانونی، انتظامی اور پالیسی ساز اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے، بالخصوص جب میثاق کی توثیق کے بعد بہت کچھ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوگئی ہے۔ ماسوائے حق تعلیم اور حصول معلومات کے اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے ہونے والی آئینی اصلاحات کے نتیجے میں معاشی، معاشرتی وثقافتی حقوق، پالیسی کے اصول والے باب سے بنیادی حقوق والے باب میں شامل نہیں کیے گئے۔ جبری اور بچگان مشقت پر معلومات ناقص ہیں اور اس ضمن میں اٹھائے جانے والے اقدامات ٹھوس پالیسی کی عکاسی نہیں کرتے۔ یونینوں کا موقف ہے کہ اٹھارہویں ترمیم کے تحت شعبہ محنت صوبوں کو منتقل ہونے سے مزدور تحریک اور مزدوروں کے فلاحی بندوبست منقسم ہونے کے خدشات ہیں۔ شعبہ محنت کی منتقلی پر عملدرآمد کرتے ہوئے خیال رکھا جائے کہ مزدوروں کے مفادات کو گزند نہ پہنچے۔ بجٹ 11-2010 میں وفاقی وصوبائی حکومتوں نے سماجی تحفظ اور سماجی بہبود کی مد میں 54.81 ارب روپے مختص کیے تھے۔ جن میں سے بہت کم یعنی 39.36 ارب روپے زیر استعمال لائے گئے۔ بجٹ 12-2011 میں 55.72 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں جن میں سے وفاقی حکومت نے 51.9 ارب روپے فراہم، جو زیادہ تر بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام سے متعلق ہیں۔ مزدوروں کی فلاح وبہبود کے پروگراموں پر بجٹ کے دائرہ کار سے باہر عملدرآمد کیا جارہا ہے۔ ان میں ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ انسٹی ٹیوٹ (ای او بی آئی) اور ورکرز ویلفیئر فنڈ (ڈبلیو ڈبلیو ایف) شامل ہیں جو اب صوبوں کو منتقل ہو چکے ہیں۔ ای او بی آئی کے تحت 10-2009 میں 590,246 مستحقین کو بڑھاپا پنشن، علالت پنشن، پسماندگان پنشن اور بڑھاپا گرانٹس فراہم کیا گیا۔ اسی طرح ورکرز ویلفیئر فنڈ کے تحت مزدوروں کے لیے رہائشی منصوبوں کو شروع کیا گیا اور مزدوروں کو تعلیم، تربیت، ہنر سازی، کارآموزی، شادی اور مرگ گرانٹ اور بعد از میٹرک وظائف جیسی سہولیات دینے جیسے فلاحی اقدامات اٹھائے گئے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سفارشات:

☆ مزدوروں کو ملازمتیں کھونے سے تحفظ دینے اور نتیجے میں پیدا ہونے والی بدامنی کے خاتمے کے لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ پیداواری شعبے کی توانائی کی ضروریات کو پورا کرنے کو سب سے پہلی ترجیح قرار دے تاکہ مزدوروں کو کام میں تعطل اور نتیجتاً آمدنی سے محرومی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

☆ مزدور معاشرے کے ان طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں جن پر افراط زر کا سب سے زیادہ برا اثر پڑتا ہے۔ نہ صرف بڑھتے ہوئے معاشی اخراجات کی مطابقت میں تنخواہیں متعین کرنے کا کوئی طریقہ تلاش کرنا چاہیے بلکہ حکومت کو یہ امر بھی یقینی بنانا چاہیے کہ کسی فرد کو سرکاری مقررہ کردہ کم از کم تنخواہ سے کم اجرت نہ ملے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

☆ میثاق برائے معاشی، سماجی وثقافتی حقوق کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے مطلوبہ قانون سازی کے عمل کو بھی جلداز جلد شروع کیا جائے۔

☆ جبری مشقت کے خاتمے کو ترجیح دی جائے اوراس ضمن میں نئی، قابل عمل حکمت عملیاں اختیار کی جائیں۔

☆ پاکستان میں ایک مضبوط ٹریڈ یونین تحریک کی ضرورت ہے اوراٹھارہویں ترمیم کی منظوری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مزدوروں کے خدشات کا ازالہ کرنے پر خصوصی توجہ صرف کی جائے۔

☆ حالیہ صورت حال کا جائزہ لینے اوراس کی مطابقت میں قانون سازی اور پالیسی سازی کرنے کے لیے ایک نیا بچگان مشقت سروے کرنا چاہیے۔

ماحصل

2010-11 میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے سماجی، معاشی اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے بجٹ 21.5 فیصد مختص کیا تھا۔ انہوں نے نظر ثانی شدہ تخمینوں میں کل 27.2 فیصد صرف کیا تھا۔ 2011-12 کے بجٹ میں اس سے بہت کم یعنی بجٹ کا 20.9 فیصد مختص کیا گیا ہے۔ یہ کل ملکی پیداوار (جی ڈی پی) کا 4.65 فیصد بنتا ہے جو کہ تعلیم اور صحت پر مطلوبہ مصارف سے کم رقم ہے۔ قبل از بجٹ معاشی نگرانی میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے امید ظاہر کی تھی کہ بجٹ میں حقوق کے لیے کم وسائل مختص کرنے کا ماضی کا سلسلہ ترک کر دیا جائے گا۔ تاہم، درحقیقت، کم وسائل مختص کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ دولتمندوں پر مناسب ٹیکس لاگو کرنے میں ناکامی، تحفظ پر بڑھتے ہوئے اخراجات، حکومتی فضول خرچیوں اور قرضے کے ناقابل برداشت بوجھ کے نتیجے میں مالیاتی میدان میں حقوق کے شعبے کو بہت کم جگہ مل رہی ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ 'جہد حق' جنوری 2012)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوریت، انسانی حقوق اور ترقی

(ڈاکٹر حسن عسکری رضوی)

جمہوریت ایسا نظام حکومت ہے جس کی سب سے زیادہ تعریف اور خواہش کی گئی ہے۔ ایشیا اور افریقہ کی زیادہ تر سیاسی جماعتیں اور حکومتیں جمہوریت کی علمبردار ہونے کا دعویٰ اور عام لوگوں کی فلاح و بہبود کا عہد کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ آمرانہ اور شخصی نظام ہائے حکومت بھی خود کو جمہوری اصولوں کی پاسداری کرنے والوں میں ظاہر کرنے کے لیے بعض جمہوری خد و خال اختیار کر لیتے ہیں۔

نظام حکومت کے طور پر جمہوریت کا ارتقاء ایک لمبے عرصے پر محیط ہے۔ اس کے بیشتر بنیادی عناصر نے بیسویں صدی میں ٹھوس شکل اختیار کی۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد کے دور کو نو آبادیوں کے خاتمے اور جمہوری اصولوں اور اقدار کے واضح اظہار کا دور سمجھا جاتا ہے۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد اقوام عالم کی جمہوریت اور انسانی حقوق میں دلچسپی زیادہ بڑھ گئی۔ جمہوریت کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں اور بعض اوقات، غیر جمہوری حکومتوں نے جمہوری اصولوں کی خود ساختہ تشریح کے ذریعے اپنے طرز حکومت کو جواز فراہم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود جمہوریت کی چند بنیادی خصوصیات ہیں جنہیں جمہوریت کی تمام تسلیم شدہ تعریفوں میں شامل کیا گیا ہے۔

جمہوریت کا نہایت خفیف تصور آزاد، منصفانہ اور کھلے عام انتخابات پر مشتمل انتخابی جمہوریت پر زور دیتا ہے۔ اس میں عالمگیر بالغ حق رائے دہی بھی شامل ہے۔ دوسری قسم میں مفصل فہرست یا جمہوریت کا جامع تصور ہے۔ اسے لبرل جمہوریت بھی کہتے ہیں جس میں شفاف، آزاد اور منصفانہ انتخابات کے علاوہ متعدد دیگر اقدار اور اصولوں پر بھی زور دیا گیا ہے۔

جمہوریت کی بنیادی خصوصیات:

لبرل جمہوریت کی بنیادی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:۔

1۔ باہمی متفقہ آئین کی حاکمیت جو دستور پسندی، قانون کی حکمرانی، تمام افراد کے لیے غیر امتیازی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مساوی شہریت اور مذہب، ذات، لسانی شناخت وجنس سے بالاتر، شہری اور سیاسی حقوق کی فراہمی کو یقینی بناتا ہے۔

2۔ تمام مقتدر افراد اور ریاستی ادارے ایک منتخب شدہ پارلیمان اور رائے دہندگان کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا ادارہ یا رہنما ایسا نہیں ہوگا جس کا اپنا حتمی دائرہ اختیار ہو جو منتخب شدہ پارلیمان سے بالاتر ہو۔

3۔ منتخب شدہ پارلیمان اور منتخب شدہ حکومت کی قیمت پر فوج اور افسر شاہی کی حمایت میں ادارہ جاتی عدم توازن قائم نہیں کیا جاسکتا۔ منتخب شدہ اداروں اور جمہوری طریق عمل کی فوقیت حقیقی جمہوریت کے لیے لازمی شرط ہے۔ فوج اور افسر شاہی ریاستی نظام کا حصہ ہیں اور فیصلہ سازی میں ان کی شمولیت اہمیت کی حامل ہے۔ البتہ، حتمی فیصلہ جمہوری منتخب شدہ قیادت کرے گی۔

4۔ ریاستی نظام میں بنیادی عہدوں پر براجمان تمام افراد کی جوابدہی کو یقینی بنانے کے لیے جمہوری نظام میں قدغنی توازن اقتدار (Checks and balances) کا ہونا ضروری ہے۔ جوابدہی کے آئینی وقانونی ضوابط ریاستی اداروں کے تسلط سے ماورا ہونے چاہئیں۔

5۔ ریاستی اور معاشرتی سطح پر تکثیریت پسندی اور رواداری کا ہونا ضروری ہے۔ شہری اور سیاسی آزادیوں کے ساتھ مربوط سیاسی، سماجی، لسانی اور مذہبی تکثیریت پر عملدر آمد اور اس کے فروغ کے لیے آئینی، قانونی اور سماجی انتظامات ہونے چاہئیں۔ جمہوریت خود مختار سماجی اور سیاسی سرگرمیوں سے مستحکم ہوتی ہے۔ جمہوریت کے استحکام کے لیے رضا کارانہ گروہی سرگرمیوں اور سول سوسائٹی کی معاونت کی ضرورت ہوتی ہے۔

6۔ سماجی ومعاشی پسماندگی اور محرومی جمہوریت پر برے اثرات مرتب کرتی ہے۔ چنانچہ عملی سطح پر سماجی ومعاشی مساوات کی اشد ضرورت ہے۔ ہر شہری کو اپنے معیار زندگی میں بہتری لانے کا موقع ملنا چاہیے۔

7۔ جمہوریت کا مطلب متنازعہ امور کو مشاورت اور مذاکرات کے ذریعے حل کرنے پر اتفاق کا اظہار ہے۔ آئین اور قانونی دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے مخالف فریقین کے مابین مفاہمت اور مذاکرات ضروری ہیں۔ خوف وہراس اور تشدد کے ذریعے آراء اور سیاسی ترجیحات کو تھوپنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

8۔ مختلف ذرائع کے ذریعے لوگوں کی معلومات تک آزادانہ رسائی ہو۔ اس سے مراد اظہار رائے، میڈیا اور انجمن سازی کی آزادی ہے۔ اہم پالیسی معاملات اور عوامی مفاد کے معاملات پر حکومت سے معلومات کے حصول کے انتظامات بھی ہونے چاہئیں۔

9۔ ذاتی یا گروہی تنازعات، ریاستی اداروں اور عہدیداروں کے مابین اختیارات کی کشمکش، ریاستی اور دیگر اداروں کے خلاف مختلف شکایات کے ازالے اور قانونی وآئینی دستاویزات کی تشریح کے لیے آزاد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عدلیہ کی ضرورت ہے۔تاہم، عدلیہ انتظامیہ اور پارلیمان کے دائرہ اختیار میں مداخلت نہیں کر سکتی۔

اگر ہم جمہوریت کو محدود نقطہ نظر سے دیکھیں اور اسے انتخابات کے انعقاد اور منتخب کردہ حکومت کے قیام تک محدود کریں، تو جمہوریت مستحکم ہوتی دکھائی دے گی۔مگر انتخابی جمہوریت، جمہوریت کا صرف ایک پہلو ہے۔یہ دیکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ ملک میں دو انتخابات کے انعقاد کے دوران والے دورانیے میں کیا ہوتا ہے۔اگر ہم جمہوریت کو ایک جامع طرز نظر سے دیکھیں اور دستور پسندی، شہری وسیاسی حقوق، قانون کی حکمرانی، غیر امتیازی مساوی شہریت، سماجی وثقافتی تکثیریت، مواقع کی برابری اور آزاد عدلیہ کو توجہ کا محور بنائیں تو متعدد حکومتیں حقیقی جمہوریت کے معیار پر پورا نہیں اترتیں۔

البتہ، جمہوریت ایک مسلسل طریق عمل ہے اور ہمیشہ سیدھی سمت میں سفر نہیں کرتا۔یہ سیدھی سمت میں آہستہ آہستہ سفر کرتا ہے، ایک مقام پر جا کر رک جاتا ہے یا الٹی سمت میں سفر کر سکتا ہے۔جمہوریت اور اس کے معیار کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں سیاسی نظام کی سمت پر توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔اگر یہ کم سے زیادہ جمہوریت کی طرف رواں ہو تو یہ ایک مثبت پیش رفت ہے اور اسے مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔یہاں تک کہ اگر جمہوریت مثالی حالت میں نہ ہو، اگر دستور پسندی، شہری وسیاسی حقوق اور قانون کی حکمرانی فروغ پا رہی ہو تو جمہوریت کا یہ سفر رواں رہنا چاہیے۔جمہوریت ایک مسلسل طریق عمل ہے جو کبھی رکنا نہیں چاہیے۔

جمہوریت اور انسانی حقوق:

جمہوریت اور انسانی حقوق لازم وملزم ہیں اور یہ ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ایک ایسے جمہوری سیاسی نظام کا تصور کرنا ممکن نہیں ہے جو اپنے شہریوں کے شہری وسیاسی حقوق کو یقینی نہ بنائے۔یہ حقوق جمہوری آئین میں بنیادی حقوق کے نام سے شامل کیے جاتے ہیں۔انسانی وقار اور بنیادی آزادیوں کے تصورات پر مبنی ان حقوق کی لمبی فہرست ہے۔اگر کسی ملک میں جمہوریت کے معیار کا تعین کرنا ہو تو اس کا بنیادی پیمانہ اس ملک میں انسانی حقوق کی حالت ہے۔اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ یہ حقوق لوگوں کو حقیقی معنوں میں دستیاب ہیں تو انسانی حقوق کے تین پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔اول، آئینی اور قانونی دستاویز میں لوگوں کو کس قسم کے حقوق دستیاب ہیں؟ دوئم، کیا لوگوں کے پاس ان حقوق سے مستفید ہونے کے مساوی مواقع موجود ہیں؟ شہری وسیاسی حقوق کے حوالے سے عملی حقائق کیا ہیں؟ کیا ریاست ان حقوق کے تحفظ اور فروغ کے قابل اور آمادہ ہے؟ ثالثاً، یہ حقوق عدالتوں کے ذریعے قابل رسائی ہونے چاہئیں اگر حکومت، سیاسی اور سماجی گروہوں یا افراد کی جانب سے حقوق کی پامالی ہو تو شہریوں اور ان کے گروہوں کے پاس عدالتی تلافی کا موقع ہونا چاہیے۔محض ریاست کے استبدادی قوانین اور اقدامات سے ہی شہری وسیاسی حقوق کو خطرات لاحق نہیں ہوتے۔افراد اور سماجی گروہ بھی غیر قانونی اقدامات، خوف وہراس اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشدد کا سہارا لے کر شہری وسیاسی حقوق کے لیے خطرے کا باعث بن سکتے ہیں۔ انتہا پسندانہ سیاسی اور نظریاتی مطمع نظر رکھنے والے گروہ، اپنے سے اختلاف رائے رکھنے والوں کی طرف رُخ کرتے ہیں اور اور بعض اوقات دوسروں پر اپنے خیالات تھوپنے کے لیے تشدد اور خوف وہراس کا استعمال کرتے ہیں۔

جمہوریت ریاست سے اس امر کی متقاضی ہے کہ مذہبی ولسانی اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے حقوق کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ انہیں آئین اور قانون میں درج شدہ حقوق سے مستفید ہونے اور قومی دھارے میں شامل ہونے کا مساوی موقع ملنا چاہیے۔ اسی طرح خواتین کے حقوق ومفادات کو بھی تحفظ ملنا چاہیے تاکہ وہ اپنی فطری استعداد کو فروغ دے سکیں اور قومی ترقی میں موثر کردار ادا کرسکیں۔

جمہوریت اور سماجی ومعاشی ترقی:

جمہوریت شراکتی سماجی ومعاشی ترقی پر زور دیتی ہے۔ ترقیاتی عمل کے دو مراحل میں لوگوں کی شرکت کو یقینی بنانا ضروری ہے: اول، سماجی ومعاشی ترقی کے پروگراموں کی ضرورت کا جائزہ اور تشکیل۔ دوئم، منصوبوں کا نفاذ اور نظر ثانی۔

ترقی کی ضرورت کا جائزہ متعلقہ کمیونٹی کی شمولیت کے بغیر نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتا۔ ترجیحات کے تعین اور منصوبے شروع کرنے کے معاملات میں ان سے مشاورت ضروری ہے۔ ان منصوبوں میں کمیونٹی سے مشاورت خصوصاً ضروری ہے، جوکہ ان کی طبی، تعلیمی، پینے کے پانی، شاہراہوں، صفائی اور دیگر شہری سہولیات اور ضروریات سے متعلقہ ہوں۔ منصوبوں کے نفاذ اور نظر ثانی میں بھی یہ مشاورتی عمل جاری رہنا چاہیے۔ کمیونٹی کی شراکت سے ترقیاتی عمل زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے اور کمیونٹی اور حکومت کے مابین مستحکم تعلق قائم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ مشاورتی عمل کے ذریعے ایسا ترقیاتی کام شروع کرنا بھی ممکن ہوجاتا ہے جس کے لیے کمیونٹی اور حکومت مل کر مالی اخراجات برداشت کریں۔ کمیونٹی کی مشاورت یقینی بنانے کا ایک بہترین طریقہ منتخب کردہ مقامی حکومت ہے جس کے ذریعے ترقیاتی کام کی بنیاد رکھی جانی چاہیے اور اس کا انتظام ہونا چاہیے۔ منتخب کردہ مقامی اراکین پارلیمان کو بھی اس عمل میں شریک ہونا چاہیے۔ مزید برآں، کمیونٹی رہنماؤں کے ساتھ سلسلہ وار رابطہ اہمیت کا حامل ہے۔ جمہوریت اوپر کی سطح سے ترقی کے تصور کو رد کرتی ہے جوکہ ایک استعماری تصور ہے جب اعلیٰ حکومتی عہدیدار ترقیاتی کام کی ضرورت کا تعین کرتے تھے اور لوگوں پر نوازش کرنے کے طور پر ایسے کاموں کی ذمہ داری لیتے تھے۔ آج کے دور میں، سماجی ومعاشی ترقی حکومتی فریضہ ہے اور کمیونٹی کی شمولیت کے بغیر شروع نہیں ہوسکتی۔

پاکستان میں جمہوریت کا تکلیف دہ سفر:

پاکستان جمہوریت کے تکلیف دہ سفر کا حامل ملک ہے۔ اس کی تاریخ آئین سازی میں غیر ضروری تاخیر،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئینی وسیاسی انتظامات کے تعطل، سیاسی نظام کے تنزل، فوجی اقتدار اور فوجی حکمرانوں کی جانب سے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے آئینی وسیاسی عمل کو کنٹرول کرنے جیسے اقدامات سے بھری پڑی ہے۔

پاکستان میں جمہوری سیاسی حکومتوں کے چار ادوار '1947-58،1988-1999, 1971-1977 (......2008،فوجی حکومت کے چار ادوار (1999-2002, 1977-1985, 1969-1971, 1958-1962) اور جمہوری شکل میں فوجی حکومت کے تین ادوار آئے جب آئینی طرز حکمرانی کا لبادہ اوڑھا گیا اور ریاستی نظام پر فوجی قبضے کے عمل میں ایک سیاسی حلقے نے فوج کی معاونت کی (2002-2008, 1985-1988, 1962-1969)

جمہوری اداروں اور جمہوری عمل کو معاشرے میں گہری جڑیں گاڑنے اور خود اعتمادی سے پیوستہ ہونے کے لیے لمبے عرصے کے لیے کبھی بھی بلا رکاوٹ کام کرنے نہیں دیا۔ اگر پاکستانی سیاست کو اپنی ترجیحات کے مطابق ڈھالنے کے لیے اپنی صلاحیت پر اعتماد سے معمور حریص جرنیلوں نے جمہوریت کو مستحکم نہیں ہونے دیا تو پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کے لیے سیاسی رہنما بھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔

پاکستان میں سیاسی قوتوں کے زوال، سیاسی اداروں اور عمل کے تنزل اور فوج۔ افسر شاہی غلبے کے متعدد عوامل ہیں۔ جموری تسلسل کے تعطل اور فوجی غلبے کے بنیادی اسباب، قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد جمہوری قیادت کی کمی، قیادتی بحران کے سبب مسلم لیگ کی اپنی فوقیت برقرار رکھنے میں ناکامی، اندرونی انتشار اور سود مند معاشی وسیاسی ایجنڈے کی کمی ہیں۔ مسلم لیگ کے بعد منظر عام پر آنے والی سیاسی جماعتوں میں بھی وہی نقائص پائے جاتے تھے جن کے باعث مسلم لیگ ناکام ہوئی تھی۔ دیگر اسباب میں آئین سازی میں غیر ضروری تاخیر، وفاقی اور جمہوری سیاسی نظام کی عملی اقدار پر عدم اتفاق رائے، اسلام اور پاکستانی ریاست کے مابین تعلق، مختلف فوجی حکومتوں کی جانب سے سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر سلسلہ وار پابندیاں، معاشرتی تحفظ کی قیمت پر بیرونی عسکری تحفظ پر زائد از ضرورت زور، سلسلہ وار معاشی بدنظمی اور ریاستی نظام میں فوجی مفادات کو نمو پذیر کرنے والے لمبے عرصے پر محیط فوجی ادوار حکومت شامل ہیں۔

1980 کی دہائی میں جنم لینے والی اسلامی انتہا پسندی اور شدت پسندی کے بتدریج ارتقاء نے مستحکم جمہوریت کے تصور کو نقصان پہنچایا ہے۔ گزشتہ برسوں کے دوران مذہبی اور ثقافتی عدم برداشت میں اضافہ ہوا ہے اور بعض گروپ اپنے مذہبی وسیاسی ایجنڈوں کے فروغ کے لیے تشدد کا استعمال کرتے ہیں۔ ان عوامل نے اندرونی کشیدگی اور انتشار میں اضافہ اور جمہوری روایات کو نقصان پہنچایا ہے۔ پاکستان میں معاشرتی سطح پر جمہوری ثقافت ناپید ہے۔ نیم جاگیردارانہ اور نیم جدید معاشرہ سماجی تنازعات کے حل اور سماجی و مذہبی معاملات میں اختلاف رائے اور رواداری کا احترام کرنے کے لیے شراکتی فیصلہ سازی اور مذاکرات پر مکمل طور پر عملدرآمد نہیں کر رہا۔ ایسا سماجی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈھانچہ جمہوریت کے لیے مددگار ثابت نہیں ہوتا۔ تمام سطحوں پر لوگوں کے ذہنی رویوں اور رجحانات کو جمہوری اصولوں کی مطابقت میں لانے کی ضرورت ہے۔

پاکستان میں جمہوریت کے معیار کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ اگرچہ تمام سیاسی رہنما اور سماجی گروہ جمہوریت کا پرچار کرتے ہیں مگر وہ جمہوریت کو اس کی اصل روح کے مطابق نافذ نہیں کرتے۔ انسانی حقوق کی صورتحال مایوس کن ہے اور قانون کی حکمرانی انتخابی ہے۔ مذہبی انتہا پسندی اور شدت پسندی میں اضافے کے سبب مذہبی اقلیتیں شدید دباؤ کا شکار ہیں۔ سیاسی منظرنامہ اغواء برائے تاوان کے واقعات سے خراب ہے۔ بلوچستان میں، پنجاب اور سندھ سے تعلق رکھنے والے کثیر افراد بلوچ قوم پرستوں کی جانب سے قتل کر دیئے گئے ہیں اور بلوچستان کے بلوچ سیاسی کارکنوں کو گاہے بگاہے غائب کیا جارہا ہے۔

مذکورہ عوامل اور حالات کی موجودگی میں تمام سطحوں پر جمہوری اداروں اور اصولوں کو رائج کرنا اور جمہوریت کو مستحکم کرنا ایک نہایت مشکل کام ہے۔ پاکستان کی منتخب کردہ جمہوری نظام حکومت کی طرف واپسی ایک مثبت پیش رفت ہے۔ حالیہ جمہوری ڈھانچے نے متعدد مشکلات کے دوران ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے مگر اس کے باوجود یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ جمہوریت پاکستان میں ناقابل شکست بن چکی ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ 'جہد حق')

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرا باب

انتہا پسندی ۔پس منظر، اسباب،

انتہا پسندی، اس کے پھیلاؤ اور انسداد میں ریاست کا کردار

- انتہا پسندی ...... تاریخی پس منظر۔(ڈاکٹر منظور آغا)
- مذہب کی من مانی تشریح، انتہا پسندی کے لیے آلۂ کار۔ایک تاریخی جائزہ (اجمل کمال)
- پاکستان میں انتہا پسندی، پس منظر اور اسباب (آئی۔اے۔رحمٰن)
- پاکستان میں انتہا پسندی کی مختلف صورتیں (عامر رانا)
- جدیدیت سے دوری انتہا پسندی سے قربت (خالد احمد)
- انتہا پسندی کے فروغ میں جاگیرداری نظام کا کردار (مہتاب راشدی)
- انتہا پسندی کی راہ ہموار کرتا نظامِ تعلیم (آئی۔اے۔رحمٰن)
- پاکستان میں مذہبیت کا بڑھتا ہوا رجحان (عامر رانا)
- قدامت پرستی انتہا پسندانہ سوچ کی محرک (پرویز ہود بھائی)
- ریاست کا معذرت خواہانہ رویہ انتہا پسندوں کی قوت کا موجب (آئی۔اے۔رحمٰن)
- انتہا پسندوں کے مشترکہ مقاصد (عامر رانا)
- انتہا پسندی کے عوامل اور اثرات (آئی۔اے۔رحمٰن)
- انتہا پسندی کی وجوہات اور ساخت.....مختلف ممالک سے چند ایک مثالیں (خالد احمد)
- انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے ہماری ذمہ داریاں (آئی۔اے۔رحمٰن)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندی......تاریخی پس منظر

(ڈاکٹر منظور آغا)

''داراشکوہ کا مقدمہ'' نامی ڈرامہ دیکھنے کے بعد ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے صحافی نے مجھ سے سوال کیا ''کیا اورنگ زیب عالمگیر ایک جابر حکمران تھا؟'' یہ سوال خاصا فکر انگیز تھا کیونکہ یہ اس امر کی عکاسی کرتا تھا کہ ہم اپنے طلبا کو تاریخ کے نام پر جو کچھ پڑھاتے ہیں اُس نے اُن کے ذہن ماضی اور حال کے بارے میں حقائق پر مبنی ریکارڈ کا جائزہ لینے کی صلاحیت پیدا کرنے کی بجائے طوطا مینا کی کہانیوں سے بھرے رہتے ہیں۔

اکبر ایس احمد کا لکھا اور منجولہ کمار کے زیر ہدایت تیار کردہ ''داراشکوہ کا مقدمہ'' نام کا یہ کھیل گزشتہ چند ہفتوں کے دوران کئی جگہوں پر دکھایا گیا ہے۔ نورنغمی اور اُن کے صاحب زادے سلطان نغمی کے ماسوا اس ڈرامے کے زیادہ تر کردار حسب توقع بھارتی اداکاروں نے ادا کیے ہیں۔ اس کھیل کے کئی پہلوؤں پر پیشہ ورانہ تنقید کے باوجود عام شائقین نے اسے بہت پسند کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کھیل میرے مذکورہ صحافی دوست جیسے کئی شائقین کے ذہنوں میں قابل ذکر قسم کے سوال پیدا کرنے میں بھی کامیاب رہا ہے۔

اورنگ زیب نے اپنے والد کو پس زنداں ڈال دیا، اپنے تین بھائیوں اور اُن کے بیشتر بچوں کو قتل کر دیا۔ اُس نے بھارت کے زیادہ تر اہل تشیع کو کشمیر بدر کر دیا اور ایک مرتبہ ہاتھی کی سواری کے دوران اُس نے ہندوؤں کے ایک ہجوم کو کچل کر رکھ دیا کیونکہ وہ محصولات کی بلند شرح کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ ان حقائق کے پیش نظر اب یہ فیصلہ کرنا اُس کا کام ہے کہ اورنگ زیب ایک ظالم حکمران تھا یا نہیں۔

اُس نے سوال کیا ''تاریخ میں بیان کیے جانے والے ان واقعات کے بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ اورنگ زیب قرآن کریم کی خطاطی کر کے یا ٹوپیاں سی کر اپنی روزی کمایا کرتا تھا؟'' مجھے بھی اپنی درسی کتب میں اورنگ زیب کی اس قسم کی کردار نگاری یاد تھی اور اگر میں نے درسی کتب سے آگے بھی اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھا ہوتا تو میرے ذہن میں بھی اورنگ زیب کا یہی تاثر قائم رہتا۔ میں نے اپنے نکتے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اپنے دوست کو بتایا کہ اورنگ زیب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جنگیں لڑنے اور بغاوتیں فرد کرنے میں گزارا اور یہ کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُس کی چہیتی ملکہ اور اُس کے بیٹے کام بخش کی والدہ ہندو تھی۔ کئی مؤرخین کے بیان کے مطابق اورنگ زیب اکثر اپنے وسیع حرم کے ہمراہ کشمیر میں چھٹیاں گزارا کرتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ داشتاؤں اور لونڈی غلاموں کی ایک فوج ظفر موج کے علاوہ سینکڑوں مغل شہزادوں اور شہزادیوں کو ٹھکانہ فراہم کرنے والے اپنے عالی شان محل کے اخراجات پورے کر سکنے کی خاطر قرآن پاک کی خطاطی اور ٹوپیاں سینے کا وقت کب نکال لیتا تھا۔

ذہنی سطح پر لوگوں کی طالبانائزیشن کا عمل قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ درسی کتب میں مسلمان حکمرانوں کی ایسی دیومالائی تاریخ متعارف کروائی گئی جس میں ہر حکمران، حملہ آور اور لوٹ مار کرنے والا مذہب کے محافظ اور اسلام کے لیے تلوار اُٹھانے والے کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔

سوم ناتھ کا مندر فتح کرنے والے محمود غزنوی سے لے کر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی تک ہر حملہ آور کو ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ طوطا مینا کی انہی کہانیوں پر مبنی تاریخ کے ذریعے پاکستانی شہریوں کی تین نسلوں کی ذہنی تطہیر کر کے ان میں اسلامی شاونزم اور دوسرے مذہب کے لیے تحقیر کے جذبات کو پروان چڑھایا گیا ہے۔ چنانچہ پاکستانیوں کی اکثریت میں غیر ضروری جنگجویانہ سوچ پر مبنی احساس برتری کے فروغ پانے میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ عسکری اشرافیہ بھی جنگوں کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے اسی جھوٹے احساس برتری کا سہارا لیے ہوئے ہے۔

ائر مارشل نور خان کے مطابق جنرل ایوب خان نے کشمیر میں اس لیے چھاتہ بردار اُتارے کیونکہ وہ فی الواقع اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ ایک مسلمان سپاہی درجنوں کافروں پر بھاری ہوتا ہے۔ اس اشرافیہ نے تین ہاری ہوئی جنگوں سے کوئی سبق نہ سیکھنے کی بجائے اپنے میزائلوں کو محمود غزنوی، محمد غوری، نادر شاہ اور اسی قسم کے حملہ آوروں کے نام دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت احترام کی نگاہ سے دیکھے جانے والے یہ حملہ آور لوٹ مار کی غرض سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ غزنوی نے سوم ناتھ پر اس لیے دھاوا بولا تھا کہ یہاں ہندوستان میں سونے کا سب سے بڑا خزینہ جمع تھا۔ خود ہندو راجا بھی سونا لوٹنے کی غرض سے اپنے مندروں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ بعض مؤرخین کے مطابق غزنوی کی حملہ آور فوج میں کرائے کے کئی ہندو سپاہی بھی شامل تھے جنھوں نے لوٹ مار میں اپنا حصہ بٹانے کی غرض سے افغان حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔

اسی طرح سے جب نادر شاہ کی تصویر کشی اسلام کے عظیم سپاہی کے طور پر کی جاتی ہے تو کوئی بھی اس بات کا ذکر پسند نہیں کرتا کہ اُس کے حکم پر دہلی میں تین روز تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا کیونکہ مقامی لوگوں نے اُس کے ایک سپاہی کو مار ڈالا تھا۔ اس قتل عام میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا تھا اور ستم بالائے ستم یہ کہ موت کے گھاٹ اُترنے والوں میں آدھی سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کی کہانی بھی کچھ مختلف نہیں۔ اُس نے کئی مرتبہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہندوستان پر دھاوا بولا، یہاں کی دولت لوٹی اور افغانستان واپس چلا گیا۔ اپنے ایک حملے کے دوران اُس نے ایک ہندو کو لاہور کا حکمران تعینات کیا۔ ہماری افسانوی درسی کتب ہمیں جیسا باور کروانا چاہتی ہیں، وہ اس قسم کے کوئی ''اسلامی تخیلات'' نہیں رکھتا تھا۔

مغل بادشاہ بابر نے بھی ہندوستان میں مغل سلطنت کی داغ بیل ڈالتے وقت ہندوؤں کو فتح نہیں کیا تھا بلکہ ہندوستان پر حاکم ایک مسلمان خاندان کو شکست دی تھی۔ بابا گورونانک اپنی 'بابربانی' میں بیان کرتے ہیں کہ بابر نے کس طرح بلا امتیاز قتل وغارت مچائی اور دیگر مذاہب کی عبادت گاہیں مسمار کرنے کے ساتھ ساتھ مساجد کو بھی تہہ تیغ کیا۔

اس کے برعکس انہیں ایک جعلی شاؤنزم اور جھوٹا احساس برتری پیدا کرنے کے آلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ جماعت اسلامی جیسی مذہبی سیاست کرنے والی جماعتیں پاکستان کے قیام کے صرف 30 برس کے اندر پاکستان کے نظریے کی تشریح پر اپنی اجارہ داری قائم کر چکی تھیں۔ ممتاز مؤرخ کے کے عزیز کے الفاظ میں ''تاریخ کے اس قتل'' نے بنیاد پرستی اور مذہبی انتہا پسندانہ رویوں کے فروغ میں نمایاں حصہ ڈالا ہے۔

مسلمان دانشوروں یعنی صوفیا کرام کا نام لینے پر ایک قسم کی پابندی عائد ہے۔ مروجہ پاکستانی ذہنیت میں کوئی مثبت تبدیلی لانے کے لیے پورے درسی نصاب کی تشکیل نو ناگزیر ہے۔ بدقسمتی سے یہ کام امریکی دباؤ کے پیش نظر نیم دلی کے ساتھ کیا جا رہا ہے اور جو بجائے خود بہت سے غلط تصورات کو جنم دے رہا ہے۔ بہرکیف یہ کام ناگزیر ہے اور کسی نہ کسی کو اس کا بیڑا اُٹھانا ہوگا۔

پس نوشت: ہندو انتہا پسند بھی بی جے پی کی سرکردگی میں ہندو شاؤنزم کو فروغ دینے کی غرض سے تاریخ کو دیومالائی کہانیوں میں تبدیل کر کے پاکستانی نمونے کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس سے یہ پنجابی کہاوت یاد آتی ہے کہ اپنے پڑوسی کے اچھے طرز عمل کی پیروی کرنے کی بجائے اُس کی بُری عادات اختیار کر لینے کا چلن زیادہ عام ہوتا ہے۔

(بشکریہ 'نوائے انسان' دسمبر 2009)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب کی من مانی تشریح انتہا پسندی کے لیے آلۂ کار...... ایک تاریخی جائزہ

(اجمل کمال)

برصغیر کے قبل از نوآبادیاتی معاشرے میں جہاد کا وہ تصور موجود نہ تھا جس سے ہم آج کل واقف ہیں۔ جنگیں، چھوٹے اور بڑے پیمانے پر، زمین پر قبضے کی غرض سے لڑی جاتی تھیں کیونکہ قدرتی وسائل اور زرعی سرگرمی زمین سے وابستہ تھی اور زمین کی ملکیت معاشی طاقت اور سماجی مقام کی بنیاد ہوتی تھی۔ یہ قصہ مقامی طور پر زمین کے چھوٹے بڑے رقبوں پر تصرف حاصل کرنے کے لیے چلتا تھا اور وسیع تر علاقوں پر حکمرانی کرنے والے جنگ باز حملہ آور اپنے مفتوحہ علاقوں میں رہنے والے زمینداروں کو مطیع کر کے اُن سے قدرتی وسائل اور زراعت سے حاصل ہونے والی دولت میں اپنا خراج وصول کرتے تھے۔

برصغیر میں وقتاً فوقتاً آنے والے حملہ آوروں نے اپنی سپاہ میں لڑنے کا جذبہ ابھارنے کے لیے اسلامی اصطلاحات ضرور استعمال کریں، لیکن یہ اصطلاحات (مثلاً جذبۂ ایمانی شجاعت وغیرہ) اس وقت بھی نہایت بے تکلفی سے استعمال کی جاتی تھیں جب مخالف سورما کافر یا مشرک نہیں بلکہ کلمہ گو حملہ آور سورما کا ہم مذہب ہوتا تھا۔ افغانستان کے راستے برصغیر پر حملہ کرنے والے بابر اور اس کا مقابلہ کرنے والے دہلی کے سلطان ابراہیم لودھی کے درمیان جنگ میں بابر نے مذہبی اصطلاحات اور افعال (مثلاً شراب ترک کرنے کے اعلان) کو اسی طرح استعمال کیا۔

تاہم مذہبی عالم یعنی پیش امام، مدرّس، قاضی اور مفتی زمین کی ملکیت کی بنیاد پر کام کرنے والے اس نظام کی تمام سطحوں کا حصہ تھے اور اس کی سیاست میں ان سے اہم کام لیے جاتے تھے۔ گاؤں کی سطح پر ملّا یا پیش رعیت امام کے دوسرے گروہوں کی طرح زمینداروں کا دست نگر ہوتا تھا اور اس کی خدمات کا معاوضہ اسے کاشتکاروں اور دیگر دیہی کارکنوں (کمّیوں) کی طرح اناج کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ وہ ایک طرف نچلی ذات اور سماجی مقام کے حامل دیہاتیوں کے خانگی اور باہمی معاملات میں شرعی فتویٰ دیتا تھا اور دوسری طرف زمیندار کی مختلف نوعیت کی سرگرمیوں کے شرعی جواز تلاش کر کے پیش کرتا تھا۔ ان سرگرمیوں میں دوسروں کی زمین پر قبضہ، مخالفین کی عورتوں کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے حرم میں داخل کرنا، زمین سے حاصل ہونے والی دولت کو عیش وعشرت اور فسق وفجور میں صرف کرنا، وراثت کے حصہ داروں کو ان کے حصے سے محروم کرنا یہاں تک کہ اپنے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کو ٹھکانے لگانا بھی شامل ہوتا تھا۔ زمیندار کا دست نگر ہونے کے باعث اسے اس کے مفادات کا خاص خیال رہتا تھا اور کاشتکاروں یا کمیوں کی جانب سے کسی احتجاج کی صورت میں انہیں کافر اور واجب القتل قرار دینا اور ان کے نکاح فسخ کرانا اس کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔

مولوی یا مذہبی عالم کا یہی سماجی کردار معاشرے کی اونچی سطحوں پر بھی موجود تھا۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب نے تخت کے ممکنہ دعویدار بھائیوں اور بھتیجوں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کیا تو ان میں سے بعض (مثلاً داراشکوہ) کے مذہبی عقائد بھی زیر بحث لائے گئے۔ گاؤں کے زمیندار سے لے کر رئیسوں اور بادشاہوں کے دربار تک مولویوں اور عالموں کے فتاویٰ حاکموں کی منشا پر منحصر ہوتے تھے۔ مثلاً صوبہ سرحد (بشمول وہاں کی نوابی ریاستوں) کے خوانین نے مذہبی عالموں سے صاف کہہ رکھا تھا کہ قرآن کی سورۃ نسا کا وہ حصہ جس میں عورتوں کو وراثت میں حصہ دار بنایا گیا ہے، کالعدم رہے گا اور ان کے علاقے میں اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ مذہبی احکام میں یہ تحریف اس مقامی روایت کو مستحکم رکھنے کا ذریعہ تھی جس کے تحت گھر کی عورتوں کو جائیداد میں حصہ دینے کی آج تک حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔

زمین پر ملکیت کے علاوہ اس ملکیت سے ہونے والی زائد آمدنی سونے چاندی کی صورت میں زمینداروں، رئیسوں اور بادشاہوں کے خزانے میں جمع ہوتی رہتی تھی۔ کسی علاقائی یا بیرونی حملہ آور یا زمین کے قبضہ گیر سے شکست کھانے کی صورت میں اس دولت کا کچھ حصہ فاتح سپاہیوں میں مال غنیمت کے طور پر تقسیم ہوتا اور بڑا حصہ فاتح زمیندار یا حکمران کے قبضے میں چلا جاتا۔ زمین یا دولت کا مالک کوئی بھی ہو، رعیت کے حصے میں صرف ان کی ضرورت بھر کا اناج اور دوسری اجناس ہی آتی تھیں۔ نوآبادیاتی دور میں مرکزی فوج کے ادارے کی تشکیل اور انتظامی اور تعلیمی اداروں کے قیام کے نتیجے میں معاشرے میں نقدی کا رواج رفتہ رفتہ بڑھتا گیا جس کے بہت دوررس نتائج برآمد ہوئے۔

انگریزوں نے برصغیر پر اپنا قبضہ مستحکم کیا تو اس کے نتیجے میں مقامی حکمران یا تو اپنے تخت سے محروم ہو گئے یا انہوں نے انگریزوں کی اطاعت اختیار کر لی۔ دونوں صورتوں میں وہ اپنے دربار سے وابستہ افراد (مختلف قسم کے مصاحبوں، ارباب نشاط وغیرہ) کی پرورش سے قاصر ہو گئے۔ ان افراد میں مذہبی عالم بھی شامل تھے جن میں اس نئی صورت حال پر تشویش کا پیدا ہونا قدرتی تھا، کیونکہ اس میں ان کو اپنی کوئی فوری جگہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ بیرونی قبضے کے مقابلے کے لیے پہلے پہل ان عالموں نے روایتی طریقے آزمائے۔ شاہ ولی اللہ نے افغانستان کے بادشاہ کو ہندوستان پر حملہ کر کے اپنی سلطنت قائم کرنے کی دعوت دی لیکن طاقت کے نئے توازن میں اس روایتی حکمران کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے حملہ آور فاتحوں کی روایت پر عمل کرنا ممکن نہ تھا۔ شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے اپنے شاگرد سید احمد بریلوی میں یہ جذبہ بیدار کیا کہ اس صورت حال کو بدلنے کے لیے کوئی اقدام کریں۔ روایتی طرز فکر کی رو سے جنگ آزمائی سورماؤں یعنی صاحبان شمشیر کا پیشہ تھا، نہ کہ عالموں کا، چنانچہ سید احمد بریلوی نے کسی مناسب صاحب شمشیر کی تلاش شروع کی۔ انہیں یہ صلاحیت ٹونک کے نواب امیر خاں میں دکھائی دی، لیکن لٹ ٹونک کے دربار اور فوج سے سات آٹھ برس وابستہ رہنے کے باوجود اسے انگریزوں سے جہاد کر کے ہندوستان کا قبضہ واپس لینے کی مہم پر آمادہ نہ کر سکے۔ انگریزوں کی اطاعت کے انعام کے طور پر راجپوتانے کی ایک چھوٹی سی ریاست کا قبضہ حاصل کرنے والے امیر خاں سے اس مہم جوئی کی توقع یوں بھی حقیقت پسندی سے قدرے بعید تھی۔

اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد سید احمد بریلوی نے خود جہاد کا لشکر تیار کرنے کی ٹھانی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عام لوگوں کو ایک جہادی فوج میں بھرتی ہونے کی دعوت دی گئی لیکن یہ عام لوگ چونکہ روایتی حاکم طبقوں میں سے نہ تھے، اس لیے یہ بات واضح نہ تھی کہ جہاد کی کامیابی کی صورت میں جو ریاست قائم ہوگی اس پر حکمرانی کون کرے گا۔ سید احمد بریلوی نے یہ اعلان کیا کہ جہاد کے نتیجے میں وجود میں آنے والی ریاست کی باگ ڈور کسی عادل حکمران کو سونپ دی جائے گی اور وہ خود عالموں کی روایتی سرگرمی یعنی تعلیم و تدریس کی طرف لوٹ جائیں گے۔ ایک ضمنی سوال یہ بھی پیدا ہوا کہ عام لوگوں کو، جن کا پیشہ سپہ گری نہیں تھا، اس جہاد کے نتیجے میں کیا حاصل ہوگا۔ اس سوال کا جو دلچسپ جواب تحریک جہاد کی تاریخ میں دستیاب ہوتا ہے وہ آگے آئے گا۔

جن مذہبی عالموں اور مدرسوں کا سماجی رشتہ شرفا، امرا اور رؤسا سے تھا، ان کو دیہی علاقوں کے ملاؤں کی بہ نسبت اونچا مقام حاصل تھا۔ یہ بات آج کل فراموش کی جا چکی ہے کہ دیہی ملاؤں میں سے بیشتر ایسے تھے جن کی تمام تر مذہبی تعلیم زبانی ہوتی تھی۔ یعنی وہ ناخواندہ تھے۔ لیکن انہوں نے مذہبی متون زبانی یاد کر لیے تھے اور گاؤں کی سطح پر مذہبی رسوم ادا کرنا اور نچلی ذاتوں اور طبقوں کے باہمی معاملات میں فتوے دینا سیکھ گئے تھے۔ ان کے برعکس اعلیٰ درجے کے مذہبی عالم عموماً سید تھے جن کو برصغیر کے معاشرے میں ایسا مقدس رتبہ حاصل ہو گیا تھا جو عرب ممالک میں وجود نہ رکھتا تھا۔ ان کی ایک اہم سرگرمی درباری امرا، رؤسا اور والیان ریاست کے بیٹوں اور سلطنت کے اعلیٰ درجے کے عمال کی تعلیم و تربیت پر مشتمل تھی جو ان کو شاہی اور جاگیرداری کے خطوط پر قائم معاشرے میں ایک کسی قدر طاقتور رتبہ فراہم کرتی تھی۔ اس کے علاوہ ان عالموں کو ان کے علم کی بدولت احترام بھی حاصل تھا، اگرچہ عموماً وہ حاکموں پر ایسی تنقید سے احتراز کرتے تھے جو ان کو ناگوار گزرے۔ عالموں کی خدمات کے صلے میں بعض اوقات ان کو زمین اور زر و مال بھی دیا جاتا، جس سے وہ خود امرا کے زمرے میں شامل ہو جاتے اور یوں سماجی طاقت میں حصے دار بن جاتے۔ بعض علما ایسے بھی تھے جو امرا اور رؤسا کی صحبت سے گریز کرتے اور ان کی سرگرمی صرف ان افراد کو تعلیم دینے پر مرکوز رہتی جو امرا، رؤسا اور والیان ریاست کے پاس بطور اتالیق ملازمت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چونکہ یہ سرگرمی ہر صورت میں معاشرے کے سیاسی اقتدار کے ڈھانچے سے تعلق رکھتی تھی، اس لیے اس بات میں بہت احتیاط کی جاتی کہ یہ دروازہ صرف اعلیٰ نسب کے افراد کے لیے کھولا جائے۔ مولانا غلام رسول مہر سید احمد بریلوی کی شاہ عبدالعزیز سے ملاقات کا احوال یوں بیان کرتے ہیں:

شاہ عبدالعزیز نے معمول کے مطابق مصافحت اور معانقت کے بعد پاس بٹھا کر پوچھا،
''کہاں سے آئے ہو؟''
سید احمد: ''رائے بریلی سے''۔
شاہ صاحب: ''کس قوم سے تعلق رکھتے ہو؟''
سید احمد: ''وہاں کے سادات سے منسوب ہوں''
شاہ صاحب: ''سید ابوسعید اور سید نعمان کو جانتے ہو؟''
سید احمد: ''سید ابوسعید میرے حقیقی نانا تھے اور سید نعمان حقیقی چچا''

یہ سنتے ہی شاہ صاحب نے دوبارہ گرم جوشی سے معانقہ فرمایا۔ ''کس غرض سے اتنے لمبے سفر کی صعوبت گوارا فرمائی؟'' سید صاحب نے عرض کیا کہ ''آپ کی ذات مقدس کو غنیمت سمجھ کر اللہ تعالیٰ جل شانہ کی طلب میں پہنچا ہوں''۔ شاہ عبدالعزیز نے فرمایا کہ ''خدا کا فضل شامل حال ہے تو اپنی پدری اور مادری وراثت حاصل کر لو گے''۔

گویا معروف اسلامی تعلیمات کے مطابق جس شے (یعنی علم) کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض کیا گیا تھا، اسے برصغیر کے طبقوں اور ذاتوں میں بٹے ہوئے معاشرے میں اسی طرح ''پدری اور مادری وراثت'' کا درجہ حاصل ہو گیا جو زمین اور سونے چاندی کو حاصل تھا۔ یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ مقامی اسلام میں ''قوم'' کا تصور شامل کر لیا گیا، جس کے لیے آگے چل کر ''برادری'' کی اصطلاح استعمال ہونے لگی اور جس سے مراد حسب و نسب کا پس منظر ہے جو ہندو سماج کے ذات پات کے تصور سے ہو بہو مماثل ہے۔

اس پس منظر میں جب سید احمد بریلوی نے ٹونک کے والی امیر خاں کے ارادۂ جہاد سے مایوس ہو کر عامی مسلمانوں پر مشتمل لشکر تیار کرنے کا ارادہ کیا تو ان کا طرز عمل انتہائی درجے کی احتیاط پر مبنی تھا۔ چونکہ یہ عوام بیشتر ان ذاتوں یا قوموں سے تعلق رکھتے تھے جو مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوئی تھیں، اس لیے انہیں لشکر میں شامل کرنے سے پہلے ان کے طور اطوار کو شرفا سے مماثل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اسے ''اصلاح'' یا ''ہندو رسم و رواج کے خاتمے'' کا نام دیا گیا، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ عمل بجائے خود ہندو سماج میں رائج ذات پات کی تقسیم کے تصور پر بنیاد رکھتا تھا، اس لیے مسلمان معاشرے کی مختلف ''قوموں'' یا ''برادریوں'' کے مابین موجود تقسیم کو مٹانے کے بارے میں کہیں کچھ نہ کہا گیا۔ چنانچہ تحریک جہاد کا اولین حصہ اسی سماجی تطہیر کے عمل پر مشتمل تھا جس کے تحت لشکر میں شامل ہونے والوں کو مقامی اثرات یعنی ''ہندو رسم و رواج'' سے پاک کیا گیا۔ اس تحریک کے انجام کے بعد بنگال میں جو تحریکیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شروع ہوئیں، مثلاً فرائضی تحریک یا تیتو میاں کی تحریک، ان میں بھی اسی عنصر پر حد درجہ زور دیا گیا۔

تحریک جہاد کے ایک اور اہم پہلو کا تعلق ان سوالوں سے تھا کہ جہاد کس کے خلاف کیا جائے، اس کے لیے مادی وسائل کہاں سے حاصل کیے جائیں اور جہاد کے لیے کیا قلیل مدتی اور طویل مدتی حکمت عملی اختیار کی جائے۔ یہ بات کسی حد تک ناقابل فہم معلوم ہوتی ہے کہ انگریزوں کو جہاد کا اولین ہدف نہیں بنایا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ برصغیر کے ایک ایسے علاقے میں جا کر جہاد کیا جائے جو کسی بیرونی حاکم کے نہیں بلکہ ایک مقامی، غیر مسلم (سکھ) حاکم کے تسلط میں تھا، حالانکہ جہاد کی ضرورت کا احساس اس بنا پر پیدا ہوا تھا کہ انگریزوں نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا جن میں سے بیشتر پہلے مسلمان حکمرانوں کے قبضے میں تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ کے قبضے میں تھا اور فیصلہ ہوا کہ اسے جہاد کر کے آزاد کرایا جائے۔ اس قسم کی بہت سی ریاستیں انگریزوں کے زیر نگیں علاقوں میں بھی موجود تھیں جن کے حکمران غیر مسلم (یعنی ہندو اور سکھ) تھے۔ لیکن وہ سب اور ان کے ساتھ ساتھ تمام مسلمان والیان ریاست انگریزوں کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ ان میں سے کسی ریاست کے حکمران کو جہاد کا ہدف بنانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ یہی نہیں بلکہ انگریزوں کے مطیع اور وفادار والیان ریاست، جاگیرداروں اور روسا میں سے بہت سے ایسے تھے جنھوں نے تحریک جہاد کے لیے مادی وسائل مہیا کیے اور جب بریلی سے چلنے والا مجاہدین کا یہ قافلہ اپنے طویل سفر میں ان کے علاقوں سے گزرا تو انھوں نے اس کی مہمان نوازی میں بڑی دریا دلی کا ثبوت دیا۔ جہاں تک انگریز نوآبادیاتی حاکموں کا تعلق ہے، انھوں نے اس سفر اور ارادۂ جہاد میں کسی قسم کی مداخلت کرنا ضروری نہ سمجھا۔

تحریک جہاد کے وقائع نگاروں اور مؤرخوں کے درمیان اس نکتے پر خاصا اختلاف رہا ہے کہ انگریزوں کے بجائے سکھوں سے جہاد کرنے کے اس فیصلے کو کس طرح سمجھا جائے۔ سید احمد بریلوی کے ایک قریبی تحریکی ساتھی مولانا محمد جعفر تھانیسری کا کہنا ہے کہ انگریزوں کے خلاف جہاد ان کے پروگرام میں شامل ہی نہ تھا جبکہ مولانا غلام رسول مہر کہتے ہیں کہ سکھوں کے خلاف جہاد تحریک کے مجموعی پروگرام کا محض پہلا حصہ تھا اور سکھوں سے آزاد کرائے ہوئے علاقے کو مرکز بنا کر بعد میں انگریزوں کے خلاف بھی جہاد کیا جانا تھا۔

سید احمد بریلوی اور ان کے جہادی ساتھی، سکھوں سے نمٹ لینے کے بعد، انگریزوں سے جہاد کرتے یا نہیں، یہ سوال ان بہت سے دوسرے تاریخی سوالات کی لاینحل معما ہی بنا رہے گا جن کی بنیاد 'جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا' جیسے مفروضوں پر ہوتی ہے۔ عملی اعتبار سے اس سوال کی کچھ خاص اہمیت نہیں، اس لیے ہمیں اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ مذکورہ تحریک جہاد نے دراصل کیا صورت اختیار کی۔ جہاں تک اس کے نتیجے کا تعلق ہے، اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ یہ جہاد سکھوں کو شکست دینے میں ناکام رہا اور آخر کار رنجیت سنگھ کی موت کے بعد پنجاب پر انگریزوں ہی کا قبضہ ہوا، جیسا کہ برصغیر کے باقی تمام قابل ذکر علاقوں پر پہلے ہی ہو چکا تھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک جہاد اپنے اعلان کردہ مقاصد حاصل کرنے میں کیوں ناکام رہی، اس کے بہت سے تجزیے کیے جاتے رہے ہیں۔ اس تحریک کو اس اعتبار سے بھی دیکھے جانے کی ضرورت ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا جہاد تھا جس کی کمان کسی صاحب شمشیر کے بجائے مذہبی عالموں کے ہاتھ میں تھی، اور جس کے سپاہی پیشہ درانہ اور پشتینی جنگ آزما نہیں بلکہ عام لوگ تھے جن کا سروکار اس وقت تک تیر و تلوار سے نہیں بلکہ ہل کی پھالی سے رہا تھا۔ جب جہادی قافلے نے آکر سرحد کے پشتون علاقے میں ڈیرا ڈالا تب بلا شبہ اس میں وہ قبائلی لوگ بھی شامل ہوئے جن کا شغل زن، زر اور زمین کے معاملات کو تلوار کی نوک پر طے کرنا رہا تھا۔ جہاں تک عام لوگوں کا تعلق تھا تو ان کے ذہن میں یہ بات واضح نہ تھی کہ جہاد کی کامیابی کے نتیجے میں جو نئی صورت حال وجود میں آئے گی اس میں ان کی اپنی زندگی میں کس قسم کی بہتری آنے کی توقع ہے۔ تحریک کے قائدین کے پاس ان کے اس سوال کا یہ جواب تھا:

جس طرح بارش سے نباتات اور حیوانات اور انسانوں کو بہ کثرت فوائد پہنچتے ہیں، اسی طرح جہاد سے عام خلائق کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ایک نفع تو وہ ہے جو اہل ایمان، فرمانبردار اور نیکوں اور سرکشوں، فاسقوں اور منافقوں کو یکساں پہنچتا ہے بلکہ جن وانس، حیوانات و نباتات بھی اس میں یکساں شریک ہوتے ہیں اور ایک یہ کہ بعض خاص خاص جماعتوں بعض خاص خاص اشخاص کو ایک طرح کا نفع حاصل ہوتا ہے اور دوسری جماعتوں اور دوسرے اشخاص کو دوسری طرح کا۔ عمومی نفع کی تفصیل یہ ہے کہ تجربہ بتاتا ہے کہ اہل حکومت کے انصاف، اہل معاملات کی دیانتداری، اہل دولت کی سخاوت و فیاضی اور عام لوگوں کی نیک نیتی سے آسمانی حرکتیں نازل ہوتی ہیں، وقت پر بارشیں ہوتی ہیں، پیداوار کی بہتات ہوتی ہے، فصلیں اچھی ہوتی ہیں، تجارت کا فروغ ہوتا ہے، سامان تجارت کا چلن اچھا ہوتا ہے، بلائیں ٹلتی ہیں، مالوں میں ترقی اور نمو ہوتا ہے، اہل ہنر اور ارباب کمال بہت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ دین حق کی قوت و شوکت، دیندار سلاطین کے عروج اور اطراف ممالک میں ان کی حکومت کی ترقی، ملت حق کے سا کرہ افواج کی قوت اور احکام شرعیہ کی اشاعت و عمومیت سے بدرجہا زیادہ نتائج و برکات ظاہر ہوتی ہیں۔ آسمانی برکتوں کے نزول کے سلسلے میں روم اور ترکی سے موجودہ ہندوستان کا مقابلہ کر کے دیکھ لو بلکہ موجودہ ہندوستان جس کا بڑا حصہ دارالحرب بن چکا ہے، اس کا مقابلہ دو سو، تین سو برس پہلے کے ہندوستان سے کرو، آسمانی برکتوں کا کیا حال تھا اور اولیائے عظام اور علمائے کرام کی کتنی بڑی تعداد پائی جاتی تھی''۔

یہ آخری بات اس لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے کہ جس زمانے کا ذکر ہے اس میں مسلمان حاکموں کا تسلط برصغیر کے بڑے بڑے علاقوں پر تھا جن سے حاصل ہونے والا اخراج انہیں وہ مالی آسودگی عطا کرتا تھا کہ علمائے کرام اور ارباب کمال کی بڑی تعداد کی سرپرستی کر سکیں اور ''دیندار حکمران'' کے لقب کے مستحق قرار پائیں۔ جہاد کے نتیجے میں اگر گزشتہ شوکت و سطوت بحال ہو جاتی ہے تو مسلمان حکمرانوں اور علمائے کرام کو ہونے والے متوقع خصوصی فوائد تو خیر بالکل ظاہر ہیں۔ باقی رہے بے چارے عام لوگ جنہیں جہاد میں دراصل حصہ لینا اور اپنی جان کو قربانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے پیش کرنا تھا، ان کے حصے میں محض آسمانی برکتوں، بروقت بارشوں اور اچھی فصلوں کا وعدہ حور ہی آیا۔

اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے پہلے یوں جہاد کے فوائد گنوانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ جہاں تک ان کے سپاہیوں کا تعلق ہے، انہیں فتح حاصل ہونے پر مفتوحہ علاقے کو لوٹنے اور مال و دولت کے علاوہ مفتوحوں کی عورتیں اپنے قبضے میں لانے کا اختیار دیا جاتا تھا، چنانچہ ان کے ذہن میں بھی اس بنا پر کوئی الجھن نہ ہوتی تھی کہ اس شمشیر زنی کا حاصل کیا ہے۔ الجھن تو پیدا ہی اس وقت ہوئی جب غیر پیشہ ور سپاہیوں کو جہاد کی سرگرمی میں شامل ہونے پر آمادہ کیا گیا اور ان کی کمان کرنے والے علما نے سب سے پہلے ان کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔

عقائد و اعمال کی اصلاح کی بابت اس فکر مندی نے تحریک جہاد کی پیشرفت اور نتیجے کے سلسلے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ایک اور اہم پہلو اس تحریک کے سلسلے میں اختیار کی جانے والی یہ حکمت عملی تھی کہ قصۂ زمین کو برسر زمین طے کرنے کے بجائے، یعنی ہندوستان پر قابض انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کے بجائے، ہجرت کر کے جہادی گروہ کو کسی پر امن جگہ لے جایا جائے اور وہاں کے مسلمانوں کی جمعیت اکٹھی کر کے منتخب کردہ غیر مسلم حکومت کے خلاف جہاد کا آغاز کیا جائے۔

(بشکریہ 'نوائے انسان' جون 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں انتہا پسندی، پس منظر اور اسباب

(آئی۔اے۔رحمٰن)

چالیس (40) سالوں تک قائداعظم اپنی برادری سے یہ حلف لیتے رہے کہ وہ اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کے لئے ایک ہو جائیں۔اب وہ پاکستان میں رہنے والی تمام برادریوں سے یہ حلف لیتے رہے کہ وہ اپنا مشترکہ وطن تعمیر کرنے کے لئے اکٹھے رہیں گے۔

11 اگست 1947 کو انہوں نے آئین ساز اسمبلی میں جو تقریر کی وہ قائداعظم کی ان تمام تقاریر سے مختلف تھی جو محمد علی جناح نے اب تک کی تھیں کیونکہ وہ ایک نئی قوم کی نئی پارلیمنٹ میں تقریر کر رہے تھے۔اور وہ بھی نئی ریاست کے منتخب سربراہ کی حیثیت میں......

انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز قانون ساز اسمبلی کے دو منصبی فرائض کو اجاگر کر کے کیا......اول...... مستقبل کے آئین کو تشکیل دینے کی اس کی بھاری اور انتہائی اہم ذمہ داری......اور دوئم...... پاکستان کے بہ حیثیت مکمل طور پر آزاد اور خود مختار وفاقی قانون ساز ادارے کے اس کے بنیادی فرائض......انہوں نے کہا: ''اسمبلی کے اولین کام کے بارے میں وہ کوئی واضح اعلان نہیں کر سکتے لیکن ''میں صرف چند باتیں کہوں گا......'' جوں جوں وہ میرے سامنے آئیں گی...... '' قائداعظم نے اسمبلی کے ارکان کو یاد دلایا کہ بحیثیت ''آزاد اور خود مختار قانون ساز ادارے کے ......ان کے پاس تمام اختیارات تھے...... جب قائداعظم نے ان کی ''اہم ترین ذمہ داری'' کا ذکر کیا کہ فیصلوں کا تعین کیسے کرنا ہے یا فیصلے کس طرح کرنے ہیں تو انہوں نے یقیناً معمول کے عابدانہ یا مولویانہ کام کاجوں کا حوالہ نہیں دیا ہوگا۔ان کا مطلب واضح طور پر ان اساسی اور بنیادی فیصلوں سے تھا جو ایک نئی ریاست تشکیل دینے کے لئے ضروری تھے۔جس انداز میں قائداعظم نے نظم و نسق کی ترجیحات کی توضیح و تشریح کی۔اس کی طرف توجہ مبذول کرنا اہمیت کا حامل ہے۔امن عامہ کی صورتحال کو برقرار رکھنا یا امن و امان قائم کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری تھی۔ وجہ؟ شہریوں کی جان و مال اور مذہبی آزادی کا تحفظ۔عقیدے کی آزادی کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ خاص طور پر قابل غور ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری ترجیح رشوت اور بدعنوانی کے زہر کو یا رشوت اور بدعنوانی کی لعنت کو پوری قوت کے ساتھ جڑ سے اکھاڑ پھینکنا تھا۔

اس کے بعد قائداعظم نے بلیک مارکیٹنگ کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اسے معاشرے کے خلاف ایک بھیانک جرم قرار دیا۔ اس کے بعد جس دوسرے جرم پر قابو پانا مقصود تھا وہ اقربا پروری اور بدعنوانی اور بے ایمانی تھا...... چار نقاط پر مشتمل اپنا ایجنڈا پیش کرنے کے بعد...... امن وامان، رشوت اور بدعنوانی کے خلاف مہم...... بلیک مارکیٹنگ کا خاتمہ...... اور اقربا پروری کا خاتمہ...... قائداعظم نے اچانک ہی تقسیم کے نتائج پر بحث شروع کر دی...... اس حوالے سے صرف ایک ہی وضاحت پیش کی جاسکتی ہے...... کہ قائداعظم ان مسائل پر بات کرنا چاہتے تھے جو نہ صرف یہ کہ ان کے ذہن پر سوار تھے بلکہ تمام قوم کے ذہن پر سوار تھے...... مثال کے طور پر، بین الفرقہ نفرت کا اظہار...... تقسیم ہند، پنجاب اور بنگال کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر تشدد اور عدم رواداری کا پھوٹ پڑنا۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح سیاسی سوجھ بوجھ کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ انہوں نے ایک عام سیاست دان کی جذباتی ترنگ یا پرفریب جنتر منتر سے کام نہیں لیا اور پاکستان کی تخلیق کو ''بھارت کے آئینی مسئلے کا واحد حل'' قرار دیا۔ جبکہ انہوں نے ضرور کہا کہ میری فہم وفراست کے مطابق کوئی دوسرا حل موجود نہیں تھا...... انہوں نے حتمی فیصلہ تاریخ پر چھوڑ دیا...... اہم سوال یہ تھا کہ اب جبکہ پاکستان قائم ہو چکا تھا...... اب کیا کیا جانا چاہیے...... قائداعظم کا جواب نہ صرف یہ کہ بالکل واضح تھا بلکہ ان کی ہمت کی ترجمانی بھی کرتا تھا...... پاکستان کی تشکیل کا سب سے اعلیٰ اور ارفع مقصد عوام کی فلاح و بہبود کا حصول تھا...... ''خاص طور پر عوام اور مفلوک الحال طبقوں کی فلاح و بہبود''۔ اس کے لیے ہمیں ماضی کو بھلانا ہوگا اور تنازعات کو ختم کرنا ہوگا۔ اس اعلان میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں تھا......

اگر آپ اپنے ماضی کو بدلتے ہیں اور مل جل کر ایک ایسے جذبے اور عزم کے ساتھ کام کرتے ہیں کہ آپ میں سے ہر کوئی...... قطع نظر اس بات کے کہ اس کا تعلق کس برادری سے ہے...... قطع نظر اس حقیقت کے کہ ماضی میں اس کا آپ کے ساتھ کیا تعلق تھا کیا رشتہ تھا۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس کا کیا رنگ ہے۔ اس کی کیا ذات ہے۔ کیا نسل ہے۔ وہ اول اور دوئم اور آخر اس ریاست کا شہری ہے جس کے مساویانہ حقوق ہیں...... مساویانہ استحقاق اور مساویانہ ذمہ داریاں ہیں...... ایسے میں آپ جو ترقی کریں گے اس کا کبھی اختتام نہیں ہوگا......

اس دور کے سب سے اہم سوال کے حوالے سے قائداعظم کا یہ دو نقاطی جواب تھا...... اول: اس نے یہ اپیل کی کہ فرقہ واریت کی سیاست کو ہمیشہ کے لیے دفنا دیا جائے اور شاید دوسروں کے مقابلے میں وہ یہ بات بہتر طور پر جانتا تھا کہ فرقہ واریت کا کیا مطلب ہے۔ دوسرا نقطہ یہ تھا کہ فرقہ واریت کی راہ ترک کیے بغیر کسی قسم کی کوئی ترقی ممکن نہیں تھی۔

آخر میں قائداعظم نے پیشین گوئی کی کہ اگر ایک دفعہ فرقہ وارانہ رویوں کو ترک کر دیا جائے تو اکثریتی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقلیتی برادریوں کے تیکھے نقوش خود بخود مٹ جائیں گے۔ صرف یہی نہیں، قائداعظم نے ایک بڑے دقیق انداز میں خبردار کیا کہ اگر اسے اپنائے رکھتے ہیں تو یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو لسانی اور فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم کر دے گی۔ لہٰذا اس بات کا اعلان کرنا انتہائی ضروری تھا...... ''کہ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ کسی بھی نسل سے ہو...... ریاست کا اس سے کوئی تعلق نہیں......'' اگر یہ راستہ اختیار کر لیا جاتا ہے تو آپ یہ دیکھیں گے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے...... مذہبی نقطہ نظر سے نہیں...... کیونکہ یہ ہر ایک کا ذاتی عقیدہ ہے۔ لیکن سیاسی نقطہ نظر سے۔ بہ حیثیت ریاست کے ایک شہری ہونے کے ناطے...... سامعین اس تقریر کے معانی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اسمبلی میں کانگریس پارٹی کی طرف سے بات کرتے ہوئے کرن شنکد رائے نے قائداعظم کی تقریر میں ایک سیکولر، جمہوری ریاست کے مستقبل کی جھلک دیکھی...... ایک ایسی ریاست جو ایک شہری اور دوسرے شہری کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھے گی...... جو ہر ایک کے ساتھ انصاف کرے گی۔ رنگ، نسل، عقیدے اور برادری کے اعتبار کے بغیر......

کرن شنکد رائے نے اپنی تقریر کا اختتام ان الفاظ میں کیا: ''جب تاریخ آپ کے کیریئر کے بارے میں حتمی فیصلہ صادر کرے گی۔ جناب عالی! مجھے امید ہے...... وہ یہ بات ریکارڈ پر لائے گی کہ آپ نہ صرف یہ کہ ایک عظیم برادری کے رہنما تھے بلکہ ایک ریاست اور ملک کے تمام عوام کے بھی عظیم رہنما تھے...... ایک ایسی ریاست یا ملک جسے آپ معرض وجود میں لائے......

11 اگست، 1947 کی تقریر نے واضح طور پر یہی کچھ کیا...... مسلم برادری کے ایک رہنما سے قائداعظم پاکستان کے تمام عوام کے ہیرو رہنما بن کر ابھرے۔ جس نے شہریت کی مساویانہ حیثیت کی بنیاد پر ایک نئی قوم تشکیل دی۔ چند ایک ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے قائداعظم کے الفاظ کو سمجھنے سے انکار کر دیا یا ایسا کرنا پسند نہیں کیا۔ بعض تو کنایتاً یہ کہنے کی حد تک چلے گئے کہ قائداعظم کی صحت خطرناک حد کر گر چکی ہے یا بہت خراب ہے۔ ایک صاحب نے تو قائداعظم (بانی قوم) کی تقریر کو سنسر تک کرنے کی جرأت کی۔ بعض افراد اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ دو قومی تھیوری / نظریہ اپنا مقصد حاصل کر چکی تھی (یا دو قومی نظریہ اپنا مقصد حاصل کر چکا تھا) اور اب فالتو بن چکا ہے...... وہ یہ سب کچھ تسلیم کرنے کے لیے اس لیے تیار نہیں تھے کیونکہ قائداعظم بظاہر پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانے کی شاہراہ پر رکاوٹیں تعمیر کر رہے تھے...... وہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست نہیں بنانا چاہتے تھے۔

قائداعظم کی 11 اگست، 1947 کی تقریر میں جو بھی ردوبدل کیا گیا ہے، درحقیقت، قائداعظم کی عظمت کی عکاسی کرتا ہے...... وہ نہ صرف یہ کہ ایک صاحب تدبیر اور مدبر بلکہ ایک صاحب بصیرت بھی تھے۔ انہوں نے بھارت کی تقسیم کے لیے دو قومی نظریے کو اختیار کیا تھا۔ وہ دو قومی نظریے کو زندہ رہنے اور پاکستان کی تقسیم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے ایک اور موقع پر کہا: عوام نے پاکستان حاصل کر لیا ہے۔ اب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہوں نے بس ایک قوم بننا ہے۔ قائداعظم نے پاکستان کے عوام کو ایک نئی قوم کے ارکان کے روپ میں متنور کیا۔ جس طرح کہ افغان اس وقت ایک قوم بن گئے تھے جب ابدالی نے 18 ویں صدی میں افغانستان کی ریاست کی بنیاد رکھی تھی اور جرمن ایک صدی بعد ایک واحد جرمن ریاست معرض وجود میں آنے کے بعد ایک قوم بن گئے تھے یا جیسا کہ نسل پرست حکومت کے خاتمے کے بعد ایک نئی جنوبی افریقن قوم معرض وجود میں آ چکی ہے۔ سیاست کا ہر طالب علم اچھی طرح جانتا ہے کہ جس طرح قوموں نے ریاستوں کو جنم دیا ہے ریاستوں نے بھی قومیں تشکیل دی ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ پاکستان کا آئین عوام کے نمائندے تحریر کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قانون ساز اسمبلی کی بات کرتے تھے اور اس پر زور بھی دیتے تھے۔ آئین کو تمام تر اسمبلی...... اسمبلی کے تمام ارکان مل جل کر معرض وجود میں لائیں گے...... جس کا مطلب ہے کہ مسلم اور غیر مسلم اکٹھے مل کر اسے تحریر کریں گے...... اور صرف مسلمان ہی اسے تحریر نہیں کریں گے۔ اسمبلی میں اکثریت ایک حکومت کی تشکیل دے سکتی ہے لیکن آئین کی بنیاد ہمیشہ رائے عامہ پر ہی رکھی جاتی ہے۔

اپنے نظریات و تصورات کی روشنی میں قائداعظم نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ ماورائے پارلیمنٹ کوئی اپنا ذاتی آئینی فارمولا عوام پر تھوپیں۔ انہوں نے قانون ساز اسمبلی کے محض ایک رکن کی حیثیت میں اور بہ حیثیت صدر قانون ساز اسمبلی، پاکستان کے آئین کے بنیادی خدوخال کی توضیح کی۔ ان کی تقریر پاکستان کی پہلی قرارداد مقاصد تھی۔ پاکستانی عوام کے حقوق کا میگنا کارٹا...... کوئی بھی فرد، حتیٰ کہ بذات خود قائداعظم...... اپنے جانشینوں کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ان کے کلیات یا فارمولوں کو رد یا مسترد کر دیں لیکن جب 1949 میں ایسا کیا گیا۔ قائداعظم کی قرارداد کو رد یا مسترد کئے جانے کی وجوہات کو کم از کم ریکارڈ تو کیا جانا چاہیے تھا یا کوئی سبب تو بتایا جانا چاہیے تھا...... قائداعظم کی 11 اگست، 1947 کی تقریر وقت کی آزمائش پر پوری اتری ہے۔ کسی نظریے کی حقیقت کو پرکھنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ حکومت کے لیے اس میں جو ایجنڈا متعین کیا گیا ہے، ابھی تک فرسودہ یا متروک نہیں ہوا۔ درحقیقت قائداعظم کی ترجیحات پر عمل نہ کر کے ہر آنے والی حکومت نے خود کو انہی مسائل اور مشکلات میں گھرا ہوا پایا جن کی قائداعظم نے نشاندہی کی تھی۔

اسی طرح قائداعظم کی یہ اپیل کہ فرقہ واریت کو ترک کر کے مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے۔ آج بھی اتنی ہی اہم اور مناسب ہے جتنی کہ وہ پہلے تھی۔ شاید 64 سال بعد یہ پہلے سے بھی زیادہ مناسب اور اہم حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ سیاست کو مذہب کے ساتھ گڈمڈ کر کے ہم نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو شیعوں اور سنیوں میں تقسیم کیا ہے بلکہ سنیوں کو حنفیوں اور دیگر فرقوں میں بانٹا ہے۔ اور اس کے بعد انہیں دیوبندیوں اور بریلویوں میں تقسیم کیا ہے اور وغیرہ وغیرہ۔ اور ہم نے غیر مسلم پاکستانیوں کے لیے جگہ ہی نہیں چھوڑی کہ وہ عزت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وآبرو کی زندگی گزار سکیں۔

دیگر باتوں کے علاوہ جو بات سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ 11 اگست کی تقریر، آج کروڑوں پاکستانیوں کے دلوں کو پہلے سے کہیں زیادہ تقویت بخشتی ہے۔ پہلی نسلیں قائداعظم کی بصیرت کو سمجھنے میں قدرے دقت محسوس کرتی تھیں کیونکہ یہ ان کی ذاتی سوچ کا نتیجہ تھیں اور ان کے پاس وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے قدیم ساتھیوں کو بھی اپنا ماضی بدلنے کی ترغیب دے سکیں۔

آج پاکستانیوں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد قائداعظم کی بصیرت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اس کی سچائی کو دریافت کیا ہے۔ اسے سمجھا ہے اور جانا ہے اور اپنایا ہے ہر وہ شخص جو انتہا پسندی کے خلاف جدوجہد کرنے کا عزم اور ارادہ رکھتا ہے اور بلوچستان کے حقوق کا احترام کرنا چاہتا ہے جناح کا پاکستان قائم کرنے کی کال دے رہا ہے اور تمام وہ افراد بھی یہی کال دے رہے ہیں جو ملک میں امن وامان قائم کرنا چاہتے ہیں اور ملک کو رشوت اور بدعنوانی کی لعنت سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔

درحقیقت قائداعظم کی بصیرت کو اب پاکستان کی نجات کے لیے واحد راستہ تسلیم کیا جاتا ہے...... بہ حیثیت ایک جمہوری اور غیر مذہبی ریاست کے......

پاکستان کے عوام میں یہ احساس روز بروز بڑھتا جارہا ہے کہ وہ اپنے ملک کو ان بنیادوں پر استوار یا کھڑا کریں جن کی نشاندہی قائداعظم نے کی تھی۔ یہی وہ ایک امید ہے جسے پانے کی انہیں اب بھی توقع ہے اور اسی امید پر وہ زندہ بھی ہیں۔

(بشکریہ ماہنامہ 'جہد حق' اکتوبر 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں انتہا پسندی کی مختلف صورتیں

(محمد عامر رانا)

پاکستان کو اس وقت جہاد، عسکریت پسندی، مذہبی انتہا پسندی کے ضمن میں کئی ایک چیلنجز کا سامنا ہے۔ اگرچہ پاکستان کے عوام کی بڑی تعداد انتہا پسندی سے لاحق خطرات کے بارے میں ابہام کا شکار ہے۔ باوجود یکہ وہ اس نوعیت کے خطرے کی زد پر ہیں، سماجی سطح پر انہوں نے انتہا پسند اور شدت پسند قوتوں کو نظریاتی مدد فراہم کی ہے اور جہاد کرنے کے لیے ان کی معاونت کی ہے۔ پاکستان جیسے معاشرے میں جہاں مذہبیت عام آدمی کی زندگی کا اہم جزو ہے اور تنقیدی طرزِ فکر کی حوصلہ شکنی کی جائے، ایسے نظریاتی محرکات رائے عامہ پر اثر انداز ہونے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

متبادل طرزِ فکر اپنی عدم موجودگی کے باعث تا حال مبہم ہے۔ ریاست اور معاشرے کے ہنوز خطرے کی ہیئت اور پیچیدگیوں کا ادراک کرنا ہے۔ ماہرین انتہا پسندی کو ایک سیاسی مظہر سمجھتے ہیں، جو عدم مساوات، سماجی و معاشی ناانصافی اور غیر منصفانہ ریاستی پالیسیوں کے باعث تشکیل پاتا ہے۔ علمائے کرام اس مظہر کو مذہبی تناظر میں سیاسی وسماجی مسئلے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ دلیل دیتے ہیں کہ طالبانائزیشن ریاستی پالیسیوں کا نتیجہ ہے، جس میں ملک میں شریعت کے نفاذ میں ناکامی بھی شامل ہے۔ وہ پاکستانی معاشرے کے 'مغرب زدہ' ہونے پر بھی تحفظات کا اظہار کرتے ہیں۔ ریاست انتہا پسندی کو بیرونی عناصر سے جوڑتی ہے۔ مذکورہ بالا بیانیوں کا اظہار رائے عامہ پر بھی ہوتا ہے لیکن انتہا پسندی ان بیانیوں سے جن کا اظہار کیا جاتا ہے کہیں زیادہ پیچیدہ مظہر ہے اور پاکستان میں بہت ساری غالب آراء عملی شواہد سے محروم ہیں۔ مفروضے پر انحصار حل کی طرف نہیں لے جا سکتا۔

انتہا پسندی کی بہت ساری تعریفیں اس مظہر کو ایک مربوط عمل کے طور پر شناخت کرتی ہیں، جس میں انفرادی سطح پر کوئی شخص یا گروہ اپنے نظریات اور مقاصد کو دوسروں سے اعلیٰ اور معتبر تصور کرتا ہے۔ ان مقاصد کو کسی بھی قیمت پر اصل کے طور پر پیش کرنے کی خواہش تشدد کے استعمال کی جانب راغب کر سکتی ہے۔ پاک انسٹی ٹیوٹ فار سٹڈیز (PIPS) کی انتہا پسندی پر حالیہ تحقیق کے مطابق؛ اس مظہر نے دولت واختیار سے قطع نظر معاشرے کے تمام طبقات کو متاثر کیا ہے۔ تحقیق کے نتائج یہ واضح کرتے ہیں کہ غربت، عدم مساوات اور معاشی محرومیاں انتہا پسندی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے کچھ پہلوؤں پر اثر انداز ہوئی ہیں، لیکن یہ اس مظہر کی بنیادی وجہ نہیں ہیں۔ تحقیق سے یہ پہلو بھی سامنے آیا کہ معاشرے میں مذہبیت کا رجحان فروغ پا رہا ہے اور اگرچہ یہ تشدد انتہا پسندی اور مذہبیت کے مابین براہ راست تعلق کا سراغ نہیں لگا سکی، تاہم یہ مذہبی شدت پسندی کو پاکستان میں انتہا پسندی کے تمام رجحانات میں مشترک عامل کے طور پر شناخت کرتی ہے۔

بہت سارے عوامل ایسے ہیں جو تحقیق کے نتائج کی توثیق کرتے ہیں کہ پاکستان میں انتہا پسندی کے پنپنے کی کئی وجوہات ہیں اور یہ تین سطحوں پر موجود ہے۔ اول کم آمدن والے طبقے میں، خاص طور پر وہ علاقے جہاں گورننس کا نظام انتہائی ناقص ہے، جن میں افغان سرحد سے منسلک قبائلی علاقے اور خیبر پختونخواہ کے قریبی اضلاع شامل ہیں جہاں عدم مساوات اور غیر مؤثر انتظامی ڈھانچے نے دہشت گردی اور انتہا پسندی کو ہوا دی ہے۔ ان علاقوں میں موجود مدارس اور عسکریت پسند فرقہ ورانہ تنظیموں کے نیٹ ورک اس عمل کو تیز کرنے کا باعث بنتے ہیں، وہ ان عوامل کو اپنے انتہا پسند ایجنڈے کو فروغ دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں، جو انتہا پسندی اور فرقہ ورانہ تشدد کی وجہ بنتا ہے۔ یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ فرقہ پرست تنظیمیں، جیسا کہ سپاہ صحابہ پاکستان، لشکر جھنگوی اور تحریکِ جعفریہ، اہل حدیث اور بریلوی مکاتب فکر کے چھوٹے عسکریت پسند گروہوں نے ان علاقوں میں اپنے مضبوط مراکز قائم کر رکھے ہیں اور انہیں برقرار رکھا ہوا ہے۔ قبائلی علاقوں میں جاری عسکریت پسندی میں یہ عوامل اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ عسکریت پسند تنظیمیں بھی ان علاقوں سے ریکروٹ بھرتی کرتی ہیں اور پنجاب میں ہونے والے بہت سارے دہشت گرد حملوں میں ملوث حملہ آوروں کا تعلق بھی صوبے کے جنوبی حصے سے ہے۔

درمیانی آمدن والے طبقے میں انتہا پسندی کے رجحانات اور اس کی صورتیں مختلف ہیں۔ شہری اور نیم شہری علاقوں، جن میں وسطی اور شمالی پنجاب، سندھ میں کراچی اور حیدر آباد، خیبر پختونخوا کے اضلاع اور کشمیر شامل ہے ان علاقوں میں انتہا پسندی کی وجہ سیاسی ہے۔ یہ رجحانات اندرونی اور بیرونی سیاسی پیش رفت اور انتہا پسند گروہوں کی جانب سے انتہا پسند نظریات کے فروغ اور جہاد کے غلط تصورات اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں میڈیا کے طرز عمل کے باعث تقویت پاتے ہیں۔ عسکریت پسند تنظیمیں جیسا کہ لشکر طیبہ، جیش محمد، حزب اسلامی اور القاعدہ سے منسلک دہشت گردی کے سیل ریکروٹس کی بھرتی کے لیے انتہا پسند رویوں کے فروغ پر انحصار کرتے ہیں۔ انتہا پسندی کا مظہر ان علاقوں میں کسی خاص گروہ تک محدود نہیں ہے، اگرچہ مدراس کے طلبا اور مذہبیت کی جانب مائل افراد پُرتشدد نظریات کا اثر بہت تیزی سے قبول کرتے ہیں۔ کشمیر اور افغانستان میں مصروف عمل رہنے والی عسکریت پسند تنظیموں کے ڈھانچے کا گہرائی سے جائزہ لینے سے منکشف ہوتا ہے کہ ان میں شامل نوجوان رسمی تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہیں۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کے طلباء ونگ کے ساتھ ساتھ فرقہ پرست، فلاحی، انتہا پسند اور عسکریت پسند تنظیمیں بھی تا حال کالجوں اور یونیورسٹیوں میں فعال ہیں۔ ان تنظیموں کے ذیلی ونگ معاشرے کے دیگر طبقات پر اثر انداز ہونے کے لیے کوشاں ہیں۔ تقریباً ہر مذہبی تنظیم، خواہ اُس کے مقاصد سیاسی، فرقہ ورانہ یا عسکریت پسندانہ ہیں، وہ خواتین، تاجر، وکلا، ڈاکٹرز، اساتذہ اور دیگر پیشہ ورانہ گروہوں پر خاص توجہ مرکوز رکھتے ہوئے ذیلی ونگ چلا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہے ہیں۔ان ذیلی تنظیموں کا درمیانی آمدن والے طبقے میں انتہاپسندی کے فروغ میں اہم کردار ہے اور اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لیے لیے انٹرنیٹ کو بطور آلہ استعمال کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ درمیانی آمدن والے طبقے سے تعلق رکھنے والے نوجوان ان کا خاص ٹارگٹ ہیں۔ عالمی دہشت گرد تنظیمیں، جیسا کہ القاعدہ نے بھی انتہا پسندی کی اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا ہے، یہ فائدہ معاشی اور انسانی ذرائع کے حصول کے ساتھ ساتھ ملک کے کچھ حصوں میں اپنے بارے میں پائے جانے والی مثبت رائے کی صورت میں بھی ہے۔

معاشرے سے بڑھتی ہوئی بیگانگی ملک کے اعلیٰ متوسط طبقے اور نام نہاد اشرافیہ میں انتہا پسندی کی ایک بڑی وجہ ہے۔انتہا پسند گروہ، جیسا کہ حزب التحریر اور الہدیٰ آبادی کے اس حصے میں تبلیغ کی غرض سے فعال ہے۔ دونوں تنظیمیں خود کو تبدیلی کا آلہ کار کہتی ہیں، اگر چہ انہوں نے دو مختلف گروہوں پر توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ الہدیٰ خواتین میں کام کرتی ہے، اپنے اس واضح مقصد کے ساتھ کہ ''وہ انہیں اُن کی مذہبی اقدار کی جانب واپس لا رہی ہیں''۔ حزب التحریر ملک میں خلافت کے قیام کے مقصد کے لیے اپنی اوپر سے نیچے ترتیب وار حکمتِ عملی کے تحت اثر و رسوخ کی حامل اشرافیہ میں اپنا حلقہ تشکیل دینے کی کوشش کر رہی ہے۔

تاہم ان علاقوں اور آبادی کے مختلف حصوں میں انتہا پسندی کی موجودگی سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ یہ رجحانات مروج ہیں۔انتہا پسندی کی یکساں سطحیں، ہر چند محدود فرق کے ساتھ، دوسرے مسلمان ممالک میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ پیو ریسرچ سنٹر نے ایک حالیہ سروے میں اس مظہر کے حوالے سے تمام مسلم ممالک میں یکساں رائے عامہ کا مشاہدہ کیا ہے۔ باعث دلچسپ امر یہ ہے کہ پاکستان اور ترکی اُن مسلمان ریاستوں میں سے ایک ہیں، جہاں لوگوں میں دہشت گردی کے حوالے سے کم حمایت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں ممالک کے لوگ مذہب سے وابستہ شدت پسندی میں اضافے سے پریشان ہیں۔ انڈونیشیا، مصر، نائیجیریا اور اُردن میں انتہا پسندی کہیں زیادہ ہے۔

تاہم پاکستان نے کہیں بڑھ کر حوصلہ شکن دہشت گردی کا سامنا کیا ہے، جو اُن ممالک سے کہیں زیادہ ہے جہاں انتہا پسندی کی سطح قطعی طور پر بلند ہے اور اس اَمر کو شواہد کے بغیر درست تصور کر لیا گیا ہے۔ دہشت گردی کی بڑی پیمانے پر مخالفت کے باوجود پاکستان کے پر تشدد منظرنامے میں کون سے عوامل کا عمل دخل ہے؟ اس کا کوئی ایک جواب نہیں ہے۔ اول، ممکن ہے کہ معاشرہ تشدد کے خلاف ہو، لیکن یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ شدت پسندوں کے ایجنڈے کے خلاف بھی ہو۔ دوسرا اور سب سے اہم پہلو انتہا پسند گروہوں کی پاکستان میں موجودگی ہے۔ ایک سو سے زائد عسکریت پسند اور طالبان گروہ اور غیر ملکی دہشت گردوں کے نیٹ ورک پاکستان کے قبائلی میں موجود ہیں اور وہاں فعال ہیں، یہ پہلو پاکستان کا دوسرے مسلمان ممالک سے فرق ظاہر کرتا ہے۔ پاکستان میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کا تعلق سبب اور نتیجے جیسا ہے۔ اس تعلق کو کمزور کیے بغیر دہشت گردی کے چیلنج پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ لیکن مفروضوں سے آگے بڑھ کر انتہا پسندی کے مظہر کے بارے میں بنیادی آگاہی حاصل کرنا اس کی جانب پہلا قدم ہوگا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدیدیت سے دوری انتہا پسندی سے قربت

(خالد احمد)

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اکیسویں صدی میں جدیدیت کو رد کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دراصل جدیدیت کو رد نہیں کیا بلکہ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق خود کو تبدیل کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ انسانی معاشروں میں دو طرح کی سوچ پائی جاتی ہے۔ کچھ معاشرے اپنے عصری تقاضوں کے مدنظر خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ معاشرے اپنی اقدار اور روایات کی روشنی میں دنیا کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معاشرے میں تبدیلی لانے کے عمل میں دو اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے نصب العین اور طریقہ کار کی بنیاد زمینی حقائق پر رکھی جائے۔ جبکہ دوسرا اصول یہ ہے کہ اپنے عقائد کی بنیاد پر اپنا نصب العین اور اس کی طرف بڑھنے کی حکمت عملی تشکیل دی جائے۔ جن معاشروں میں عقائد کو بنیاد بنا کر اپنا اجتماعی لائحہ عمل تشکیل دیا جاتا ہے وہاں جبر و تشدد ناگزیر ہو جاتا ہے۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں نے قومی ریاست کے تصور کو قبول کرتے ہوئے جدیدیت کی طرف قدم بڑھایا تھا لیکن اکیسویں صدی میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد قومی ریاست کے تصور کو رد کرتے ہوئے جغرافیائی سرحدوں اور تاریخی و ثقافتی حد بندیوں سے بے نیاز ہو کر جہاد کی طرف مائل ہے۔ اس عمل کو سمجھنے کے لیے القاعدہ کے رہنما ایمن الظواہری کا پاکستان کے آئین کے بارے میں 65 صفحات پر محیط مقالہ پڑھیے جس کا عنوان ہے ''سپیدہ سحر اور جراغ''

مسلم اکثریتی معاشروں میں قانون سازی کے حالیہ رجحانات میں جدیدیت کا یہ رد بہت واضح ہے۔ ان ممالک میں بتدریج قانون سازی اور پالیسیوں میں عقل و خرد اور عملیت پسندی کی بجائے عقائد کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان ممالک میں مفروضہ یا حقیقی دشمنوں کے خلاف عوام کے غم و غصے کی بنیاد یہ ہے کہ وہ دنیا کو اپنے عقائد کی روشنی میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معروف سماجی محقق ایمن بی ساجو نے 2008 میں ایک دلچسپ کتاب مرتب کی تھی جس کا عنوان تھا ''مسلم جدیدیت: عوامی تخیل کے اظہارات'' انہوں نے اس کتاب میں جدیدیت کے بارے میں مسلمانوں کے رویے کا تجزیہ کیا ہے۔ اس میں یہ دلچسپ بات سامنے آئی ہے کہ کم وبیش ہر مسلم اکثریتی ملک میں جدیدیت کو رد کرنے سے پہلے خود اپنے ہی کچھ مقامی مفکرین کو رد کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں سرسید احمد خان اور علامہ اقبال کے خیالات کو رد کرنا ضروری قرار پایا تاکہ طالبان اور القاعدہ کا راستہ ہموار کیا جاسکے۔

مغرب میں جدیدیت کی بنیاد دنیا کے استقرائی تجزیے پر رکھی گئی ہے۔ جدیدیت کی طرف اس رویے کی بنیاد عمرانیات کے ماہر میکس ویبر (1920-1864) کی ایک کتاب 'پروٹسٹنٹ اخلاقیات اور سرمایہ داری کی مبادیات (1905) میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ میکس ویبر نے اس کتاب میں عقلی بنیاد پر ثقافت اور سماجی روایات کے امتزاج کا تجزیہ کیا اور اس تجزیے کی مدد سے مغربی جدیدیت کے خدوخال واضح کیے۔ بعدازاں عقل وخرد کا یہ علمی منہاج سیکولر یا قومی ریاست سے مذہب کی علیحدگی سے منسوب ہوگیا۔ ریاست اور مذہب کی اس علیحدگی کو رد کرنے سے مسلمان گویا اپنی اجتماعی زندگی سے جدیدیت کو خارج کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھاتے ہیں کیونکہ عقیدے میں تجربے کی گنجائش نہیں ہوتی چنانچہ ''مذہبی ریاست'' کی کارکردگی کے بارے میں جتنے بھی شواہد پیش کیے جائیں ان کی روشنی میں اصلاح یا تبدیلی کی ترغیب پیدا نہیں ہوتی۔

1- قرآن پاک کے مندرجات میں سے کوئی بھی حصہ غلط یا غیر حقیقی یا غیر تاریخی نہیں ہوسکتا

2- قرآن میں کہی گئی کوئی بات قوانین قدرت سے متناقص نہیں ہوسکتی

3- سرسید نے قرآن میں نسخ یا تنسیخ کے تصور کو رد کیا ہے۔ نسخ کے اس تصور میں اگر قرآن میں بیان کردہ کوئی حصہ پہلے سے نازل شدہ متن سے متصادم پایا جائے تو قدیمی حصے کو منسوخ سمجھا جاتا ہے۔

4- بینک سے ملنے والے سود کو رِبٰو قرار نہیں دیا جاسکتا

5- حدود کے تحت طے کردہ سزاؤں پر بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں نظرثانی کی جانی چاہیے۔

جہاں تک علامہ اقبال کے خیالات کا تعلق ہے، 25 دسمبر 1986 کو قائداعظم محمد علی جناح کے یوم پیدائش کے موقع پر ایک قومی سیمینار منعقد ہوا تھا جس کی صدارت جنرل ضیاالحق نے کی تھی۔ اس اجتماع کا موضوع یہ تھا کہ پاکستان کا اہم ترین مسئلہ کیا ہے؟ علامہ اقبال کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال اس وقت سپریم کورٹ کے جج تھے۔

جاوید اقبال نے اپنی حالیہ کتاب ''خطبات اقبال میں علامہ اقبال کے بہت سے ایسے نظریات بھی پیش کیے ہیں جنہیں ہم رد کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال سٹاک ایکسچینج، بیمہ کمپنیوں، عورتوں کے حق طلاق نیز انضباط حمل کے حامی تھے۔ نیز یک زوجیت کے بارے میں ان کے خیالات روایتی علماء سے مختلف تھے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انہوں نے اس کانفرنس کے دوران رائے دی کہ جنرل ضیاالحق نے جو حدود قوانین نافذ کیے ہیں انہیں علامہ اقبال اپنے چھٹے خطبے میں رد کر چکے ہیں۔ اس کے جواب میں ضیاالحق نے اعلان کیا کہ اگر ایسا ہے تو ہمیں علامہ اقبال کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ بعدازیں سپریم کورٹ کے شریعت بنچ نے بھی بینک کے سود کے بارے میں اس نقطہ نظر کو رد کر دیا جس پہ علامہ اقبال اور سرسید احمد خان کا اتفاق رائے تھا۔ جاوید اقبال نے اپنی حالیہ کتاب 'خطبات اقبال' میں علامہ اقبال کے بہت سے ایسے نظریات بھی پیش کیے ہیں جنہیں ہم رد کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال شاک ایکسچینج، بیمہ کمپنیوں، عورتوں کے حق طلاق نیز انضباط حمل کے حامی تھے نیز یک زوجیت کے بارے میں ان کے خیالات روایتی علماء سے مختلف تھے۔

آج کی دنیا میں جہاد کے تصور سے بڑھ کر جدیدیت کی مخالفت کا مؤثر ترین ہتھیار ممکن نہیں۔ جہاد کا تصور قومی ریاست کو تہس نہس کر دیتا ہے اور جو ریاست جہاد کی سرپرستی کرتی ہے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ آج ہم پاکستان میں انتشار اور انحطاط کے جو مظاہر دیکھ رہے ہیں ان کی وجہ جہاد کا یہ تصور ہی ہے۔

(بشکریہ 'نوائے انسان' جون 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندی کے فروغ میں جاگیرداری نظام کا کردار

(مہتاب راشدی)

"اِن سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں، اُن کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انھی کی پیروی کیے چلے جائیں گے؟ یہ لوگ جنھوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے، ان کی حالت بالکل ایسی ہے، جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سُنتے۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، اِس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی"۔ (سُورۃ البقرہ، آیات 171,170,169)

قرآنِ پاک کی یہ آیات تلاوت کرتے ہوئے، میری آنکھوں کے سامنے ملک کے معزز ادارے سینٹ کے ایک معزز رکن کی صورت آ گئی، جب وہ بہت ڈھٹائی سے بلوچستان میں قتل کی جانے والی خواتین کو زندہ دفن کرنے پر تبصرہ فرما رہے تھے۔ وہ اپنی جہالت پر نازاں تھے، جو انھیں یہ بتا رہی تھی کہ ایسا کچھ کر گزرنا اُن کی "روایات" کا حصہ ہے، لہٰذا یہ معاملہ اتنا بڑا تو ہے ہی نہیں، جس پر ایسا شوروغوغا اُٹھا ہے۔

افسوس! صد افسوس! یہ روایات کے مارے ہوئے لوگ، اپنے جیسے ہی جانوروں کی ترجمانی کرنے کے لیے، انھی کے ووٹوں سے اعلیٰ ایوانوں تک پہنچتے ہیں اور ایسی رعونیت سے اپنے غلط رواجوں کا دفاع کرتے ہیں، جن سے ان کی توقیر تو کیا بڑھتی ہے، باقی لوگوں کا بھروسہ ان قانون ساز اداروں سے اُٹھ جاتا ہے۔

پاکستان کی تاریخ تو اب آئینی، قانونی اور معاشرتی المیوں سے لبریز ایک داغ داغ تاریخ ہے۔ پوری قوم کو جانوروں کا ریوڑ سمجھنے والے، انھی کے ووٹوں سے جیت کر شہنشاہ بنتے ہیں اور پھر وہ ان سے سلوک بھی شہنشاہوں جیسا ہی کرتے ہیں۔ جمہوریت کا کلمہ پڑھنے والے، غیر جمہوری رویے رکھتے ہیں۔ یہ اصل میں کچھ اور ہوتے ہیں اور دِکھائی کچھ اور دیتے ہیں۔ اسلام کا نام لینے والوں کی مجبوری یہ ہے کہ وہ غلطی سے مسلمان گھرانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں پیدا ہو گئے ہیں، لیکن اسلامی تعلیمات تو دُور کی بات ہے، محسوس یہ ہوتا ہے کہ انسانیت پر بھی ان کا یقین کہیں نہیں۔

یُوں تو ہمارے ملک میں عورتوں کی حیثیت دو کوڑی کی بنا کر رکھ دی گئی ہے۔ اسمبلیوں میں عورتوں کی ایک بڑی تعداد کا پہنچ جانا ایک خوش آئند بات سہی، مگر ہمارے معاشرے میں ایک عام عورت کے حقوق کی جو نفی ہو رہی ہے، وہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ میں جب سندھ کی سرزمین پر کاروکاری کے لگنے والے داغ کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں، یہ میرا وہ سندھ تو ہے ہی نہیں، جس پر صُوفیوں، بزرگوں کا سایہ ہے، جس کی مٹی سے جنم لینے والے شاہ لطیف نے عورت کو ایک ایسی بلندی پر بٹھایا ہے کہ اُن کے کلام کا ہر باب کسی نہ کسی عورت کے نام سے منسوب ہے، جو اپنے جذبات کا اظہار عورت کی زبان سے کرتے ہیں۔ جس نے وطن کی محبت کا حوالہ ''ماروی'' کو بنایا۔ جو اپنے محبوب کی تلاش میں سرگرداں ''سسی'' کو جدوجہد کی علامت بنا دیتے ہیں، جس نے ''نوری'' کی انکساری پر ایک حاکم کے دبدبے کو قربان ہوتے دِکھایا، جس نے ''سوہنی'' کو اپنے محبوب سے ملنے کے لیے دریا کی بپھری لہروں سے لڑتے جان دے دینے کو محبت کی معراج جانا۔ اُسی بھٹائی کی محبوب سندھ کی عورت، سماجی رویوں سے نالاں ہے۔ قلندر شہباز، بچل سرمست اور شاہ عنایت کے سندھ کی شہرت آج عورتوں کو قتل کیے جانے کے حوالے سے زیادہ ہے وران صُوفیوں کا پیغامِ امن سنانا کسی بہرے کے کانوں پر دستک دینا ہے۔ سندھی عورت ہمیشہ لائقِ احترام ٹھہرائی گئی۔ یہاں تو باپ محبت اور احترام کے مارے اپنی بیٹیوں کو ''امڑ'' (ماں) کہہ کر بلاتے ہیں۔ یہاں کی تو یہ روایات ہیں کہ کسی مقتول کے گھر اگر کوئی بچی بھی بھیجی گئی تو اُس کے آنے کو عزت دیتے ہوئے، خون معاف کر دیے جاتے۔ آج ہمارے سامنے سندھ کا یہ کون سا بھیانک چہرہ آ گیا ہے، جہاں کی عورت اپنی رائے کے اظہار پر گولیوں سے بھون دی جاتی ہے۔

نام نہاد جرگوں اور فیصلوں کا شکار بے بس عورت آج سرگرداں ہے، انصاف مانگ رہی ہے۔ سرحد کی بیٹی تو اپنی ماں کے اشارے پر اس کی آنکھوں کے سامنے وکیل کے کمرے میں مار دی گئی اور سینٹ میں اس واقعے پر مذمتی قرارداد اس لیے نہیں پیش کی جا سکتی کہ وہاں سرحد کے ''باغیرت'' سردار موجود تھے، جن کے نزدیک یہ عمل صحیح گردانا جاتا ہے۔ اس 21 ویں صدی میں ہم پیچھے کی طرف لوٹ رہے ہیں، جب عورت کو جانوروں سے کم تر جانا جاتا تھا۔ مملکتِ خداداد پاکستان کی مسلمان عورت انصاف مانگ رہی ہے۔ ہے کوئی اُسے انصاف دینے والا؟ جب تک قانون ساز اداروں میں اندھے، بہرے اور گونگے نمائندوں کو بھیجا جائے گا، ان لاچار، بے زبان عورتوں کا خون اسی طرح سستا ہوتا رہے گا۔ ہمیں غیرت کے تصور کو بدلنا ہوگا۔ غیرت یہ نہیں کہ اپنی ماں، بہن اور بیٹی کو بُرائی کا داغ دے کر سرِ بازار رسوا کیا جائے۔ غیرت تو یہ ہے کہ اُسے سینے سے لگا کر دنیا کی تلخیوں سے بچایا جائے۔

وہ باپ کیسا باپ ہوگا، جو اپنی لاڈلی بیٹی کو اپنے ہی ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے، کیا اس کے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُس کی آنکھوں میں نیند اترتی ہوگی؟ کوئی بھائی کیسے اُس بہن کو سرخ خون میں نہلا دیتا ہے، جو اپنے بھائی پر واری قربان جاتی ہے۔ یہ کیسی وحشت ہے، جس سے ہمارے دل پتھر ہوگئے ہیں؟ یہ ہمارے معاشرے کی بھیانک شکل ہے، یہ عکس ہے، اُوپر سے لے کر نیچے تک سب کا، جیسی قوم ویسے حکمراں...... کس کس کا رونا رویا جائے؟

اِس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ان تین یا پانچ جیتی جاگتی عورتوں کو محض گولیاں مار کر قتل کیا گیا اور زمیں دوز کر دیا گیا۔ یا پھر یہ کہ گولی مار کر، تڑپتی عورتوں کے مرنے کا انتظار کیے بغیر انھیں دفنا دیا گیا۔ المیہ تو یہ ہے کہ اِس معاشرے کے سرکردہ لوگ اس عمل پر شرمندہ نہیں ہیں، وہ اس قبیح فعل کے صحیح ہونے کا جواز اپنی روایات میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر ایسی روایتوں پر وہ فخر مند ہیں، تو پاک کر دینا ہوگا۔ اعلیٰ ایوانوں کو ان جاہل سرداروں سے، جن کی آنکھوں میں نہ شرمندگی کی رمق ہے اور نہ پیشانی پر ندامت کا پسینہ...... ہمیں اُٹھ کھڑے ہونا ہوگا ان وحشی روایات کے خلاف...... کہ پاکستان کی عورت کی نجات اِسی میں ہے۔

(بشکریہ 'جہدحق' اکتوبر 2008)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندی کی راہ ہموار کرتا نظام تعلیم

(آئی۔اے۔رحمٰن)

تنگ نظر احمق پیدا کرنے میں سرکاری سکولوں کی نصابی کتب جو کردار ادا کرتی ہیں...... قطع نظر اس حقیقت کے کہ ان میں سے تمام خودکش بمبار نہیں بنتے ..... حالات سے بے خبر پالیسی سازوں کی اس طرف توجہ نہیں گئی۔ اب وقت ہے کہ اس خطرناک رویے کو ترک کیا جائے۔

سول سوسائٹی کی بیشتر تنظیموں نے نصابی کتب میں موجود اس شر انگیز مواد کی نشاندہی کی ہے (خاص طور پر ڈاکٹر اے اتچ نیر اور احمد سلیم کی نصاب کے حوالے سے شاندار تحریری تنقید جو 2003ء میں منظر عام پر آئی اور جس کا عنوان ''منقسم تباہی'' تھا) لیکن نظرثانی شدہ اور یکجا کردہ نصاب نے محض اس بات کی توثیق کی کہ اس کے مرتب کنندگان ایک کثرت الوجود، جمہوری معاشرے کے تقاضے پورا کرنے میں ناکام رہے۔

کئی سال قبل پنجاب میں اول سے جماعت سوئم تک کی کلاسوں کے لئے نئی نصابی کتب پر کہنہ مشق نصابی ماہر مسٹر سبط حسن نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا کہ ان کا مواد بچوں کو کسی بھی مضمون میں بنیادی معلومات حاصل کرنے میں مدد نہیں کرتا تھا اور یہ کہ یہ کتابیں مذہبی اور اخلاقی تبلیغ سے اٹی پڑی تھیں اور ایسے کسی موضوع کی طرف کوئی توجہ دینے کی زحمت نہیں کی گئی تھی جن کا تعلق قوم کی تعمیر و تشکیل سے ہو۔ یہ تنقید اب بھی جائز ہے۔ اگر ابتدائی کلاسوں میں مذہبی تعلیم کے پروگرام کا کسی طور کوئی جواز پیش بھی کیا جا سکے لیکن اس بات کا کوئی دفاع پیش نہیں کیا جا سکتا کہ بچوں کو ان امور سے بے خبر اور لاعلم رکھا جائے جو ان کے دماغ کی متوازن نشوونما کے لئے لازمی ہیں۔

اس مختصر مضمون میں پنجاب میں کلاس اول سے کلاس پنجم میں پڑھائی جانے والی نصابی کتب کے حوالے سے تفصیلی جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ایک سرسری مطالعہ بھی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ نصابی کتب بے ہنگم طریقے سے تحریر کردہ مذہبی مضامین سے بھری ہوئی ہے اور بظاہر ان کا مقصد یہی ہے کہ بچوں کو معاشرے اور ماحول سے بے خبر رکھا جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مثال کے طور پر کلاس اول کے لئے ''میری کتاب'' میں لکھا ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان اور کشمیر پاکستان کے حصے ہیں۔ کیا بچوں کو یہ بتانا جائز اور درست ہے کہ پاکستان میں کشمیر بھی شامل ہے۔ پرائمری کلاسوں کی نصابی کتب میں صوبوں کا ذکر ہے لیکن پنجابی، سندھی، پختونخواہ اور بلوچ عوام کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔

(کلاس اول سے پنجم تک) تمام ''میری کتابوں'' میں مسلمانوں کو بھائی بھائی کہا گیا ہے...... یہ کہ مسلمان ہونے کے ناطے تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں...... بار بار دہرائی گئیں اس قسم کی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مشترکہ عقیدہ ہی بھائی چارے کی واحد بنیاد ہے۔ چونکہ پاکستان کے عوام کو ایک دوسرے کے بھائی کے نام سے نہیں پکارا گیا...... مسلم بھائی چارہ قومی بنیاد پر قابل تقسیم نہیں ہے...... ان کتابوں میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور نہ ہی اس بات کا کوئی امکان نظر آتا ہے کہ دنیا بھر کے تمام انسان ایک واحد انسانی خاندان کے افراد ہیں۔ نصابی کتب کے مصنفین اور سرکاری بورڈ حقائق کو کہانیوں کے ساتھ ملانے سے بھی نہیں ڈرتے۔ کلاس سوئم کے لئے نصابی کتاب طلباء کو یہ بتاتی ہے کہ تمام لوگوں نے ...... مردوں اور خواتین...... بوڑھوں اور نوجوانوں، حتیٰ کہ بچوں نے بھی...... تحریک پاکستان کی حمایت کی۔ ان سب کا ایک ہی نعرہ تھا...... ''لے کے رہیں گے پاکستان...... بن کر رہے گا پاکستان...... پاکستان کا مطلب کیا...... لا الہ الا اللہ......

کیا چھوٹے بچوں کو مخصوص اصول یا عقائد ذہن نشین کرانا...... ایسے اصول یا عقیدے جو انتہائی متنازعہ ہیں یا انہیں ایسی ضابطہ بندیوں میں جکڑنا جن کے بارے میں اتفاق رائے نہیں پایا جاتا...... کوئی دانشمندی ہے۔

کلاس چہارم کے لیے ''میری کتاب'' کے مصنف اس سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ ''مینار پاکستان کی کہانی'' نامی سبق میں وہ کہتے ہیں؛ ''1940 میں مسلم لیگ کے جلسے کے دوران جس میں ''قرارداد لاہور'' منظور کی گئی۔ قائداعظم نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ انڈیا کے شمال، جنوب اور شمال مشرق میں واقع مسلم اکثریتی صوبوں میں ایک اسلامی ملک قائم کرنا چاہتے ہیں'' یہ بیان درست نہیں ہے۔

اسی طرح ان نصابی کتب میں متعدد ایسے انکشافات کئے گئے ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ایک کسان تھے...... جس سے روئے زمین پر قدم رکھنے والے پہلے انسان کو یہ استحقاق حاصل ہوتا ہے کہ اسے زراعت کے بانی کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ یا یہ دعویٰ کہ ''حضرت علی علیہ السلام کافروں اور مسلمانوں کے درمیان تمام جنگوں میں بہت بہادری کے ساتھ لڑے تھے''۔ شاید مصنف یہ کہنا چاہتا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے ان تمام جنگوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو مسلمانوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زندگی میں لڑی تھیں۔ لیکن اگر پیغام یہ پہنچانا مقصود تھا کہ مسلمانوں کی کافروں کے خلاف جنگیں حضرت علی علیہ السلام کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہوگئی تھیں تو اس کے لئے شاید بہتر اسلوب بیان بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔

کلاس اول کے لئے ایک معلومات عامہ کی کتاب مختص ہے جسے ''پنجاب کے (سابق) وزیراعلیٰ کے تعلیمی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصلاحات کے پروگرام'' کے تحت شائع کیا گیا۔ کتاب انگریزی زبان میں ہے یہ ایک خوش آئند بات ہے لیکن استعمال کی گئی زبان کے نمونے ملاحظہ کیجئے۔

1- In which city they were born?

(وہ کس شہر میں پیدا ہوئے تھے؟)

2- What did they used to do for remaining healthy?

(وہ صحت مند رہنے کے لئے کیا کیا کرتے تھے؟)

3- Never do violation of red singal

(سرخ بتی کی کبھی خلاف ورزی مت کرو)

4- There is no cleanliness of the trash bin

(کوڑے دان کو صاف نہیں کیا جاتا)

یا

کوڑے دان صاف نہیں ہوتا)

5- There is no cleanliness of streets

(گلیوں کی صفائی نہیں کی جاتی)

یا

(گلیاں صاف نہیں ہوتیں)

شائد نصابی ماہرین اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ بہت سے لوگ زندگی بھران غلطیوں سے چھٹکارہ پانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ جن کے وہ بچپن میں عادی ہو جاتے ہیں۔

بسا اوقات، یوں بھی محسوس ہوتا ہے جیسے کسی اہم حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر ''امام جعفر صادق'' کے بارے میں لفظ شیعہ ایک بار بھی استعمال نہیں کیا گیا (کتاب برائے جماعت چہارم)۔ اس بات کے کہنے میں کیا حرج تھا کہ بہت سے مسلمان اس مذہبی عقیدے کی پیروی کرتے ہیں جسے امام جعفر نے یکجا کیا تھا۔ فرقوں سے متعلقہ مسائل کو اس طرح حل نہیں کیا جا سکتا کہ فرقوں کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے۔ کلاس چہارم کی مقرر کردہ نصابی کتاب میں (اردو بک نمبر 4) طلباء کو ان دو شاعروں کے بارے میں بتایا جاتا ہے جنہوں نے اپنا کلام پنجابی زبان میں تخلیق کیا...... میاں محمد بخش اور میاں وارث شاہ...... اور دونوں ہی بنیادی طور پر مذہبی شخصیات ہیں ...... کلاس پنجم کے لئے مقررہ کردہ صرف اردو کی کتاب میں ہی طلباء کو یہ بتایا جاتا ہے کہ سچل سرمست سندھی زبان میں ''کافی'' کی روایت کے بانی تھے...... '' جبکہ حضرت بلھے شاہ کی بدولت پنجابی زبان '' کافی '' کی روایت سے لبریز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور شاداب ہے......'' سچل سرمست بھی بنیادی طور پر ایک مذہبی شخصیت ہیں۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کسی پختون یا بلوچی شاعر سے واقف نہیں ہے...... یا کسی اور زبان کے تخلیق کار سے...... یا شاید یہ مناسب تصور نہیں کیا جاتا کہ انہیں پنجاب کے سکولوں میں متعارف کروایا جائے۔

کلاس پنجم کے لئے اردو کی کتاب طلباء کو اس بات کی اجازت فراہم کرتی ہے کہ وہ پنجاب سے پرے بھی نظر دوڑائیں......اور کوئٹہ اور زیارت کو دیکھیں...... جبکہ زیارت کے بارے میں سبق یہ انکشاف نہیں کرتا کہ یہ شہر بلوچستان میں واقع ہے۔......کوئٹہ کے بارے میں تذکرے میں بلوچستان کا ذکر ناگزیر ہے......'' رقبے کے لحاظ سے بلوچستان ہمارے وطن عزیز کا سب سے بڑا صوبہ ہے...... اس صوبے میں کئی قبائل آباد ہیں...... اس کے باشندے......قومی زبان اردو کے علاوہ...... بلوچی، براہوی اور پشتو بولتے ہیں......''

کلاس اول سے کلاس سوئم کے لئے ''میری کتاب'' اور چوتھی کلاس کے لئے اردو کی کتاب میں پاکستان کے غیر مسلم شہریوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صرف کلاس پنجم کے لئے اردو کی کتاب میں' ہمارا پنجاب'' نامی مضمون میں غیر مسلموں کا ذکر دستیاب ہے جو یوں ہے:'' پنجاب میں رہنے والوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ عوام اپنی زندگیاں اسلامی اصولوں کے مطابق بسر کرتے ہیں۔ (دغا یا فریب لاعلمی سے شیریں ہوتا ہے) یہاں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی آباد ہیں، وہ اپنے طور طریقوں اور عقائد کی پیروی کرتے ہیں......''

ان نصابی کتب میں بیان کردہ تمام کہانیوں میں بچوں کو مسلم لڑکوں اور لڑکیوں کے طور پر دکھایا گیا ہے اور ان کی کسی غیر مسلم بچے یا بچی سے ملاقات نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے کے ساتھ تعامل کرنا تو دور کی بات ہے......کلاس اول سے کلاس پنجم تک کے لئے نصابی کتاب میں 41 فیصد نظمیں ہیں۔ لیکن علامہ اقبال کی خوبصورت نظم'' بچے کی دعا''۔ جو ہر سکول میں کلاسوں کے آغاز سے پہلے پڑھی جانی چاہیے۔ کلاس پنجم کی اردو کی کتاب میں سب سے آخر پر آتی ہے......شاید اس لئے کہ اس میں غریبوں اور کمزوروں کا ذکر ہے...... یہ باور کرنا بہت سہل ہے کہ کس نوعیت کی نیم حقیقتیں اور مسخ شدہ حقائق بچوں کے کانوں میں انڈیل کر انہیں بہرہ بنایا جا رہا ہے۔ مسلمان بچوں کو بار بار دائرہ اسلام میں داخل کرنے کی کوشش اور ہر ہیرو کو مذہبی لباس پہنانا' اکتاہٹ یا اس سے بھی بدتر ردعمل پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ مذہب سے متعارف کروانا ایک علیحدہ بات ہے اور مذہبی جنون کا خبط اور آسیب اس سے یقیناً کہیں کم مستحسن مہم یا ذمہ داری ہے۔

معیاری اور مناسب تعلیم کے مقصد کو نقصان پہنچانے کے علاوہ اس قسم کی مہمات حسین ذہنوں کو درہم برہم کرتی ہیں اور وقت کے زیاں کا سبب بنتی ہیں...... ان خیالات کا اظہار اورنگ زیب اور سرسید جیسی عظیم مذہبی شخصیات نے کیا ہے۔ تاہم، اگر ہم پرائمری کلاسوں کے لئے نصابی کتب کو اس نے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ ان میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے یا صرف پسندیدہ باتوں کا ہی ذکر کیا گیا ہے''شہریت'' کے مضمون کی کتابوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں کافی شر انگیز مواد شامل کیا گیا ہے۔ کراچی میں منعقدہ ایک حالیہ سیمینار کے دوران سندھ کی نصابی کتب میں موجود مواد کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اسے دقیانوسی اور مسخ شدہ قرار دیا گیا۔ پنجاب کو بھی اسی طرح کی تشویش ناک صورت حال کا سامنا ہے۔

یہاں بھی کلاس نہم سے بارہویں کلاس کی ''شہریت'' کی کتابیں قائداعظم کے ان احوال سے بھری پڑی ہیں جن پر اپنی مرضی اور صوابدید کے مطابق نظر ثانی کی گئی ہے یا ان میں مرضی کے مطابق تبدیلیاں اور ترامیم کی گئی ہیں۔ قائداعظم کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انہوں نے پاکستان کو ایک ''تجربہ گاہ'' قرار دیا تھا جہاں اسلامی اصولوں پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ یہ تمام کتابیں متعدد موضوعات کی متنازعہ تشریحات سے لبریز ہیں..... مثال کے طور پر نظریہ پاکستان، اسلامی ریاست اور دو قومی نظریہ کی مسلسل مناسبت۔ چند مثالیں ملاحظہ کی جائیں:

☆ جمہوریت اور آمریت دونوں کے سات فوائد اور آٹھ نقصانات ہیں۔ آمریت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کے تحت ''تمام قوم ترقی کرنے کے جذبے سے سرشار ہوتی ہے اور ہر شہری ایماندارانہ محنت اور مشقت کو اپنا فرض سمجھتا ہے..... چنانچہ تخلیقی صلاحیتوں اور ترقی کی رفتار تیز ہوتی ہے.....'' آمریت کا دوسرا مثبت پہلو یہ ہے کہ ''اپوزیشن (حزب اختلاف) کی سیاسی جماعتوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے عوام کو متعصب اور گروہی سیاست اور دھڑے بندی سے نجات حاصل ہو جاتی ہے..... عوام کی یک جہتی۔ قومی اتحاد کی ضمانت فراہم ہوتی ہے لہٰذا ملک خوشحال اور مضبوط ہوتا ہے.....'' (شہریت کی کتاب برائے کلاس نہم اور دہم'')

☆ ''اردو زبان کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی تائید کرتی ہے..... لہٰذا مذہبی اور قومی نقطۂ نظر سے اس کی ترقی و فروغ ہماری اہم ذمہ داریوں میں شامل ہے.....'' (اسی کتاب میں سے)

☆ ''صوبائیت ایک لعنت ہے جو قومی اتحاد کے لئے نقصان دہ ہے..... بعض موقع پرست عناصر صوبائی اور علاقائی تعلق داریوں کو ہوا دیتے ہیں..... ہمیں ایسے رجحانات کا خاتمہ کرنا چاہیے.....'' (اسی کتاب میں سے)

☆ بارہویں کلاس کی نصابی کتاب میں ''تحریک خلافت'' پر بحث کی گئی ہے جو چار صفحات پر محیط ہے..... لیکن اس میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ قائداعظم کی اس کے متعلق کیا رائے تھی.....

☆ وفاقی نظام کا ایک منفی پہلو 'عدلیہ کا آمرانہ رویہ ہے'..... ''وفاقی اور صوبائی حکومتیں اکثر آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں..... جو ایک طرف وفاق کو کمزور کرتا ہے..... اور دوسری طرف عدلیہ جو آئین کی محافظ سمجھی جاتی ہے..... اسے مداخلت کرنے کا موقع مل جاتا ہے.....'' (بارہویں کلاس کی کتاب)

جب ایک طالب علم یہ پڑھتا ہے کہ ''پاکستان میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کردہ نظام کو عملی طور پر نافذ کرنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضروری ہے تاکہ عالمی اسلامی انقلاب دنیا کے ہر کونے پر غلبہ حاصل کرلے'' (کتاب برائے کلاس نہم اور دہم) تو اسے یقیناً حیرانگی نہیں ہوگی کہ اگر طالبان یہاں آجاتے ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے۔

نصابی کتب کی فروگذاشتیں اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض ہیں..... مثال کے طور پر ان کتابوں میں ایسا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے جو یہ بتائے کہ مطلق العنان حکومتوں اور جنگ کے حامیوں نے پاکستان کو کتنا شدید نقصان پہنچایا۔ متعدد ماہرین تعلیم کا یہ دعویٰ ہے کہ 2008 میں شہریت کی نصابی کتب پر نظر ثانی کی گئی تھی لیکن وفاقی حکومت سفارشات کو دبا کر بیٹھی ہوئی ہے۔ جن کا مقصد ان کتابوں کے موجودہ مواد کو شہریت کے جدید اور جمہوری تصورات سے تبدیل کرنا تھا۔ اسی طرح اس نوعیت کے الزامات بھی عائد کیے گئے کہ 2004ء اور 2007ء میں نصاب پر نظر ثانی کرنے کے جو فیصلے کیے گئے تھے ان پر مکمل طور پر یا مناسب طریقے سے عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اگر یہ دعوے درست ہیں تو یہ ایک اول درجے کی رسوائی اور بدنامی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر جو عیاں ہیں۔ کثیر الوجود اور شراکتی جمہوریت، بین المذاہب یکجہتی اور انسانی حقوق کی اقدار کو فروغ دینے کے لئے نصابی کتب پر نظر ثانی کے کام میں اگر کوئی تاخیر کی جاتی ہے۔ تو حکومت پر یہ الزام عائد کیا جاسکتا ہے کہ وہ اگر قصداً نہیں تو نادانستہ طور پر ملک میں مذہبی انتہا پسندی کی بنیادیں رکھ رہی ہے۔

(بشکریہ 'جہد حق' مارچ 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں مذہبیت کا بڑھتا ہوا رجحان

(محمد عامر رانا)

پاکستان میں مذہبیت کا دائرہ کار یکسانیت سے تعبیر ہے، بلاتخصیص مکتب فکر اور فرقے کے سیاسی، سماجی اور نظریاتی نقطہ نظر میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ اختلاف کا دائرہ کار فرقہ ورانہ بنیادوں پر استوار ہے اور یہی اس کی حد بندی ہے۔

پاکستان میں مذہبی سیاسی جماعتیں 1947ء میں قیام پاکستان سے ہی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مصروف عمل ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد ریاست کے اندر اسلام کا نفاذ ہے۔ جس کے تحت معاشرے میں مذہبی اصولوں کو فروغ دینا ہے۔ اسلامی نفاذ کے لیے ان کی سب سے بڑی کامیابی 1949 میں قرارداد مقاصد کے ذریعے ریاست کے نظریاتی تشخص کا تعین تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان جماعتوں نے اس بات کو بھی تسلیم کر دیا کہ خدائی قوانین پارلیمنٹ کے بنائے گئے قوانین سے فوقیت رکھتے ہیں۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے جنرل ضیاالحق کے دور میں انہوں نے اسلامی قوانین کے نفاذ کو یقینی بنالیا۔

ان تمام اہم کامیابیوں کے باوجود مذہبی جماعتیں ریاست کو مزید مذہبی قوانین کا پابند بنانا چاہتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی سماجیت کی ایک اور بحث کو فروغ دے رہی ہیں۔ جو ان کے سیاسی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگی رکھتی ہے جس کے اثرات سے معاشرے میں واضح مذہبی و معاشرتی میلان دیکھنے میں آ رہا ہے۔ مذکورہ دونوں مذہبی مباحث کا بنیادی مقصد زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کو نافذ کرنا ہے، جو درج ذیل چھ متغیر رجحانات اور تحریکوں کے امتزاج سے منشرح ہوتا ہے:

1- سیاسی طور پر اسلام کا نفاذ، 2- جدت پسند تحریکیں، 3- صوفی ازم، 4- تبلیغ اور دعوت، 5- فرقہ واریت، 6- عسکریت پسندی

یہ تمام تغیراتی پہلو ملک کی اہم بڑی مذہبی تنظیموں یا تحریکوں میں دیکھے جا سکتے ہیں اور اکثر اوقات ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے کے ساتھ مرتب ہوتے ہیں۔ نظریات اور مذہبی مباحث کی پیچیدگی متعدد اندرونی اختلافات کو جنم دیتی ہے۔ اور یہ معلوم کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے کہ یہ تنظیمیں اپنے کردار کا تعین کیسے کرتی ہے، جو ان کے عہدیداروں کے درمیون تقسیم در تقسیم پیدا کرتی ہے۔ اس وقت پاکستان میں تقریباً 247 مذہبی تنظیمیں جو بظاہر ایک ہی مقصد رکھتی ہیں پہ کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر فرقہ ورانہ بنیادوں پر منقسم ہیں لیکن جب ان کے مفادات آپس میں ملتے ہیں تو اکٹھے کام کرنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ تقریباً آخری دو دہائیوں سے پاکستان میں ایک اور طرز کی مذہبی تنظیمیں معرض وجود میں آئی ہیں۔ یہ قسم بھی ملک کے اندر اسلامی نظام اور مذہبی معاشرتی ملاپ چاہتی ہیں۔ گروہ اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ ملک کے موجودہ سیاسی نظام کے تحت کام کرنے سے کسی قسم کی بھی تبدیلی لانا ناممکن ہے۔ اس قسم کی تنظیمیں جمہوریت اور جمہوری طریقہ کار کو متبادل نظام لانے کے لیے رکاوٹ سمجھتی ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی ہیں جو جمہوریت کو ہی خلاف اسلام گردانتی ہیں اور اس کی جگہ اپنے مکتبہ فکر کے مطابق شریعتی نظام لانا چاہتی ہیں۔ ان جماعتوں میں جماعت الدعوۃ تحریک خلاف، حزب التحریر اور المہاجرون شامل ہیں۔

بہت ساری تنظیمیں جن میں تنظیم الاخوان اور تنظیم اسلامی بھی شامل ہیں، یہ یقین رکھتی ہیں کہ ملک میں انتخابی عمل کے ذریعے شریعت کا نظام متعارف نہیں کروایا جا سکتا اور وہ حکومت گرانے کے لیے متبادل کے طور پر طاقت کے استعمال کو بہترین طریقہ تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ تنظیمیں فرقہ واریت اور عسکریت کی طرف جھکاؤ رکھتی ہیں مگر حقیقت میں وہ اپنے طریقہ کار میں جدیدیت کی حامل ہیں۔ وہ نظام میں مکمل تبدیلی چاہتی ہیں۔ ان کا طریقہ کار مذہبی سیاسی جماعتوں سے متضاد نظر آتا ہے۔ جنہوں نے موجودہ نظام کے ساتھ کام کرتے ہوئے بہ تدریج تبدیلی پر اپنی توجہ مرکوز کر دی ہے۔

مذہبی جماعتوں کے منشور کے مطالع سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حاکمیت اعلیٰ ان کے متفقہ بنیادی مقاصد میں شامل ہیں۔ ان کے بنیادی مقاصد میں معاشی، سیاسی، آئینی اور خارجہ پالیسی میں اصلاحات کے منصوبے بھی شامل ہیں، لیکن ان کا مقصود ریاست اور معاشرے میں مکمل اسلام کا نفاذ ہے۔ ان میں سے بہت ساری جماعتیں اصلاحات تجویز تو کرتی ہیں، لیکن یہ واضح نہیں کر پائی ہیں کہ ان کو پالیسی میں کس طرح تبدیل کیا جائے۔ ان جماعتوں کی بہت ساری تجاویز میں حیران کن طور پر مماثلت پائی جاتی ہے اور اگر ان تنظیموں کے نام ان کی بنائی گئی دستاویزات پر نہ ظاہر ہوں تو ان کے منشورات کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو جائے۔

مذہبی جماعتیں مختلف نوعیت کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ جن میں مذہبی سماجیت کا فروغ بھی شامل ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ دیگر سیاسی جماعتیں کسی بھی قسم کی تبدیلی کی صلاحیت نہیں رکھتیں جبکہ وہ صرف سیاسی اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں اور رتئے عالمی، سیاسی اور معاشی رجحانات سے بھی مطابقت اختیار کر لیتے ہیں جبکہ دوسری جانب مذاہبی جماعتیں اپنے آپ کو مذہب کی بنیاد پر ممتاز کرتی ہیں اور اپنے آپ کو پاکستان کے اسلامی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظریے کی محافظ گردانتی ہیں۔ وہ ملک کی سیاسی قیادت کو شکوک وشبہات سے دیکھتی ہیں اور یہ گمان کرتی ہیں کہ سیاسی قیادت ملک کو سیکولر ریاست بنانا چاہتی ہے۔

مذہبی جماعتیں بلا تخصیص مکتبۂ فکر کئی مرتبہ ایک متفقہ ایجنڈے پر متحد ہوئیں ہیں۔ عموماً یہ اعتماد ملک میں مکمل مذہبی قوانین کی عملداری کی بنیاد پر ہوئے ہیں۔ 1952 میں تمام مکاتب فکر پر مشتمل مذہبی سکالرز کے بورڈ نے متفقہ طور پر 22 نکات پر مشتمل اسلامی آئین کا ڈھانچہ مرتب کیا تھا۔ یہی ڈھانچہ پاکستان میں قائم تمام مذہبی جماعتوں کو بنیادی اصول فراہم کرتا ہے اور ان کے منشورات انہی 22 نکات پر مشتمل ہیں۔ یہ جماعتیں خدائی قوانین کی حاکمیت پر زور دیتی ہیں اور یہ کہتی ہیں کہ ریاست کو شریعہ کے متضاد کسی بھی قسم کی قانون سازی کا اختیار نہیں۔ بالآخر انہی 22 نکات میں سے چند نکات باقاعدہ طور پر 1973 کے قوانین کے آئین میں شامل کر دیے گئے۔

ان مذہبی سیاسی جماعتوں کے درمیان دوسرا بڑا اتفاق 1976 میں دیکھنے میں آیا، جب سب نے متحد ہو کر ملک میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ اور بھٹو حکومت کو ہٹانے کے لیے اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک اتحاد کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کے نتیجے میں مارشل لاء لگا اور جنرل ضیاالحق کے اسلامی نظام کے لیے راستہ ہموار ہوگیا۔ تیسرا بڑا اتفاق 2000 میں ہوا جب مذہبی سیاسی جماعتوں نے ایک انتخابی اتحاد مجلس عمل (ایم ایم اے) تشکیل دیا۔ 2002 میں اس اتحاد نے قومی اسمبلی میں 65 نشستیں حاصل کیں جبکہ صوبہ خیبر پختونخوا اور صوبہ بلوچستان میں اتحادیوں کے ساتھ مل کر حکومتیں بنائیں۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کے نظریات کے درمیان اختلافات کبھی بھی ان کے مفادات کے لیے رکاوٹ نہیں بنا جس کے نتیجے میں وہ ملک میں مذہبی سیاسی دائرہ کار کو بنانے اور اسے فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ تمام مذہبی جماعتیں صرف ایک مشترکہ مذہبی رجحان کا حصہ ہیں اور سیاسی سطح پر بھی مشترکہ مقاصد کی حامل ہیں۔ ان سب کا موقف معاشرے میں مکمل طور پر اسلامی نظام کا قیام اور مذہب کو فروغ دینا ہے۔

تاہم اس مسئلہ کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے ابھی ہمیں مزید تحقیقات کی ضرورت ہے، خاص طور پر مختلف سیاسی، عسکری، فرقہ وارانہ اصلاحی اور تبلیغی، مذہبی جماعتوں کے اندرونی حرکیات کو جانچنے کی اشد ضرورت ہے۔ پھر ان کے مذہبی دائرہ کار اور نظریات کا ریاست اور معاشرے کے درمیان تعلق پر کتنا اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک علیحدہ سے ایک بحث ہے جسے واضح کرنا ضروری ہے اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ان کے بنیادی مقاصد کیسے ریاست کے اپنے مقاصد کے ساتھ متصادم ہیں اور ان جماعتوں کے نظریات کی عوام میں سرائیت سے پاکستان میں ریاست اور معاشرے کے درمیان تعلق پر کیسے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدامت پرستی انتہا پسندانہ سوچ کی محرک

(پرویز ہود بھائی)

مسلمانوں میں سائنسی ترقی کی موجود صورتحال کے حوالے سے بات کی جائے تو اس سلسلے میں مادی وسائل کی فراہمی بھی بے معنی ثابت ہوگی۔ سائنس کے شعبے میں کچھ کام کرنے کے لیے سب سے پہلے سائنسی منہاج کے کلیدی اصولوں یعنی علت اور معلول کے تعلق، طبعی عمل میں کسی الوہی مداخلت کی عدم موجودگی نیز طبعی قوانین کی کار فرمائی کو تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہمیں سائنسی منطق اختیار کیے بغیر سائنس میں کچھ کام کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ سائنس بجائے خود معروضی اور عقلیت پر مبنی سوچ سے عبارت ہے۔ سائنس کسی قسم کے وہبی علم پر انحصار کرنے کی بجائے ایسی ذہنی افتاد کا تقاضا کرتی ہے جو مفروضات پر بلانہایت سوال اٹھاتی اور انہیں تسلسل کے ساتھ چیلنج کرتی چلی جاتی ہے۔ اگر اس بنیادی شرط کو پورا نہ کیا جائے تو دنیا بھر کا تمام سرمایہ اور مشینی آسائشیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔

کیا مذہب سائنس کے بنیادی مقدمات کو تسلیم کر سکتا ہے؟ مذہب کی چند تعبیرات کے مطابق ایسا ہو سکتا ہے جبکہ بعض میں اس کے لیے کوئی گنجائش موجود نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے اس قدیم سائنس اور جدید سائنس میں فرق واضح کر لینے دیجیے۔ یہ دونوں اپنی منہاج میں یکساں نہیں ہیں لیکن دونوں کو اکثر یوں خلط ملط کیا جاتا ہے کہ دونوں میں امتیاز کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یونانیوں، چینیوں، مسلمانوں اور ہندوؤں کی قدیم سائنس ایک محدود سا معاملہ تھا جو کسی بھی الہیاتی یا مذہبی نظام کو خطرات سے دوچار نہیں کرتی تھی۔ قدیم عالم مشاہدہ کیا کرتے تھے اور چند نتائج اخذ کر کے اسے ایک مخطوطے کی شکل دے دیتے جنہیں گنے چنے افراد ہی پڑھ سکتے تھے۔ اس وقت اس بات کا تصور کرنا بھی محال تھا کہ تمام طبعی دنیا کی حرکیات کو چند بنیادی اصولوں کی روشنی میں سمجھا جا سکے گا۔ ان تحقیقات کا ٹیکنالوجی کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے یہ لوگوں کی روزمرہ زندگی پر بھی قابل ذکر انداز میں اثر انداز نہیں ہوا کرتی تھیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدید سائنس کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ یورپی روشن خیالی کی تحریک کا یہ نتیجہ اب ایک آفاقی انسانی تہذیب کی روح کے طور پر کارفرما ہے۔ اگرچہ اس عمل کو مہمیز کرنے میں مسلم سائنس سمیت قدیم سائنس کی دریافتوں نے اہم کردار ادا کیا تھا اس کے باوجود روشن خیالی کی تحریک جن اثرات کی حامل ثابت ہوئی وہ ازمنہ قدیم کے سائنس دانوں اور عالموں کے کام سے بالکل مختلف تھے۔

جدید سائنس ہماری دنیا کی تعبیر تو تسلسل کے ساتھ نئی ٹیکنالوجی تخلیق کرنے کی صورت میں کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ ایٹم سے لے کر کائنات کی جسامت نیز موجودہ عہد سے لے کر کائنات کی تخلیق کے وقت تک، ہر شے کی وضاحت کر لینے کا دعویٰ بھی رکھتی ہے۔ پھر اسے روایت پرستوں کی جانب سے بھی مزاحمت کا سامنا ہے کیونکہ یہ اس بات کی وضاحت بھی پیش کرتی ہے کہ انسان حیاتیاتی ارتقاء کے طویل مراحل سے گزر کر اپنی موجودہ شکل تک کیسے پہنچا۔ یہ تمام عوامل اسے اس قدیم سائنس سے مختلف بناتے ہیں جس میں یونانیوں، مسلمانوں، چینیوں اور ہندوؤں نے اپنے اپنے وقت میں قابل قدر حصہ ڈالا تھا۔ چنانچہ اگر کوئی تہذیب قدیم سائنس کے معاملے میں کارہائے نمایاں انجام دیتی رہی ہے تو اس سے خود بخود یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ وہ جدید سائنس میں بھی جھنڈے گاڑنے کی اہلیت کی حامل ہو جاتی ہے۔

اب ہم اسلام کی سائنس کے ساتھ موافقت کے موضوع کی طرف پلٹتے ہیں: اس کے حق اور مخالفت میں پیش کیے جانے والے دلائل ایک سطح پر مسیحیت کے معاملے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے ہندوستان سے تعلق رکھنے والے سرسید احمد خاں یا ایران کے جمال الدین افغانی کی طرح مسلمانوں میں بھی سائنس کے حامی ایسے مصلحین قابل ذکر تعداد میں موجود رہے ہیں جو یہ دلائل پیش کرتے رہے ہیں کہ قرآن حکیم میں بیان کردہ معجزات کو ظاہری اور لفظی مفہوم میں لینے کی بجائے انہیں وسیع تر اور تمثیلی معنوں میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نویں صدی کی عقلیت پسند (معتزلہ) روایت کی پیروی کرتے ہوئے ان خرد پسند مسلمانوں نے ایسی تعبیرات اختیار کرنے پر زور دیا جو سائنس کے مشاہدہ کردہ حقائق سے میل کھاتے ہوں۔ اس سے مراد یہ تھی کہ طوفان نوح یا آدم علیہ اسلام کے جنت سے اترنے جیسے ان طے شدہ عقائد پر بھی سوال اٹھایا جائے جن پر مسیحی بھی یقین رکھتے ہیں۔ اس وقت ایسی تجاویز سامنے لانا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن پھر بھی یہ آج کے زمانے کے مقابلے پر محفوظ تر تھا جبکہ لوگوں کے مزاج عملی تشکیک سے دور جا چکے ہیں۔

دوسری طرف اسلام سمیت ہر ایک مذہب کی بنیاد پرست تعبیرات فلسفیانہ سطح پر اس نقطہ نظر کی مخالفت کرتی ہیں کہ دنیا کا نظام مادی قوتوں اور قوانین کے تابع ہے۔ ان کے ہاں اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ تکوینی ہاتھ مسلسل مداخلت کر رہا ہے چنانچہ انفرادی فلاح اور بہتری ''اوپر بیٹھی'' قوت یا قوتوں کے سامنے دعا اور التجا کی مرہون منت ہوتی ہے۔ عقائد کا یہ نظام زلزلوں نیز خشک سالی اور طوفان وسیلاب کو الوہی ناراضگی اور غیظ وغضب کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس بنیاد پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ سعودی اسلام یا مختلف وہابی، سلفی، دیوبندی تعبیرات مادی علت اور معلول تعلق کو یعنی دوسرے لفظوں میں جدید سائنس کی بنیاد کو مسترد کرتی ہیں۔

دوسری طرف اہل تشیع کا اسلام سیاسی طور پر متحرک ہونے کے باوجود اس کا جھکاؤ قبل از جدیدیت اعتقادات کی طرف بہت کم ہے۔ آیت اللہ خمینی کو سائنس اور اسلام کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھنے میں کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا کہ 'اسلامی ریاضی' نام کی کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی، اسی طرح سے انہوں نے ڈارون کے نظریات کے خلاف کوئی موقف اختیار نہیں کیا تھا۔ فی الحقیقت ایران ان چند مسلم ممالک میں سے ایک ہے جہاں پر ارتقا کی تھیوری پڑھائی جاتی ہے اور آج وہ 'سسٹم سیل' پر تحقیق میں پیش پیش ممالک میں شامل ہے حالانکہ سابق صدر بش اور ان کی نو قدامت پسند انتظامیہ نے امریکہ میں اسی قسم کی تحقیق پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اسی تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی پایا جاتا ہے: آیت اللہ خمینی نے 'ولایت فقیہہ' کا تصور بھی متعارف کروایا تھا جو ملاؤں کو ماضی سے کہیں زیادہ قوت اور اختیارات عطا کرتا ہے۔ چنانچہ مابعد انقلاب کے ایران میں یہ لوگ محض مذہبی رہنما ہونے کے بجائے سیاسی قیادت کا منصب بھی سنبھال چکے ہیں۔ اس میں اسلام میں روحانی اور دنیاوی پہلوؤں کے ایسے آمیزے کی بازگشت سنائی دیتی ہے جس سے درحقیقت سائنس مل کر نہیں چل سکتی۔

چنانچہ مسلم دنیا اگر سائنسی شعبے میں ترقی کی خواہاں ہے تو اُسے وسیع تر انفرادی اور دانش وارانہ آزادیوں کو فروغ دینا ہوگا۔ اس کے بغیر یہاں پر کوئی سوچیں اور تصورات پنپ سکتے ہیں اور نہ ہی اختراعات، دریافتوں یا ترقی کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ اصل مسئلہ بہتر آلات یا برقی مواصلات اور تیز رفتار انٹرنیٹ کی دستیابی کا نہیں۔ اس کے برعکس آج کی مسلم دنیا کو سائنس کے شعبے میں کسی ترقی کی خواہش رکھنے سے پہلے اپنے جامد اعتقادات اور ایسی ثقافت سے نجات حاصل کرنا ہوگی جو سوال اٹھانے کی بجائے اندھی تقلید کے چلن پر کاربند رہتی ہے:

اب صدیوں کے اقرار اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

(بشکریہ 'نوائے انسان' دسمبر 2009)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریاست کا معذرت خواہانہ رویہ انتہا پسندوں کی قوت کا موجب

(آئی۔اے۔رحمٰن)

عدم رواداری کے واقعات میں نمایاں اضافہ اور قدامت پسند عناصر کی طرف سے طاقت اور تکبر کا مظاہرہ واضح طور پر حکومت کی اس پالیسی اور ردعمل کا نتیجہ ہے جس کے تحت وہ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی مذہبی جماعتوں کے چیلنجوں کا مربوط اور ٹھوس جواب دینے میں ناکام رہی۔ اس سے بھی خراب اور بدتر بات یہ ہے کہ اسلام آباد، ریاست کی اتھارٹی کو درپیش ان خطرات سے آگاہ دکھائی نہیں دیتا۔ جو اس کی اپنی کمزوری اور بزدلی کی تخلیق ہیں۔

تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295-C کے مسئلہ پر قدامت پسند مذہبی لابی سے تصادم مول نہ لینے کے حکومتی فیصلے کا صرف یہ جواز پیش کیا جا سکتا ہے کہ یہ حکمت عملی کے تحت پسپائی تھی۔ لیکن عدم رواداری کی قوتوں کے خوف کی وجہ سے قانون نافذ کرنے کی ذمہ داری سے دستبرداری کے لئے کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس تاثر نے کہ حکومت مذہب کی آڑ میں کی جانے والی قانون کی کسی بھی خلاف ورزی کا تدارک کرنے سے ڈرتی ہے۔ چاروں اطراف انتہائی مہلک اور مضر اثرات پیدا کر دیئے ہیں۔ ریاستی اہلکار قانون نافذ کرنے یا قانون کا پرچم سربلند رکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور عوام عدم تحفظ کے شکار طبقات ...... مثال کے طور پر اقلیتوں اور خواتین ...... کے حقوق کی خلاف ورزیوں سے لاتعلقی میں ہی خود کو محفوظ تصور کرتے ہیں۔

حکومت نے سلمان تاثیر کے انتہائی ہولناک قتل کی اہمیت کم کرنے کو ترجیح دے کر اور کلیدی آئینی عہدوں میں سے ایک پر فائز عہدے دار کو بعد از مرگ اعزازات سے محروم کر کے محض اپنی مشکلات میں اضافہ کیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مرحوم گورنر سے جان بوجھ کر اور قصداً کنارہ کشی کی جا رہی تھی۔ عوام کو پہنچنے والا پیغام یہ تھا کہ اسٹیبلشمنٹ بذات خود حالات کے تقاضوں کے مطابق قتل کے واقعہ کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی تھی ...... لہٰذا اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ ایک قاتل کو ہیرو بنا کر پیش کیا جا رہا تھا۔ اس فحش غلطی اور لغزش کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ حکومت کو کافی عرصہ تک گورنر کے قتل کے مقدمے کی سماعت کے موقع پر ریاست کی نمائندگی کرنے کے لیے کوئی وکیل (پراسیکیوٹر) دستیاب نہ ہو سکا۔ کوئی ذمہ دار اتھارٹی اس حد تک تذلیل پر آسودہ خاطری یا اطمینان کا اظہار نہیں کر سکتی۔ خاص طور پر ان حالات میں جب اس نے وکیلوں کی ایک فوج بھرتی کر رکھی ہو اور ہر ماہ انہیں معاوضے کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طور پر بھاری رقوم ادا کی جا رہی ہوں۔ درحقیقت جس انداز میں ریاست کے لاء آفیسرز کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے منظور نظروں کے لئے کام کے بغیر جتنی تعداد میں ملازمتیں تخلیق کی گئی ہیں یہ سب ایک سکینڈل کی حیثیت رکھتا ہے...... اور اسٹیبلشمنٹ ہر ماہ جتنے وکلاء کو تنخواہیں دے رہی ہے۔ شائد اتنے وکیلوں کی اسے ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود حکومت کو اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے ایک وکیل تلاش کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ریاست کو حتیٰ کہ انتظامیہ پر بھی کوئی کنٹرول حاصل نہیں ہے...... اور یہ کہ یہ اپنے ملازمین کو بھی کسی نظم و اطاعت میں لانے سے قاصر ہے۔

قدرتی طور پر تمام وہ افراد جنہیں نجی طور پر قاتل کے ساتھ ہمدردی ہے۔ انہیں یہ جرات بخشی گئی ہے کہ وہ علی اعلان بھی اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کریں۔ عین اسی وقت بھی وہ لوگ جن کی کل ذہنی بساط سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے عوام کے عقائد کو بھڑکانہ اور مشتعل کرنا ہے۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ حکومت گھٹنے ٹیکنے والی ہے یا وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے والی ہے۔ لہذا اس کے گرد محاصرے کو مزید سخت کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کا اولین انتخاب اپنی پروپیگنڈہ مہم میں تیزی لاکر پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ اقلیتی برادریوں کے ارکان کو نشانہ بناتے ہیں۔

اس حوالے سے تازہ ترین مثال جنوبی پنجاب کے لودھراں ڈسٹرکٹ میں واقع ایک قصبے دنیا پور کی ہے جہاں ایک نوجوان جوڑے نے اپنی تمام تر پونجی کو جوانہوں نے بیرون ملک کمائی تھی تعلیم کے شعبہ میں صرف کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اس کا آغاز ایک چھوٹا سا کالج کھولنے سے کیا جس نے اپنے قیام کے پہلے ہی سال بہت اچھے نتائج ظاہر کئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک سکول تعمیر کیا جس نے یکم فروری 2011 سے کام شروع کرنا تھا۔ مقامی مولویوں اور ان کے حمائتیوں نے۔ جن میں زیادہ تر دکاندار شامل تھے۔ اس بنیاد پر ان اداروں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ احمدیوں کی ملکیت تھے۔ جب تعلیم کے کاز کو فروغ دینے والے میاں بیوی نے تحفظ کی خاطر پولیس سے رابطہ قائم کیا تو انہیں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر وہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا گیا کیونکہ ان کے تحفظ کی کوئی ضمانت فراہم نہیں کی جاسکتی تھی۔ اطلاعات کے مطابق پولیس نے انہیں بتایا کہ وہ کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں شدید ردعمل کا خطرہ تھا۔

عین اسی وقت حکومت کی کم ہمتی اور بزدلی نے انتہا پسندوں کو یہ جرات دی ہے کہ وہ کسی بھی مسئلے سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ ریمنڈ ڈیوس کے خلاف منعقد کی جانے والی ریلی کے موقع پر ایک سیاسی جماعت کے طلباء ونگ کے سربراہ نے کہا کہ اگر حکومت نے ریمنڈ کو پاکستان سے فرار ہونے کے لئے محفوظ راستہ فراہم کیا تو وہ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے اور امریکن قونصلیٹ میں موجود ہر امریکی کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ یہ تنظیم اس نیوز رپورٹ کو اپنی ویب سائٹ پر ڈالنے سے بھی نہیں ہچکچائی۔ جو دہشت گردی سے اس کی والہانہ وابستگی کا ایک واضح ثبوت ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بدقسمتی سے حکومت میں عام اتفاق رائے اور ہتھیار ڈالنے کی حکمت عملی میں تمیز کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے اور وہ اس ناانصافی اور بربریت کو دیکھنے سے قاصر ہے۔ جو بنیاد پرست اور غیر لچکدار ظلمت پسندوں اور عوام دشمنوں کے ہر قیمت پر تمام مطالبات تسلیم کرنے کی صورت میں وہ عوام اور آنے والی نسلوں کے ساتھ کر رہی ہے۔ یہ کارروائی ایک ایسے سازشی ٹولے کو...... جسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے اور جس نے عام شہریوں کی وفاداری اور ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا...... نہ صرف یہ کہ سیاسی وسعت اور شناخت دینے کے مترادف ہے بلکہ حکومت کی طرف سے انتہا پسندوں کے اسلام کے بارے میں اختیار کردہ موقف کو قانونی جواز بخشنے کی ایک مجرمانہ کوشش بھی ہے۔ اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ انتہا پسندوں کے سامنے رسوا کن انداز میں ہتھیار ڈالنے یا ان کے خلاف طاقت کا استعمال۔ صرف وہی دو راستے نہیں ہیں جو حکومت کو دستیاب ہیں۔ درحقیقت، ان میں سے اختیار کیا جانے والا کوئی بھی راستہ محفوظ نہیں ہے۔ جبکہ تشدد اور تشدد کی ترغیب، دونوں کا اتنی ہی طاقت کے ساتھ خاتمہ کرنے کی ضرورت ہے، جتنی طاقت ہماری خستہ حال ریاست یکجا کر سکتی ہے۔ تعصب اور عدم رواداری کے جڑواں بھوت کو شکست دینے کے لیے عوام کے ذہنی اور اخلاقی وسائل کو متحرک کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

پاکستان میں آج کل جو کچھ بھی رونما ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ عوام کو اس بات کی ترغیب دینے کے لیے کہ ریاست کو عسکریت پسندوں اور ان کے حامیوں کے حوالے کر دیا جائے جنہوں نے مختلف لیبل لگا رکھے ہیں۔ مذہب کا بے دریغ استحصال کیا جا رہا ہے۔

عوام کو اسلام اور کفر کے درمیان انتخاب کی پیش کش نہیں کی جا رہی کیونکہ بعض عسکریت پسند عوام کو یہ بات ذہن نشین کرانے میں مصروف ہیں کہ اصل مسئلہ جمہوریت اور دینی حکومت (یا طوائف الملوکی) کے درمیان انتخاب کا ہے۔ جبکہ موخر الذکر قوتیں ملک کے مختلف حصوں میں متحرک نظر آتی ہیں۔ جمہوری قوتوں نے ابھی جدوجہد میں شامل ہونا ہے۔ ان کی سستی کا ایک سبب ان کا یہ خوف ہو سکتا ہے کہ ان کے نصب العین کو غلط نہ سمجھ لیا جائے...... جو کہ نامکمل جمہوریت کی موجودہ شکل کے دفاع سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے......

لیکن اگر وہ اپنے بچوں کے لئے حقیقی معنوں میں جمہوری نظام کے خواہاں ہیں تو انہیں خوف اور اندیشوں کی ان بھول بھلیوں میں اپنا راستہ تلاش کرنا ہوگا اور اس جنگ میں شامل ہونا ہوگا جو پاکستان کے پہاڑوں اور میدانوں میں نہیں بلکہ عوام کے ذہنوں اور دماغوں میں لڑی جائے گی۔ البتہ، اس جدوجہد کا دورانیہ اس صورت میں کم کیا جا سکتا ہے اگر ریاستی وسائل کے محافظین اور نگہبان اپنا جائز کردار ادا کرنے کی زحمت گوارہ کریں۔ لیکن سیاسی جماعتیں اور سول سوسائٹی کی دیگر تنظیمیں حکمران طبقات کے بیدار ہونے کا انتظار نہیں کر سکتیں۔ ان کے لئے عمل کرنے کا یہی وقت ہے۔

(بشکریہ 'جہد حق' مارچ 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندوں کے مشترکہ مقاصد

(عامر راز)

گزشتہ چند برسوں کے دوران جنوبی ایشیا میں ہونے والے دہشت گردی کے بڑے حملے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دہشت گرد ایک دوسرے سے بہت جلد سیکھ جاتے ہیں یا پھر وہ ایک ہی گروہ کا حصہ ہیں۔ مختلف ممالک اور خطوں میں ہونے والے دہشت گرد حملوں میں مماثلت کو ایک دوسرے کی نقل، کہا جاسکتا ہے لیکن جب یہ مماثلت ٹریڈ مارک بن جائے تو اس کا بغور جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران دہشت گرد نئے اہداف اور نئی تیار کی گئی حکمت عملی کی جانب متوجہ ہوئے ہیں، جس سے رجحانات کے بڑھتے ہوئے تبادلے پر روشنی پڑتی ہے۔ مشترکہ نظریاتی، سیاسی اور بعض اوقات آپریشنل مقاصد دہشت گردوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتے ہیں۔ اس تناظر میں 13 ستمبر کو افغانستان میں امریکی اور نیٹو فورسز پر حملے، پاکستان کی مہران نیول ایئر فورس بیس پر رواں سال مئی میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائی اور نومبر 2008 میں ہونے والے ممبئی حملوں میں مماثلت شاید حیران کن نہیں ہے۔

ان حملوں کی حکمت عملی میں مشابہت اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ دہشت گردوں نے اپنی آپریشنل صلاحیتوں میں اضافہ کیا ہے جس کے باعث روشورش کو درپیش نئے چیلنجوں کے تدارک کے لیے حکمت عملی کی تشکیل کی ضرورت مزید بڑھ گئی ہے۔

دہشت گردی کے خطرات کا شکار ریاستوں کے درمیان ایک وسیع تر اور حقیقی حکمت عملی پر اتفاق اور تعاون دہشت گردی کے حملوں کے تدارک کے لیے موثر حفاظتی میکانزم کی تشکیل میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ لیکن 9/11 کے ایک دہائی گزرنے کے بعد بھی دہشت گردی کے تدارک کے لیے ایسی کوئی مشترکہ کوشش نہیں کی جاسکی۔ دہشت گردی کے خلاف ریاستوں کے درمیان اور خاص طور پر جنوبی ایشیاء میں تعاون ایک خواب ہی رہا ہے۔ دوسری جانب دہشت گرد طاقت ور ہوگئے ہیں اور اپنے اہداف کو نشانہ بنانے کے لیے جدید ترین تکنیک کے حصول کے لیے سرگرم ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

2003ء میں امریکی حملے کے بعد عراق میں پیدا ہونے والا سکیورٹی بحران اور شورش دشت گردوں کے لیے، ایک عملی تجربہ گاہ ثابت ہوا جہاں القاعدہ نے تباہی و بربادی کی نئی اور جدید تکنیکوں کا استعمال کیا جنھیں بعد ازاں دوسرے خطوں بشمول افغانستان اور پاکستان میں برآمد کیا گیا۔

دہشت گردی میں القاعدہ کی غیر معمولی مہارت نے طالبان اور خطے کی دوسری تحریکوں کو متاثر کیا جو 9/11 کے بعد ریاست کی جانب سے سخت دباؤ میں تھیں۔ القاعدہ کی جانب سے اہداف کو نشانہ بنانے کے لیے بہتر صلاحیتوں اور تکنیکوں کی صورت میں فراہم کیا جانے والا تعاون ان کے لیے انتہائی معاون ثابت ہوا۔

فروری 200 میں قندھار میں ہونے والا خودکش حملہ جس میں کتوں کی لڑائی کے فیسٹیول کو نشانہ بنایا گیا تھا، افغانستان میں اپنی نوعیت کا پہلا حملہ تھا جس کا موازنہ 200 میں عراق میں زائرین پر ہونے والے حملوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں بم دھماکوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ مخالفت مذہبی، سیاسی یا قبائلی گروہ کے زیادہ سے زیادہ ارکان کو قتل کرنا، خواہ وہ عام شہری ہی کیوں نہ ہوں اور اس مقصد کے لیے زیادہ تباہی پھیلانے والی خودکش جیکٹیں تیار کی گئیں۔

2008ء کے دوران پاکستان میں ہونے والے تین بڑے دہشت گرد حملوں میں بھی جدید مہارتیں استعمال کی گئیں جن میں لاہور کی فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی (ایف آئی اے) کے ہیڈکوارٹر، اسلام آباد میں ڈنمارک کے سفارت خانے اور میریٹ ہوٹل کو نشانہ بنائے جانے کے واقعات شامل ہیں۔ ایف آئی اے کی عمارت پر حملے دہشت گردوں نے 50 کلوگرام C4 پلاسٹک دھماکہ خیز مواد سے لدے ہوئے ایک پک اپ ٹرک کا استعمال کیا تھا، یہ تکنیک اپریل 2005ء میں القاعدہ کی جانب سے عراق کی معروف ابوغریب جیل پر کئے جانے والے ناکام حملے سے بے حد مماثلت رکھتی ہے، جس کا مقصد زیرِ حراست افراد کو چھڑانا تھا۔ میریٹ ہوٹل پر ہونے والے تباہ کن خودکش حملے میں جو طریقہ استعمال کیا گیا وہ دہشت گردوں کی صلاحیت میں اضافے اور ملک کے سب سے زیادہ محفوظ حصوں میں حملہ کرنے کی صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ممبئی میں ہونیوالی دہشت گردی کی کارروائی فیصلہ کن ثابت ہوئی جس میں شہری گوریلا جنگ کی نئی تکنیک کو دہشت گردوں نے موثر طور پر استعمال کیا جس کے بعد انہوں نے اس طریقہ کار کو مزید وسعت دی اور ان میں خودکش بم دھماکوں کا عنصر شامل کرتے ہوئے پاکستان اور افغانستان کو ایک درجن سے زائد مرتبہ نشانہ بنایا۔ دہشت گردوں نے 2009 میں پاکستان میں ممبئی حملوں کی طرز پر چار حملے کیئے۔ ان میں جی ایچ کیو راولپنڈی، لاہور میں سری لنکن کرکٹ ٹیم اور اسی شہر میں پولیس ٹریننگ سکول پر دو حملے شامل ہیں۔ افغانستان نے فروری 2010 میں کابل میں ایسے ہی ایک حملے کا سامنا کیا جب دہشت گردوں نے ایک تجارتی مرکز، ایک گیسٹ ہاؤس اور ایک ہوٹل کو نشانہ بنایا۔ ایک مربوط حکمت عملی کے تحت آبادی میں خوف و ہراس پھیلانے اور حملوں کے مادی اثرات کے علاوہ انہیں شہریوں کے لیے نفسیاتی اعتبار سے مزید مہلک بنانے کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک خاص شہر کو بار بار حملوں کا نشان بنایا جاتا ہے۔ 2009 میں پشاور کو اس انداز میں تسلسل سے نشانہ بنایا گیا اور 2010 میں دہشت گردوں نے اپنی توجہ لاہور پر مرکوز رکھی۔ 2011 میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کراچی دہشت گردوں کے ہدف پر ہے۔ افغانستان میں ابتداء میں قندھار کو دہشت گردی کا بار ہا نشانہ بنایا گیا اور اب کابل ہدف پر ہے۔

تنظیمی سطح پر ان گروہوں کی حکمت عملی زیادہ واضح رہی ہے۔ وہ دہشت گرد گروہ جن کے نظریاتی اور سیاسی مقاصد مشترک ہوتے ہیں، وہ نہ صرف ایک دوسرے کی تکنیک کو استعمال کرتے ہیں بلکہ ان کا تنظیمی ڈھانچہ بھی ایک دوسرے سے مماثلت رکھتا ہے یا یہ گروہ ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ ایسا تحریک طالبان پاکستان، لشکر جھنگوی اور چند دیگر کشمیری عسکریت پسند گروہوں، خاص طور پر بریگیڈ 313 کے معاملے میں ہوا، جس کا سربراہ الیاس کشمیری تھا۔ القاعدہ کے زیر اثر یہ گروہ تبدیل ہو چکے ہیں اور آپریشنل اور تنظیمی سطح پر حکمت عملی میں ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں۔ اس اثر ورسوخ نے ان چھوٹے گروہوں کو متاثر کیا جو اپنی بقا کے لیے کوشش کرتے رہے تھے یا جنہیں مادی وسائل کی کمی کا سامنا تھا اور انہیں بیرونی مدد کی ضرورت تھی۔ القاعدہ ان کی آپریشنل اور نظریاتی، دونوں حوالوں سے مدد کرنے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس میں بہت کم شک ہے کہ اس میں ادل بدل کا عنصر کارفرما رہا۔

یہ تجزیہ مقتول پاکستانی صحافی اور دہشت گردی کے موضوع پر رپورٹنگ کے ماہر سید سلیم شہزاد نے اپنی کتاب ''انسائڈ القاعدہ اینڈ دی طالبان'' میں کیا تھا انہوں نے واضح کیا تھا کہ القاعدہ ڈرائیونگ سیٹ پر ہے اور طالبان اور دیگر عسکریت پسند گروہ اس کے ہراول دستے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

سلیم شہزاد کا یہ موقف تھا کہ ممبئی حملوں کا منصوبہ القاعدہ نے تشکیل دیا تھا جس نے اس منصوبہ کو سرانجام دینے کے لیے لشکر طیبہ کو استعمال کیا۔ ان کو یقین تھا کہ القاعدہ اس خطے کو غیر مستحکم کرنا چاہتی ہے تاکہ مسلم ممالک کے حکمران مسلم طبقے اور عوام کا تعلق مغرب سے توڑا جائے اور خطے کو عالمی خلافت کا مرکز بنایا جائے۔

21 ویں صدی میں دہشت گردی کے درپیش چیلنجز خاصے پیچیدہ ہیں اور دہشت گردی کی اکثر کارروائیوں کو ریاستوں کے تعاون کے بغیر انجام دینا ممکن نہیں ہے۔ ایک دوسرے پر اعتماد کے بغیر موثر تعاون ناممکن ہے۔ اتحادی جب دہشت گردی کے خلاف جنگ میں میڈیا کے ذریعے ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہیں یا طاقت کے استعمال کی دھمکی کو ترجیحی طریقہ کار سمجھتے ہیں تو ٹیم ورک کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کا کردار ادا کرنے سے ریاستیں دہشت گردوں کے کھیل میں پھنس جاتی ہیں۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کھیل کے اختتام پر فاتح کون ہوگا اور کون اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مارے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندی کے عوامل اور اثرات

(آئی۔اے۔رحمٰن)

ویسے تو یہ ہم سب کی زندگی کا آج کا موضوع ہے کیونکہ ہمارا ملک اور ہم سب لوگ آج مختلف اقسام کی انتہا پسندی کا شکار ہیں۔ صرف ایک انتہا پسندی نہیں ہے۔ انتہا پسندی کی تعریف یہ ہے کہ آپ ہر معاملے میں ایک انتہائی سطح پر چلے جائیں اور پھر کسی درمیانی راستے یا مفاہمت کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ مثال کے طور پر اگر والدین اپنے بچوں کو کہیں کہ تمہیں ہماری مرضی کے بغیر مسکرانے کا اختیار نہیں ہے تو یہ ایک قسم کی انتہا پسندی ہے۔ یا والدین اپنی بچیوں سے کہیں کہ تمہیں ہماری مرضی کے بغیر درس گاہ میں مضامین اختیار کرنے کا حق نہیں ہے اور فلاں دوست سے ملنے کا حق نہیں ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی انتہا پسندی ہے۔ یا حکمران اگر لوگوں سے کہیں کہ جو حکم ہم نے جاری کر دیا ہے، جو کچھ ہم نے کہہ دیا ہے، وہ حتمی ہے اور آپ کے پاس اس کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

آمرانہ نظام حکومت بھی انتہا پسند ہوتا ہے کیونکہ یہ کسی گفتگو اور مفاہمت کی گنجائش فراہم نہیں کرتا۔ ہمارا ملک مسلم اکثریت کا ملک ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے ہمارا مذہب اسلام میانہ روی اور درمیانے راستے کا درس دیتا ہے۔ مگر بڑے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہم اب انتہا پسند ہو گئے ہیں۔ یہاں پر ایک مسلک سے تعلق رکھنے والے لوگ چار اماموں کو مانتے ہیں۔ وہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کہلاتے۔ ہیں دوسرے مسلک کے لوگ کئی اماموں کو مانتے ہیں مگر وہ ایک امام کو فقیہی کہتے ہیں۔ تو یہ پانچوں اماموں کو ماننے والے لوگ ایک دوسرے کو خارج الاسلام نہیں کہتے تھے۔ مگر اب ہم ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہیں اور جب پوچھا جاتا ہے کہ آپ نے فلاں شخص کا گلا کیوں کاٹا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ انہوں نے کسی مسلمان کا نہیں بلکہ ایک کافر کا گلا کاٹا ہے۔ وہ کافر صرف اس لیے تھا کیونکہ وہ ان کے فرقے سے اختلاف رکھتا تھا۔ یہ انتہا پسندی دنیا میں نئی نہیں ہے۔ جو کچھ ہمارے ملک میں اب ہو رہا ہے، یہ سو، ڈیڑھ سو برس قبل کسی اور ملک میں شروع ہوا تھا۔ جہاں عورتوں کے باہر نکلنے پر پابندی تھی، ان کے بال کاٹ دیئے جاتے تھے۔ جہاں لوگوں کو سنگسار کر دیا جاتا تھا۔ مگر ہمارے ملک میں ایسا نہیں تھا کیونکہ اس برصغیر کی تاریخ صلح اور مفاہمت کی تاریخ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندی کے انسانی حقوق پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اس سلسلے میں انتہا پسندی کے باعث سب سے پہلے زندگی کا حق خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہ جو اختلاف رائے کی بنیاد پر لوگ قتل کر دیئے جاتے ہیں یہ رسم ہم نے نئی نہیں قائم کی ہے۔ اس ضمن میں یہ ضرور عرض کر دوں کہ جب یورپ ابھی سوچ کی منزلیں طے نہیں کر چکا تھا تو وہاں اس وقت زیادہ انتہا پسندی تھی۔ دور وسطیٰ میں جب ہسپانیہ مقدس سلطنت کا محافظ تھا اور ہسپانیہ کے بادشاہ کو تمام مسیح علاقوں کا سلطان معظم کہا جاتا تھا تو ہسپانیہ نے روم پر حملہ کر دیا اور جہاں پوپ رہتا تھا، وہ جگہ مسمار کر دی تھی، اور شہر میں بہت زیادہ غارت گری کی۔ اور جب پروٹسٹنٹ آئے تو انہوں نے کیتھولک مسلک کے لوگوں کو چن چن کر قتل کیا اور کیتھولک والوں نے پروٹسٹنٹ والوں کو قتل کیا اور پھر یہ پروٹسٹنٹ آپس میں لڑ پڑے اور انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا۔ پھر ریاستوں کے مابین لڑائی ہوئی۔ یورپ کی سو برس کی لڑائی مشہور ہے۔ سو سال تک مذہب کی بنیاد پر وہ لڑتے رہے۔ وہ ختم ہوئی تو کچھ دنوں بعد تیس سال تک جاری رہنے والی جنگ چھڑ گئی۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور قتل کر دیتے تھے۔ پھر اس کے بعد یورپی اقوام نے سوچا کہ جنگ وجدال میں کوئی فائدہ نہیں اور وہ بقائے باہمی کے اصول پر متفق ہو گئے اور اسے اختیار کر لیا۔ دیکھیں زندہ رہنے کے حق کو تسلیم اور اس کا احترام کیے بغیر انسانی تہذیب کا ارتقاء ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے اسلام نے حکم دیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل نہ کرے اور کہا گیا کہ ایک مسلمان کے خون کا قطرہ کعبہ سے زیادہ مقدس ہے۔ لیکن جب ہم سیاسی تقسیم میں آتے ہیں تو اس کو بھول جاتے ہیں اور زندگی کا حق پامال کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انتہا پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص اکثریت کے مسلک سے تعلق نہیں رکھتا، وہ شہری نہیں ہے، وہ دوسرے درجے کا شہری ہے یا آپ اسے کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ مگر شہری کا نام نہیں دے سکتے۔ شہری کے بہت زیادہ حقوق ہوتے ہیں۔ ایک شہری کے پاس زندہ رہنے کا حق ہوتا ہے۔ اس کا حق ہوتا ہے کہ اس کی ذات کا احترام کیا جائے۔ اسے تعلیم حاصل کرنے، نقل وحرکت کرنے، اظہار خیال کرنے اور تجارت کرنے سمیت متعدد حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ جب آپ کسی شخص کو شہری تسلیم نہیں کرتے تو آپ اس کے مذکورہ بالا تمام حقوق پر خط تنسیخ کھینچ دیتے ہیں۔ آپ اسے اپنی محفل یا صحبت سے خارج کر دیتے ہیں اور وہ پرایا ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا لفظ ہے جو اردو اور انگریزی دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں بھی پرایا ہے اور انگریزی میں بھی پرایا ہے۔ اس سے متعلقہ کئی ایسی باتیں ہیں جو ذہن میں آ جاتی ہیں۔ مثلاً جب آپ شہری کی بات کرتے ہیں تو اس میں جنس کی تفریق نہیں ہے۔ مرد شہری ہے، عورت بھی شہری ہے، بچہ بھی شہری ہے۔ لیکن جب اس کی تقسیم ہوتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ جو ضعیف حصے ہیں وہ متاثر ہوتے ہیں۔ مرد شہری کے حقوق بھی متاثر ہوتے ہیں لیکن عورت چونکہ اس کے مقابلے میں کمزور ہے، زیادہ غیر محفوظ ہے، اس لیے اس کے حقوق زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ بچہ چونکہ زیادہ کمزور ہے اور اس کی آواز نہیں ہے تو وہ ان کے مقابلے میں زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ مثلاً جب اقلیتوں کے لیے ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ انہیں ملازمتیں دی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتی ہیں لیکن بہت کم اور نچلے درجے کی ملازمتیں دی جاتی ہیں۔ تعلیمی اداروں میں کوٹے مختص کر دیئے جاتے ہیں اور غیر طالب علموں کو داخلہ نہیں دیا جاتا۔ قائداعظم یونیورسٹی والوں نے کہا کہ اس ڈیپارٹمنٹ میں صرف دو غیر مسلموں کو داخلہ مل سکتا ہے لیکن ہم نے کہا کہ اگر تیسرا غیر مسلم لڑکا میرٹ پر آتا ہے اور وہ قابل ہے تو اسے کیوں داخلے سے محروم رکھا جاتا ہے۔ فیصل آباد کی ٹیکسٹائل انڈسٹری میں خواتین مردوں کی نسبت زیادہ تندہی اور مہارت سے کام کر سکتی تھیں مگر یہ شرط عائد کر دی گئی کہ لڑکوں کی نسبت لڑکیاں کم رکھی جائیں گی۔ میڈیکل کالج میں کوٹہ مختص کر دیا گیا۔ لڑکیوں نے اس فیصلے کے خلاف عدالت عظمیٰ میں مقدمہ دائر کیا جو لڑائی ابھی تک جاری ہے۔ پھر عقیدے کی تبلیغ کے حق کا مسئلہ آجاتا ہے۔ آپ لفظی طور پر کہتے ہیں کہ تمام ممالک کے افراد کو اپنے عقیدے کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہے مگر عملی لحاظ سے ایسا نہیں ہے۔ اقلیتوں کو عملی لحاظ سے اپنے عقیدے کی تبلیغ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ پھر قبائلی انتہا پسندی ہے۔ ایک قبیلے کی لڑکی کو دوسرے قبیلے کے لڑکے سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ سب سے زیادہ نقصان دہ ریاستی انتہا پسندی ہے۔ مثلاً جب آپ کہتے ہیں کہ فلاں عقیدے کے لوگ صدر اور وزیراعظم نہیں بن سکتے۔ یا اعلیٰ عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتے تو اس طرح آپ انتہا پسندی کو جائز قرار دے دیتے ہیں۔ قبائلی انتہا پسندی اور اسی طرح کی دیگر اشکال کو قانونی حمایت حاصل نہیں ہوتی اور انہیں ناجائز قرار دیا جاتا ہے مگر ریاستی انتہا پسندی کو جائز سمجھا جاتا ہے اور ریاستی مشینری اس کے نفاذ کے لیے استعمال کی جاتی ہے، اس لیے یہ سب سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ انتہا پسندی کے عوامل کیا ہیں اور یہ کیسے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر تبدیلی اور عمل کے کچھ عوامل ہوتے ہیں۔ انتہا پسندی کے داخلی اور خارجی عوامل ہیں۔ داخلی عوامل کی بنیاد فرد کو عدم تحفظ کا احساس ہے کیونکہ فرد اکیلا خود کو غیر محفوظ تصور کرتا ہے اور اس وجہ سے وہ خاندان کا سہارا لیتا ہے کیونکہ خاندان سے اسے طاقت ملتی ہے جس کے نتیجے میں وہ خود کو محفوظ تصور کرتا ہے۔ اس لیے ہم خاندان کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ پھر خاندان کا دائرہ کار قبیلے تک چلا جاتا ہے اور قبیلے سے آگے بڑھتا ہوا معاشرے اور ریاست تک چلا جاتا ہے۔ ریاست کی بنیاد بھی عدم تحفظ ہے اس لیے ریاست کا مقصد لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ لوگ جب طاقت کو اپنے لیے اہم سمجھتے ہیں تو پھر خاندان میں طاقت کے حصول کے لیے تگ و دو شروع ہو جاتی ہے اور کوئی زمین پر قابض ہو جاتا ہے اور کوئی پانی پر ملکیت رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے کیونکہ یہ وسائل انسان کو طاقت فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح گاؤں یا ایک علاقے میں جس فرد کے پاس وسائل زیادہ ہوتے ہیں اس کو زیادہ لوگوں پر اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور لوگ اس کے تابع ہوتے ہیں اور اسی طرح طاقت کے حصول کے لیے لوگوں کے مابین لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور ان میں انتہا پسندی کے عناصر جنم لیتے ہیں۔

اب خارجی عوامل کی طرف آتے ہیں بعض خارجی طاقتوں اور عوامل نے ہمارے خطے میں انتہا پسندی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس میں سیاسی و معاشی محرکات کارفرما ہوتے ہیں جن کو مذہبی رنگ دیا جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیکھیں جب برطانیہ نے ہمیں کالونی کا درجہ دیا تو تقریباً تمام اسلامی ممالک برطانوی سلطنت کے زیرِ ذیلیت آ گئے۔ اس ضمن میں یہ امر قابلِ غور ہے کہ برطانیہ نے صرف مسلم ممالک کو زیرِ قبضہ نہیں کیا بلکہ افریقہ اور لاطینی امریکہ میں بھی اپنی کالونیاں آباد کیں۔ ان کا مقصد دیگر ممالک اور لوگوں کے وسائل پر قبضہ کرنا تھا تاکہ وہ دوسروں کو دبا کر رکھ سکیں اور ان کا استحصال کر سکیں۔ مگر یہاں پر اسے مذہبی رنگ دیا گیا اور کہا گیا کہ غیر مسلموں نے مسلم ممالک کو اپنے زیرِ تسلط لانے کی کوشش کی ہے اور مسلمانوں کو اپنے ماتحت لانا چاہتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کیونکہ وہ مسلمان ہیں۔ ایسی بات نہیں۔ دیکھیں اٹھارویں صدی میں ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان سے بہت زیادہ دولت کمائی تھی۔ اس وقت ہندوستان دنیا کا سب سے مالدار ملک تھا اور اس کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے استعماری قوتوں نے ادھر کا رخ کیا تھا نہ کہ یہاں کے یا دیگر ممالک کے مسلمانوں پر ان کے مذہب کی بنیاد پر حملہ کیا گیا۔ ہم نے یہ غور نہ کیا کہ اس وقت برطانیہ کے پاس بحری بیڑا تھا جب کہ ہمارے پاس کشتی تک نہ تھی۔ ان کے پاس یونیورسٹیاں تھیں اور ہمارے پاس سکول تک نہ تھے۔ اور ان کے پاس چھاپہ خانہ تھے۔ ان کمزوریوں پر غور کرنے اور انہیں دور کرنے کی بجائے ہم نے اسے ایک مذہبی لڑائی قرار دینے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں استعماری قوتوں کا بھی ہاتھ ہے اور انہوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے اس خطے میں انتہا پسندی کو ہوا دی۔ میں بہت خوش ہوں کہ نقی صاحب نے انتہا پسندی کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسے مذہبی انتہا پسندی تک محدود نہیں کیا کیونکہ یہ ایک وسیع اصلاح ہے اور اس کی متعدد اشکال ہیں جن کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

میرے خیال میں انتہا پسندی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کے نتیجے میں سوچ پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ آدمی سوچنے سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کی عقل کام کرنا چھوڑ جاتی ہے۔ جب آدمی سوچنا چھوڑتا ہے تو وہ فیصلہ نہیں کر سکتا اور جب وہ فیصلہ نہیں کرتا تو اپنے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتا۔

سوال۔ مذہبی انتہا پسندی کا خاتمہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

رحمان صاحب۔ مذہبی انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ مذہب پر بحث کے دروازے کھولے جائیں۔ مذہب پر بحث نہ ہونے سے مذہبی انتہا پسندی کو فروغ ملتا ہے۔ ہمارے ہاں مذہب پر بحث کرنے کی روایت موجود تھی اور لوگ اللہ تعالیٰ، رسول کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور قرآن پاک کے علاوہ دیگر تمام چیزوں کے متعلق بحث کرتے تھے مگر پاکستان بننے کے تقریباً ایک سال بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ باہر کے ممالک میں کام ہو رہا ہے۔ ہمارے ایک سوڈانی دوست نے مذہب اسلام پر تحقیق کی اور بتایا کہ مکی آیات کی بنیاد اعتدال پسندی، میانہ روی، عفو، درگزر اور انسانی حقوق کے احترام پر ہے جبکہ مدنی آیات کی بنیاد جبر اور تشدد پر ہے۔ اس لیے اگر ہم مکی آیات کو مدنظر رکھ کر اپنے اصول وضوابط بنائیں گے تو انسانی حقوق کو تحفظ حاصل ہوگا جبکہ اگر مدنی آیات کو بنیاد بنائیں تو انسانی حقوق متاثر ہوں گے۔ اس کے علاوہ ترکی، یورپ اور امریکہ میں بھی کام ہو رہا ہے۔ شکاگو یونیورسٹی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بنیاد پرستی کے مضمون پر ایک تحقیقاتی پروگرام چلایا جا رہا ہے لیکن یہاں پر اس قسم کی کتابیں نہیں لائی جا رہیں۔ یہاں پر بھی مذہبی معاملات پر بحث و مباحثہ ہونا چاہیے۔ ہم چھوٹے تھے تو سنتے تھے کہ دو تین کے علاوہ تمام معاملات پر بحث ہوتی ہے مگر اب ان دو، تین کے علاوہ باقی تمام معاملات پر بحث و مباحثہ نہیں ہو سکتا۔

سوال۔ جو لوگ مغربی انتہا پسندی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں، اس کا حل کیا ہے؟

رحمان صاحب۔ میں نے عرض کیا کہ مغربی انتہا پسندی بھی اتنی ہی قابل مذمت ہے جتنی دیگر ہیں بلکہ آپ اس کو اور زیادہ قابل مذمت کہہ لیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس سے نکلنے کے لیے کیا چاہیے؟ اس سے نکلنے کے لیے دو چیزیں چاہئیں۔ ایک آپ کی سوچ کی درستگی اور دوسرا آپ کی معیشت کا استحکام۔ علامہ اقبال نے کہا ہے

''ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات''

آپ کا نظام ایسا ہونا چاہیے جو انصاف اور برابری پر مبنی ہو۔ جس میں لوگ اس ملک کو اپنا ملک سمجھیں تو پھر آپ دوسروں کے مرہون منت نہیں رہیں گے۔ مغربی انتہا پسندی کا جواب انتہا پسندی نہیں۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی شخص نے کہا ہو کہ اگر کسی شخص کو باولا کتا کاٹ لے تو اس شخص کو باولے کتے کو کاٹ لینا چاہیے۔

سوال۔ ایک ساتھی نے پوچھا ہے کہ انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے چند زریں اصول بتائیں۔

رحمان صاحب۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ نذیر اکبر الہ آبادی نے جو کہا ہے کہ مسجد سے جو چراتا ہے جوتیاں، ہے وہ بھی آدمی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو ہم سے اختلاف بھی کرتا ہے، ہے وہ بھی آدمی، اور اس کا مقابلہ ہم اپنی آدمیت کے حوالے سے کریں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں کے عقیدے کے حوالے سے ان سے جھگڑا مت کریں۔ کسی کو یہ مت کہیں کہ تمہارا عقیدہ غلط ہے۔ بلکہ اسے یہ بتائیں کہ میانہ روی، رواداری اور پیار محبت کے کیا فوائد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ کیا یہ میرے لیے ناممکن تھا کہ میں سب لوگوں کو مسلمان بنا دیتا؟

سوال۔ کیا ہم قبائلی جھگڑوں کو بھی انتہا پسندی کہہ سکتے ہیں؟

رحمان صاحب۔ میں نے عرض کیا تھا کہ انتہا پسندی قبائلی جھگڑے کی شکل میں بھی ہوتی تھی۔ قبائلی صحرا میں رہتے تھے اور ایک ہی چشمہ ہوتا تھا جس پر قبضہ کرنے کے لیے قبائل ایک دوسرے کے خلاف لڑتے تھے اور ایک دوسرے کے افراد کو قتل کرتے تھے۔

سوال۔ کیا پاکستانی سرحدوں پر ڈرون حملے بھی انتہا پسندی میں شامل ہیں؟

رحمان صاحب۔ کسی حد تک۔

سوال۔ انتہا پسندی کے ضمن میں کون کون سے سرکاری ادارے ذمہ دار ہیں؟

رحمان صاحب۔ تمام سرکاری ادارے ذمہ دار ہیں۔ ہم بھی ذمہ دار ہیں۔ دیکھیں اگر آپ نے بچوں کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میثاق پڑھا ہے تو اس میں لکھا ہے کہ بچوں کو آخری چارے کے طور پر گرفتار کیا جائے۔ ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ طاقت کا استعمال آخری حربے کے طور پر کیا جائے۔

یہ ایک سوال آیا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جو انتہا پسندی پھیلا رہے ہیں۔ اس طرح کے الفاظ استعمال کرنا بھی انتہا پسندی ہے۔ اسلام میں بندے اور خدا کے درمیان کوئی چیز نہیں ہے۔ اسلام میں ملا اور پادری کا وجود نہیں ہے۔ یہ پتہ نہیں کہاں سے آ گئے ہیں۔ بندہ صرف اپنے خدا کو جوابدہ ہے۔ یہ لوگ کیوں محشر سے پہلے ہر روز محشر لگا لیتے ہیں۔

سوال۔ کیا انتہا پسندی کے پھیلانے میں حکومت بھی شامل ہے؟

رحمان صاحب۔ کسی حد تک یہ بات درست ہے۔ کیونکہ ریاست کا جبر، جبر سکھاتا ہے۔ ریاست جبر نہ کرے تو لوگ ایک دوسرے پر جبر نہیں کریں گے۔

سوال۔ کیا مذہبی کتاب کی حرمت ہونی چاہیے؟

رحمان صاحب۔ مذہبی کتب کی ہر حال میں حرمت ہونی چاہیے اور جو آدمی ان کی بے حرمتی کرتا ہے وہ ذہنی لحاظ سے بیمار ہے اس کے ساتھ بیماروں جیسا سلوک ہونا چاہیے۔ ہماری تہذیب میں کتاب کی حرمت کی جاتی تھی۔ انگریزی، اردو اور فارسی سمیت تمام اقسام کی کتابوں کی عزت کی جاتی تھی کیونکہ ان میں علم ہوتا تھا۔ مذہبی کتب لوگوں کے عقائد کے متعلق ہوتی ہیں، اس لیے ان کی حرمت اور زیادہ ضروری ہے۔

سوال۔ کیا انتہا پسندی کی ابتدا سیاست سے شروع رہتی ہے؟

رحمان صاحب۔ نہیں سیاست بھی انتہا پسندی ہے۔ لیکن انتہا پسندی تو بچپن سے شروع ہو جاتی ہے۔

سوال۔ کیا امریکی مداخلت بند ہو جائے تو انتہا پسندی کم ہو سکتی ہے؟

رحمان صاحب۔ ہاں میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اگر خارجی اثرات کم ہوں تو اس ضمن میں ضرور فرق پڑے گا۔

سوال۔ کیا بھوک و افلاس بھی انتہا پسندی کی وجہ ہے؟

رحمان صاحب۔ ہاں یہ بھی اس کی وجہ ہے۔

سوال۔ تعلیمی اداروں میں کونسے طریقے اختیار کئے جائیں کہ نوجوان نسل انتہا پسندی سے محفوظ رہے؟

رحمان صاحب۔ تعلیمی اداروں میں اختلافات کی باتیں بتانے کی بجائے مفاہمت اور اتفاق کی باتیں بتائی جائیں۔ غزوات کی بجائے صلح حدیبیہ طلباء کو بتایا جائے اور میانہ روی، اعتدال پسندی، پیار اور محبت کی باتیں بتائی جائیں۔

سوال۔ پاکستان میں انتہا پسندانہ رویوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جتنا ظلم مسلمانوں پر پاکستان میں ہو رہا ہے اتنا ہندوستان میں نہیں ہو رہا؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رحمان صاحب۔ یہ بات درست ہے۔ مشرق پاکستان میں جتنے مسلمان، مسلمانوں نے قتل کیے ہیں، اتنے انگریزوں اور ہندوؤں نے مل کر بھی نہیں کیے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آپس میں لڑائیاں زیادہ ہوئیں اور غیر مسلموں سے کم۔ اورنگ زیب اور ہمایوں کی کن سے لڑائی ہوئی تھی؟ عثمانیوں کی لڑائی کن سے ہوئی تھی؟ آپس میں لڑنا ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔

سوال ۔سلمان تاثیر کے قتل کے بعد یوں لگتا ہے کہ چند افراد کے علاوہ تمام ملک انتہا پسند ہو گیا ہے؟

رحمان صاحب۔ یہ ایسا ہی ہے اور ایسا کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ انتہا پسندی کی کوئی حد بھی ہے؟ دیکھیں انتہا پسندی کو روکنے کے لیے انصاف کا ہونا ضروری ہے پھر معیشت کا استحکام اور تعلیمی اداروں کا نظام تعلیم درست سمت میں ہونا چاہیے۔

سوال ۔کیا انتہا پسندی کے پھیلانے میں فوج اور ایجنسیوں کا کردار بھی رہا ہے؟

رحمان صاحب۔ ہاں ان کا کردار رہا ہے اور آج بھی جاری ہے۔

سوال ۔ جب اقوام متحدہ کسی چھوٹے ملک پر حملہ کرنے کی اجازت دے دے تو اسے ہم کیا کہیں گے؟

رحمان صاحب۔اسے ہم جارحیت اور زیادتی کہیں گے اور اس کی مذمت کریں گے۔ لیکن اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ چھوٹے ملکوں کی اکثریت تھی اقوام متحدہ میں اور ہم نے وہ تمام تنظیمیں ختم یا غیر فعال کر دیں جو ہماری طاقت کا ذریعہ تھیں۔

سوال ۔انتہا پسندی اور جاگیردارانہ نظام میں اقلیت کا کیا مستقبل ہوگا؟

رحمان صاحب۔ میرے خیال میں جاگیردارانہ اقدار اور مذہبی انتہا پسندی کا گہرا تعلق ہے۔ مذہبی انتہا پسندی اور جاگیردارانہ نظام کا صرف اقلیت ہی نہیں بلکہ اکثریت بھی شکار ہے۔ یہ بات میں عرض کر دوں کہ جب تک ملک میں جاگیردار نظام قائم رہے گا، اس وقت تک انتہا پسندی موجود رہے گی۔

سوال۔ اصولی موقف اور انتہا پسندانہ موقف کو کن معیارات پر پرکھا جائے؟

رحمان صاحب۔ عالمگیر اور آفاقی انسانی اقدار کی بنیاد پر پرکھا جائے جو اقدار تمام مذاہب، تقاضوں اور سماجوں میں مشترکہ ہیں۔

سوال ۔بلوچستان میں فوجی آپریشن انتہا پسندی کے زمرے میں آتا ہے؟

رحمان صاحب۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ ریاستی انتہا پسندی ریاست کی ناجائز اور ظالمانہ سرگرمیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ بلوچستان کے لوگوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور ان کے خلاف جو زیادتیاں روا رکھی جا رہی ہیں وہ انتہا پسندی کے زمرے میں آتی ہیں۔

(بشکریہ جہد حق، مئی 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندی کی وجوہات اور ساخت......مختلف ممالک سے چند مثالیں

(خالد احمد)

ایک وقت تھا جب مصر کو انتہا پسند ریاست کہا جاتا تھا جہاں معاشرہ انتہا پسندی کا شکار تھا پھر نائجیریا اس میں گھر گیا۔اس کے بعد سوڈان اور صومالیہ نے بھی پر تشدد رویہ اختیار کیا اور ایران بھی افغانستان کے بعد اس ذمرے میں شامل ہو گیا۔

آج پاکستان انتہا پسند کارروائیوں کا گھر سمجھا جاتا ہے۔اس کی انتہا پسندی سماجی ہے۔ریاست نے مدافعانہ پالیسی اختیار کی ہوئی اور ہر گزرتے روز کے ساتھ شہریوں کو اس کا نشانہ بننے سے بچانے کی ریاستی استداد میں کمی واقع ہو رہی ہے۔بدقسمتی سے پاکستان باقی اسلامی دنیا کے لیے بھی انتہا پسندی کی نرسری کے طور پر ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔

انتہا پسندی اور تبدیلی کا تصور: انتہا پسندی اور تبدیلی کا تصور: انتہا پسندی ایک ذہنی رویہ ہے جو مسائل کے غیر موزوں حل کے حصول پر زور دیتا ہے۔عدم اعتدال شدت پسند برادری کی جذباتیت سے آتا ہے جو عام طور پر بنیاد پرست تبدیلی کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔انتہا پسند اپنے قوت بازو سے حالات کو اپنی تبدیلی کے تصور کی مطابقت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔اعتدال پسند ذہن تبدیلی کے تصور کو حالات کی مطابقت میں کرنے کی سعی کرتے ہیں۔انتہا پسندی کی بنیاد کو تبدیل کرنا ضروری ہے۔

انتہا پسندی کے دو پہلو ہیں جو اسے منفرد کرتے ہیں۔یہ دھمکانے اور تشدد کرنے پر مبنی ہے جو انتہا پسندی کا سہارا لیتے ہیں، دھمکیاں اور تشدد اس کا ردعمل ہوتا ہے۔پیغام یہ ہے کہ کسی نے کچھ کہا جس نے ناگزیر انتہا پسند جذبات کو جنم دیا۔شدت پسند اپنے آپ کو مظلوم پارٹی کے طور پر دفاع کرے گا جو کہ ظالم کے ہاتھوں مجبور ہے۔کیا شدت پسندی جاہلوں کی اماجگاہ ہے؟ کیا یہ کمزور برادری کا سیشن کی پالیسیوں کے خلاف ردعمل ہے؟ اگر شدت پسندی کسی غیر منصفانہ عمل کا نتیجہ ہے تو یہ مؤثر بھی ہو سکتی ہے۔اگر ردعمل ظاہر کرنے والی برادری برتری کی ترقی کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طاقت رکھتی ہے اور یہ خود کو نقصان پہنچانا بھی ہو سکتا ہے اگر رد عمل ظاہر کرنے والی برادری کمزور ہے۔ طاقت اور دانشمندی۔ اگر طاقتور برادری کی طرف سے پیدا کردہ غیر منصفانہ واقع کے لیے رد عمل کا کہا جائے تو کمزور پارٹی کو حکمت اور لچک کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ کمزور برادری شدت پسندی کے ہاتھوں دُکھ پہنچنے کے خدشے کے باعث ایسا کرتی ہے۔ حکمت کے برعکس سماج کی شرائط کا احترام کیا جاتا ہے۔ ادب و احترام کو غیر لچک دار اصولوں کی بنیاد پر حاصل کیا جاتا ہے اور جبکہ حکمت کو موجودہ مشکلات کو لچک کے ذریعے۔

اصولی سختی کا مشورہ دیتے ہیں۔ حکمت لچک کی سفارش کرتی ہے۔ عزت کا نقطہ عروج شہادت ہے اور حکمت کا عروج زندگی ہے۔ کمزور کو حکمت کی ضرورت ہوتی ہے اور مضبوط عزت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس وقت کہ سماج اس حد تک معاشی ترقی کر جائے جہاں جائیداد کو کمزور کے ہاتھوں نقصان پہنچایا جا سکتا ہو۔

انتہا پسندی کو عام طور پر عزت کو دوبارہ حاصل کرنے کے حقائق میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تیسری دنیا کے معاشرے معاشی طور پر پسماندہ اور نام نہاد عزت کے نام پر بنی ہے۔ نام نہاد عزت کے حصول کے دباؤ کے تحت دو شعبے بدحالی کا شکار ہیں۔ معیشت اور خارجہ پالیسی دونوں معیشت اور خارجہ پالیسی موقع پرستی پر مبنی ہیں۔ نام نہاد اصولوں کی بجائے دانشمندی اختیار کریں۔

مقبول جذبات میں سیاستدانوں کا ثالثی کردار: مقبول جذبات ہمیشہ شدید ہوتے ہیں۔ کمزور ریاست کی ''حقیقت پسندی'' کی بنیاد پر سیاستدانوں کو ثالثی کردار ادا کرنا چاہیے جبکہ سیاستدان ثالثی کرنے کے بجائے بعض سماجی حالات کے پیش نظر ان مقبول جذبات کو نہ صرف اکساتے ہیں بلکہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ قدامت پسند معاشرے جب تعلیم سے آراستہ نہیں ہوتے تو یہ تنگ نظری اور عدم برداشت پیدا کرتے ہیں۔ تنگ نظری اور عدم برداشت شدت پسندی کے فروغ کے بنیادی اسباب ہیں اور یہ طاقتور دشمن ریاست میں عدم انصاف کی بنیاد ڈالتا ہے۔ اسی لیے انتہا پسندی کو خالصتاً ایک رد عمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انتہا پسندی کی قدرتی خصوصیات کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کی شدت پسندی کے رد عمل کے طور پر خود کو نقصان پہنچنے کے بارے میں بحث ہونی چاہیے۔

پاکستان عالمی مظہر اسلامی کا ایک حصہ ہے۔ آئیے جمہوری تناظر میں دیکھیں کہ کس طرح اسلامی معاشرے انتہا پسندی کا شکار ہیں۔ 1987 میں 404 لوگ جن میں 270 ایرانی تھے مکہ مکرمہ میں بدامنی کے باعث مارے گئے۔

مسلم دنیا کی شدت پسندی: جب آیت اللہ منتظری نے ایرانیوں کے خلاف اسلامی انقلاب کے بعد ظالمانہ اقدامات اٹھانے کے بعد امام خمینی نے یہ کہتے ہوئے تنقید کو رد کیا کہ وہ (امام خمینی) بنو قریظہ کے ساتھ روا کیے جانے والے سلوک کی مثال کی پیروی کر رہا ہے۔ 1994 تک 48 ادیب اور صحافی مار دیے گئے جن میں ناول نگار رحمٰن حنفی اور سید سلطان پور بھی شامل ہیں اور ہزاروں دانشوروں کو جیل بھیجا گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصر میں 1980 کے پریس قانون کے باعث دانشور خوف زدہ ہیں۔ ناول نگار علی حامد کو 1997 میں ایک ناول لکھنے کے جرم میں اغوا اور پابند سلاسل کیا گیا۔ 1993 میں عدالت نے ابوزید نامی مصری پروفیسر کو مرتد قرار دیا اور اس کی بیوی کو جبری طور پر اس سے جدا کروا دیا گیا۔

اسی سال ناوال الصدوائی کو ایک قابل اعتراض ناول لکھنے کے باعث جلاوطن کر دیا گیا کیونکہ اس نے اپنی ختنہ ہونے کا خوف کو بیان کیا تھا جو کہ اس علاقے کی ایک رسم ہے جس کا شکار افریقی علاقے کی خواتین کی اکثریت ہے اور ایک بھی مذہبی رہنما نے یہ نہیں کہا کہ یہ قرآن کی تعلیمات کے منافی ہے۔ 1995 میں ایک الجیرئین کارٹونسٹ کو اغوا کے بعد قتل کر دیا گیا۔ اسلامی معاشرہ اور دانشوروں کی حالت زار: 1992 میں ایرانی کارٹونسٹ کریم زادے کو ایک سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا اور پچاس کوڑے لگائے گئے، اس الزام کی بنیاد پر کہ اس کا کارون روحانی رہنما کی شکل سے ملتا جلتا ہے۔ ایران نے اخبارات اور نشر و اشاعت کو غیر اسلامی قرار دے کر ان پر پابندی عائد کردی۔ ان میں سے ایک میگزین سابق صدر رفسنجانی کی بیٹی کی زیر ادارت تھا۔

الجیریا میں متشدد اجمیرین فوج نے ایک مذہبی جماعت ایف آئی ایس کو انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے باوجود حکومت نہ کرنے دی۔ یہ جماعت افغان مجاہدین سے متاثر ہونے والے ایک انتہا پسند گروہ جی آئی اے کے ساتھ مل کر دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہوگئی۔ 1995 میں جی آئی اے جدت پسند رجحان رکھنے والے صحافیوں کو قتل کیا۔ اس نے خصوصاً کارٹونسٹوں کو گستاخ قرار دیتے ہوئے نشانہ بنایا۔

1998 میں پاپ گلوکار مارتوب کو جی آئی اے نے ہلاک کیا۔ 1999 میں نائجیریا کی ریاست زمفرا میں شریعت لاگو کر دی گئی اور ایک ہجوم نے یہ کہتے ہوئے تیز دھار آلے کے ساتھ ایک معمولی چوری کے واقعے میں ملوث آدمی کے ہاتھ کاٹ دیئے کہ وہ سعودی عرب کے نظام کی پیروی کریں گے جہاں لوگ بغیر کسی چوری کے خوف کے دکانات کھلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ 1998 میں نائجیریا میں چھ افراد کو سنگسار کر کے ہلاک کر دیا گیا جبکہ قانون قصاص کے آرٹیکل 119 میں درج ہے کہ رجم کے لیے بطور سزا استعمال ہونے والے پتھر اتنے بڑے نہیں ہونے چاہئیں کہ متاثرہ فرد فوراً ہلاک ہو جائے۔ 1980 میں حکمران خاندان کے ایک فرد کی بیٹی کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے جرم میں ایک سعودی شہری کا سر قلم کر دیا گیا۔ لڑکی کو سر میں گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

انتہا پسندی بطور تبدیلی کا ذریعہ: 1997 میں ملائشیا میں قریبی تعلقات استوار کرنے کے جرم میں ایک جوڑے کو گرفتار کرلیا گیا۔ افغانستان میں لوگ سزا کے خوف سے داڑھی رکھنے پر مجبور تھے اور شارٹس پہننے اور پتنگ اڑانے پر لوگوں کو کوڑے مارے جاتے تھے۔ خواتین کو محرم کے بغیر باہر نکلنے پر مارا پیٹا گیا۔ 2001 میں ایک افغان فلمساز سائرہ شاہ نے ایک فلم بنائی جس میں دکھایا گیا کہ طالبان نے بعض لڑکیوں کے سامنے ان کی والدہ کو قتل کر کے بعد ازاں ان کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ خدا پر ایمان رکھنے والے کسی متشدد آدمی کو انتہائی رجعت پسندانہ فتوے دینے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے۔یہ اندھا ہونے کی ضرورت ہے۔سعودی عرب کے معروف نابینا، مذہبی عالم مرحوم شیخ بن باز نے کہا کہ جو آدمی اس مفروضے پر یقین نہ رکھے کہ زمین جامد ہے اور سورج کے گرد گردش نہیں کرتی وہ ایمان کے دائرے سے خارج ہے۔ بادشاہ فیصل نے اس کی کتاب ضبط کرنے کی کوشش کی تھی مگر بہت دیر ہو چکی۔ مصر کے نابینا شیخ عمر عبدالرحمان اتنے متشدد خطیب تھے کہ وہ اپنے ملک میں تشدد پھیلانے کا سبب بنے اور امریکہ میں جلاوطن کر دیے گئے جہاں وہ 1993 میں ٹریڈ سنٹر میں ہونے والے بم دھماکوں کی منصوبہ سازی کرنے کے مرتکب قرار پائے۔ 1988 میں معروف ناول نگار نجیب محفوظ کو نوبل پرائز ملا مگر ان کے کام پر ہونے والی سرکاری تنقید کے باعث مشتعل ہونے والے ایک نوجوان نے تیز دھار آلے سے وار کر کے انہیں زخمی کر دیا۔

1976 میں مصر کی انتہا پسندانہ الاظہر یونیورسٹی سوڈان کے جدت پسند اسلامی رہنما محمد طٰہٰ کی ہلاکت کا سبب بنی۔ ایران میں جدت پسند آیت اللہ شریعت مداری کو انتہا پسند قیادت کے مقابلے میں مسترد کر دیا گیا۔ پاکستانی ریاست میں تضحیک مذہب قانون جیسے انتہا قوانین موجود ہیں۔ پاکستانی معاشرے پر انتہا پسندوں کا تسلط ہے جو ان میں ترامیم کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔حقوق نسواں مخالف قوانین میں اصلاحات لانے کے خلاف جسٹس (ریٹائرڈ) تقی عثمانی جیسے معتدل افراد نے بھی ردعمل کا مظاہرہ کیا، جن کے ادارے دارالعلوم، کراچی میں انتہا پسندانہ نظریات کا پرچار ہو رہا ہے۔

طالبانائزیشن کی لہر اور پاکستان میں موجود متشدد فضا کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہ لوگ بلاواسطہ اس کی حمایت کرتے ہیں جو اسلامی اقدار کی علمبرداری کا دعویٰ کرتے ہیں اور جنہوں نے لال مسجد کے ملاؤں کے اقدام کی کھلے عام حمایت کی تھی جن میں اس وقت ملک کے وزیر مذہبی امور بھی شامل تھے۔

انتہا پسندی پاکستان میں کم نہیں ہو رہی کیونکہ کوئی بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔اس کا متشدد پن معاشرے میں بڑھتے ہوئے اختلاف رائے پر مبنی ہے۔ پاکستان شاید بیرونی دشمن کے خلاف اتنا ردعمل ظاہر نہ کرنے جتنا وہ معاشرے کے اندر پائے جانے والے اختلاف رائے پر ظاہر کر رہا ہے۔ اختلاف رائے میں جاذبیت پائی جاتی ہے۔اتفاق رائے میں رسوائی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ جب کوئی فرد اتفاق رائے کا اظہار کرتا ہے تو وہ قوم کی رسوائی کے معاہدے میں شریک ہوتا ہے۔ پاکستان میں عزت وقار کا حصول محض اختلاف رائے کے ذریعے ممکن ہے اور انتہا پسندی اختلاف رائے کا ہتھیار ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے ہماری ذمہ داریاں

(آئی۔اے۔رحمٰن)

گزشتہ جمعہ کو ناروے میں قیمتی انسانی جانوں کا جو بھاری اتلاف ہوا ہے اس نے دنیا کے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس سانحے نے، یورپین معاشروں، عمومی طور پر دنیا کے مسلمانوں اور پاکستان کے عوام کے روبرو انتہائی سخت سوالات رکھے ہیں۔

یورپ بذات خود اپنے آپ اور دنیا بھر کے ساتھ انتہائی ناانصافی کرے گا...... اور یہ بات یورپ اور دنیا دونوں کے لیے سودمند نہیں ہوگی...... اگر یورپ اس معاملے کو ایک دیوانے کی کارروائی قرار دیتا ہے جو اس نے تنہا ہی سرانجام دیا اور کسی دوسرے کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے...... اسے ان تمام عوامل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہوگا جن کی بنا پر اینڈرس بہرنگ بریوک کو گمراہ کن اور غیر فطری ذکاوت اور ذہانت کا سہارا لینا پڑا۔

القاعدہ، دیگر نام نہاد تنظیمیں اور وہ مسلمان جن کے سروں پر خود کو بڑا سمجھنے کا خبط سوار ہے، سب نے مل جل کر یورپ اور مغربی دنیا کے دوسرے حصوں میں ''اسلام فوبیا'' (اسلام کا ہوا) پھیلانے میں یقیناً ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن مجرموں کی فہرست کو صرف انہی تک محدود کر دینا غلط ہوگا۔ اس امر کا جائزہ لینا بھی ضروری ہوگا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے اختیار کیے جانے والے لب و لہجے نے مسلم دنیا میں عسکریت پسندی اور مغرب میں مسلمانوں کے خلاف غیر محتاط تنقید دونوں کو فروغ دینے میں کس حد تک کردار ادا کیا ہے۔ تاہم، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم ایک فریق کا الزام دوسرے کے سر پر تھوپ دیں...... یہ صرف اس بات کی دلیل ہے کہ ہم یورپ میں دہشت گردی کے مقامی ذرائع اور سرچشموں کو بھی ذہن میں رکھیں۔

دنیا کے لیے شاید یورپین فاشزم کے عروج کو بھولنا ممکن نہ ہو...... یورپین فاشزم جس نے اپنے اقتدار کی عمارت نسل پرستی کو ہوا دے کر اور بعض مذہبی اور لسانی برادریوں (یہودیوں اور کالوں) کو اذیتیں پہنچا کر کھڑی کی تھی، نازی ازم ایک ایسی بیماری ہے جس میں یورپ کے بیشتر حصے اب بھی مبتلا ہیں۔ ناروے کے عوام ایک عشرے سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ عرصے تک بذات خود جدید، نازی اور دیگر انتہائی دائیں بازو سے منسلک گروہوں کے بارے میں بہت فکر مند رہتے ہیں۔ یہ حقائق یورپین معاشروں کے لیے اس بات کو بہت ضروری بنا دیتے ہیں کہ وہ ایسے عناصر سے محتاط رہیں جو دہشت گردوں اور تارکین وطن کے خلاف عوامی جذبات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہوں تاکہ ان پر دائیں بازو کی بربریت کی نئی اور زیادہ بھیانک اشکال کو مسلط کیا جا سکے۔

اسلامی فلسفہ اور مسلم رائے عامہ کے رہنما اپنے طور پر یورپی اقوام کو صرف یہ کہہ کر کہ وہ ضروری اصلاح کر لیں، حقائق سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ نہ ہی وہ یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا سکتے ہیں کہ دہشت گرد اسلامی دانشوروں اور عام مسلمانوں دونوں کی ہی ایک معمولی اقلیت پر مشتمل ہیں...... یہ رائے چاہے کتنی ہی درست کیوں نہ ہو...... انہیں دہشت گردوں میں موجود مسلمانوں کی بڑی تعداد اور تسلیم شدہ مسلم ماہرین کی طرف سے جاری کیے جانے والے ان فتوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو نہ صرف یہ کہ دہشت گردی کی کارروائیوں کو نظر انداز اور ان کا جواز پیش کرتے ہیں...... بشمول خودکش حملوں کے نتیجے میں بے قصور شہریوں کا قتلِ عام...... بلکہ اسلام کے پیروکاروں کو ایسی کارروائیوں میں حصہ لے کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔

جس حد تک علماء اور مسلم سیاسی رہنما دہشت گردی کی کارروائیوں میں مسلمانوں کے ملوث ہونے کا اعتراف کرتے ہیں یا اعتراف کرنے کے لیے تیار ہیں اس سے قطع نظر ان علماء اور رہنماؤں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ان مسائل کے حل کے لیے اپنا کردار ادا کریں جو ان گروہوں اور افراد کے پیدا کردہ ہیں۔ جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اسلام کے سپاہی ہیں۔ سب سے اہم حقیقت جس کا مسلمانوں کو احساس کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اگر اس فتنے پر فوری طور پر قابو نہیں پایا جاتا جو ان کے ایک جنونی گروہ نے پھیلا رکھا ہے تو انہیں اور ان کی آنے والی نسلوں کو ناقابل تصور نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

پاکستان کے عوام کو دوسروں کے مقابلے میں اپنے اندرونی محرکات وعقائد کا زیادہ عمیق تجزیہ کرنا ہوگا کیونکہ بریوک نے اپنے گھناؤنے جرم کے لیے اس ملک کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ انہیں اس لیے بھی یہ صدمہ برداشت کرنا پڑے گا کیونکہ دنیا میں امن کو فروغ دینے کے حوالے سے ایک ذمہ دار ملک ہونے کے علاوہ ناروے کا رویّہ پاکستان کے ساتھ ہمیشہ ہی مشفقانہ رہا ہے۔ کئی برسوں تک ناروے معاشی ترقی، انتخابی اصلاحات، تعلیم، ثقافت، میراث، خواتین کو بااختیار بنانے اور انسانی حقوق کے تمام شعبوں میں پاکستان کی نمایاں معاونت کرتا رہا ہے۔ اس کا رویّہ پاکستانی تارکین وطن کے ساتھ بھی بڑا مساویانہ اور فیاضانہ رہا ہے جو مقامی معاشرے میں اب نمایاں حیثیت کے مالک ہیں اور سالہا سال پاکستان کو خاصی رقوم بھیج رہے ہیں۔

یہ تمام عوامل پاکستان کے لیے اس بات کو بہت ضروری بنا دیتے ہیں کہ وہ اس امر کو یقینی بنائے کہ ناروے کے عوام بریوک اور اسی قماش کے دیگر افراد کی زہر آلود باتوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ اہم سوال یہ ہے: کیا ہم بے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قصور ہیں۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم پاکستانیوں نے جدید نازیوں یا دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے دیگر انتہا پسندوں کو اس بات کی دعوت نہیں دی اور انہیں یہ جواز پیش نہیں کیا کہ وہ باہر نکل کر لوگوں کا قتل عام شروع کر دیں۔

پاکستانی عوام کے اجتماعی طرز عمل میں پائے جانے والے نمایاں تضادات میں ایک تضاد یہ ہے کہ جبکہ ریاست مذہبی لبادہ اوڑھے ہوئے عسکریت پسندوں کے خلاف ایک شدید اور لمبی لڑائی میں مصروف ہے اور ہم دنیا کو یہ بتاتے رہتے ہیں کہ اس لڑائی میں ہمارے کتنے افراد مارے گئے ہیں۔ پاکستان کے نام نہاد جہادیوں کو کبھی بھی ذہنی یا حتی کہ مذہبی سطح پر بھی چیلنج نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس ریاستی ادارے، سیاسی جماعتیں اور میڈیا...... ان میں سے چند ایک جزوی طور پر دیگر مکمل طور پر اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت...... اگر وہشت گردوں کے ساتھ براہ راست شراکت نہیں تو ان کے ساتھ ہمدردی اور بھائی چارے کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ نفرت کے اس ماحول کے لیے سازگار ثابت نہیں ہوگا جو جدید نازیوں نے دنیا بھر میں پیدا کر رکھا ہے؟

بریوک نے ان پاکستانی تارکین وطن جنہوں نے خود کو میزبان برادریوں کے ساتھ ضم کر لیا ہے اور وہ جو خود کو مقامی برادریوں کے ساتھ ضم کرنے میں ناکام رہے ہیں ایک تمیز برقرار رکھی ہے۔ موخر الذکر کے طرزِ عمل کا تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ کئی ایسے مواقع بھی آئے جب پاکستانیوں نے کسی خاتون کو ''عزت'' کے نام پر قتل کر کے، اغوا کرنے کے بعد اپنی بچیوں کی ان کی مرضی کے خلاف شادی کر کے اور ناروے کی اور پاکستانی لڑکیوں کو دھوکہ دے کر ناروے کی انتظامیہ اور شہریوں کو صدمے سے دوچار کیا۔ ناروے یا کسی بھی دوسرے ملک کی میزبان برادری یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ اس نوعیت کے جرائم کا ارتکاب کر کے ان کی میزبانی سے غلط فائدہ اٹھایا گیا اور وہ تمام تر پاکستانی کمیونٹی کو مجرموں اور دھوکہ بازوں کا ایک ٹولہ قرار دے گی۔

پاکستان سے ناروے جانے والے ان افراد کے طرز عمل کا بھی جائزہ لینے کی ضرورت ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مذہبی دوروں پر ہیں۔ برطانیہ میں نام نہاد مذہبی مبلغین نے جو تباہی مچائی ہے ہم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے مسلم تارکین وطن برادریوں کو آپس میں لڑوایا۔ مسجدوں پر قبضہ کرنے کے لیے جنگیں کیں۔ سادہ لوح افراد کا استحصال کیا اور بھتہ وصولی کے دھندے قائم کیے۔ کیا یورپ میں پاکستانی مشنوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ ایسی مکروہ سرگرمیوں کی مانیٹرنگ کریں یا انہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ یورپی ممالک میں مقیم پاکستانیوں کو میزبان معاشروں کے قوانین اور کلچر کے احترام کی پابندی کو یقینی بنانے کے لیے مناسب اقدامات اٹھائیں...... بجائے اس کے کہ وہ دنیا کو فتح کرنے کے اپنے خوابوں کا پروپیگنڈہ کریں...... حال ہی میں ناروے کے عوام اس وقت بہت تاؤ میں آ گئے جب اس کے ایک شہری، احسان ارجمندی کو مبینہ طور پر بلوچستان میں سکیورٹی ایجنسیوں کے اہلکاروں نے اٹھا لیا تھا اور ناروے کی حکومت کی طرف سے برآمدگی کی تمام تر کوششوں کے باوجود پاکستانی انتظامیہ کسی ایسے ردعمل کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہی تھی جو صورت حال کا تقاضہ تھا۔ اس واقعہ نے ناروے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں جو پبلسٹی حاصل کی اس نے پاکستان اور اس کے عوام کو یوں پیش کیا جیسے وہ رویہ اور سلوک کے حوالے سے...... انتہائی غیر دوستانہ یا حتیٰ کہ غیر ذمہ دار عناصر (افراد) تھے۔ ایسے واقعات نہ صرف یہ کہ پاکستان کے لیے بدنامی کا باعث بنتے ہیں بلکہ یہ سرمایہ کاروں اور تاجروں کو بھی خوف زدہ کر دیتے ہیں اور اس کے معاشی مفادات پر منفی اثرات مرتب کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

البتہ، ناروے کے چھوٹے سے جزیرے پر موت کا ایجنٹ بننے والا شخص پاکستانی نہیں تھا اور نہ ہی اس کے زیر استعمال ہتھیار پاکستان کے بنے ہوئے تھے لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس دنیا کو ہم انسانوں کے لیے ایک غیر محفوظ جگہ بنانے میں پاکستانیوں نے کوئی کردار ادا نہیں کیا ہے۔ کیا تاریخ ہمیں بے قصور قرار دے گی۔ آیئے! ہم سب پاکستانی اس بات پر غور کریں اور کوئی حل تلاش کریں کہ لوگ ہمیں بین الاقوامی گداگر یا اچھوت نہ سمجھیں۔ قطعی الیے کی اس کی گھڑی میں ناروے کے عوام نے جس نظم وضبط اور تحمل کا مظاہرہ کیا ہے اس سے ہم کئی سبق سیکھ سکتے ہیں۔

(بشکریہ 'جہد حق' اگست 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوتھا باب

(انتہا پسندی کے انسداد یا فروغ میں میڈیا کا کردار)

- جاننے کا حق (آئی۔اے۔رحمٰن)
- الیکٹرانک میڈیا میں غیر تربیت یافتہ عملہ کی بھرمار اور اس کے اثرات (ڈاکٹر مہدی حسن)
- نوزائیدہ نجی ٹی وی چینلز کی مقابلہ بازی اور لاشعوری طور پر انتہا پسندی کا فروغ (ڈاکٹر مہدی حسن)
- انتہا پسندی کے انسداد یا فروغ میں میڈیا کا کردار (امجد علی شاکر)
- فکر کے زاویے (حفیظ بزدار)
- ذرائع ابلاغ میں اخلاقی اقدار کا فروغ اور عملہ کی تربیت وقت کی اہم ضرورت (زہرہ یوسف)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاننے کا حق

(آئی۔اے۔رحمٰن)

جب بھی کسی مسلمان معاشرے میں 'جاننے کا حق' پر بحث ہوتی ہے تو مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے کہ اس کے لیے ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا جائے کیونکہ جتنی تھوڑی بہت میری مذہب سے واقفیت ہے آدم کو فرشتوں پر فوقیت صرف اس بنا پر حاصل تھی کہ آدم جانتا تھا اور فرشتے نہیں جانتے تھے۔ جاننا بشریت کے احترام کی پہلی شرط ہے اور جو نہیں جانتا وہ انسان نہیں ہے اور مسلمان ایسے بد بخت ہیں کہ انھیں یہ بات سمجھانی پڑتی ہے۔

یہاں تین الفاظ ہمارے سب دوستوں نے استعمال کیے ہیں، واقعہ، خبر اور سچائی۔ واقعہ تو ہوتا ہے، تبدیلی یا کردار کے حوالے سے، لیکن خبر اور سچائی میں ضروری نہیں ہے کہ فرق نہ رہے۔ سچائی اپنی جگہ پر ہے اور خبر بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات سچائی کو چھپانے کے لیے ہوتی ہے۔

ہر صحافی کا پہلا ایمان یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی خبر کو سچائی کے برابر کر دے۔ اس کی مثالیں میں آپ کو دے سکتا ہوں۔ جب دوسری جنگ عظیم کے شروع میں ڈنکر کا واقعہ ہوا تو جرمنوں نے کہا کہ برطانوی فوج بھاگ گئی اور چرچل نے کہا کہ برطانوی فوج بہتر جگہ پر صف آرائی کرنے کے لیے پیچھے ہٹ گئی ہے اس پر جوش ملیح آبادی نے کہا کہ یہ عجیب جنگ ہے کہ قدم جرمن کا بڑھتا ہے فتح برٹش کی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہی ہوتا ہے، انڈین کہتے ہیں کہ انھوں نے کارگل سے آپ کو بھگا دیا، آپ کہتے ہیں کہ ہم پیچھے ہٹ گئے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے جو موضوع دیا گیا ہے، وہ ایک ہے عالمی تناظر میں جاننے کا حق اور دوسرا غربت کا خاتمہ اور جاننے کا حق۔ ان دونوں موضوعات پر جو مقالات پڑھے گئے ہیں میرا یہ استحقاق ہے کہ میں اس پر اپنی رائے کا اظہار کروں۔

عالمی تناظر میں خبر کا مقصد کیا ہے؟ خبر کا مقصد سچائی بیان کرنا نہیں ہے بلکہ خبر کا مقصد ایک خاص قسم کی رائے قائم کرنے میں ایک واقعہ کی مدد لینا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ یہ کیسے کرتے ہیں؟ عراق میں جو جنگ ہوتی ہے تو اخبار نویس کو فوج کے ساتھ جوڑ (embed) دیتے ہیں۔ تو اس طرح صحافت میں ایک نیا لفظ آ گیا پکا جڑا ہوا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صحافی (embeded journalist) اور آپ کے پاس سچائی صرف اس embeded journalist کے ذریعے سے ہی آتی ہے۔ ہمارے ہاں وزیرستان سے بھی خبر embeded journalist کے ذریعے سے آتی ہے۔ جو embeded نہیں ہے اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو حیات اللہ خان کا ہوا۔

رائے قائم کرنے کے لیے سچائی کو موڑا جاتا ہے تو ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ وہ اس لیے ہے کہ ایک عالمی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے دنیا پر یہ ثابت کیا جائے کہ یہ سب سے اچھا نظام ہے، یہ انصاف پرور نظام ہے، یہ انسان دوست نظام ہے تاکہ ہم اس کے خلاف سوچنے کی جرأت نہ کریں۔ اس کی میں چھوٹی سی مثال آپ کو دے سکتا ہوں۔ جب میں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا، اس زمانے میں الجیریا کی جنگ آزادی جاری تھی۔ ہمارے سب دوستوں کو معلوم ہے کہ جو کریڈ پر خبر آتی تھی وہ اس طرح ہوتی تھی Algerian muslim terrorists have done this. اب ان تین الفاظ نے سچائی کو بالکل ڈھانپ دیا ہے۔ پہلے تو آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ بدمعاش الجیرین ہیں دوسری بات یہ کہی کہ یہ مسلمان ہیں، پھر آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ دہشت گرد ہیں یعنی الجیرین مسلمان دہشت گرد کہہ کر آپ نے اس سچائی کو چھپانے کی کوشش کی کہ ایک کالونی کے لوگ اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

یہی ہم اور آپ اپنے ملک میں کرتے ہیں، روز کرتے ہیں، آپ دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے کہ لیاری سے ایک دہشت گرد پکڑا گیا۔ اب واقعہ اتنا ہے کہ ایک آدمی کو پولیس نے پکڑا۔ اب سچائی کیا ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے، خبر کیا ہے کہ دہشت گرد ہے، وہ دہشت گرد ہے یا نہیں یہ سچائی کا معاملہ ہے۔ اسے ایک پولیس کانسٹیبل نے مفت چائے نہ پلانے پر دہشت گرد قرار دے دیا ہے یا واقعی اس کے پاس کچھ اسلحہ تھا۔ تو ہم روزانہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ سچائی کو اس طرح سے پیش کیا جائے کہ اس سے کوئی خاص رائے قائم نہ ہو سکے۔

عالمی تناظر سے مثال

اب عالمی تناظر میں جو گھپلا کیا جاتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ پچھلے سال اقوام متحدہ کے تین خصوصی رپورٹروں نے یہ کہا کہ ہم گوانتا ناموبے میں جا کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہاں آپ نے قیدی کیسے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ جاننے کے بنیادی حق کا مسئلہ ہے۔ پہلے تو امریکہ نے کہا کہ آپ اس بارے میں سوچیے ہی نہیں۔ یہ تین رپورٹر کون تھے، ایک وہ رپورٹر تھے جو دنیا بھر میں تشدد و اذیت کے معاملات کی تحقیقات کرتے ہیں اور رپورٹ دیتے ہیں، دوسرے رپورٹر دنیا بھر میں غیر قانونی حراست کے بارے میں رپورٹ دیتے ہیں، تیسرے رپورٹر پاکستان کے شہری اور نمائندہ تھے وہ عقیدے کی آزادی کے بارے میں رپورٹ دیتے تھے، کیونکہ یہ شکایت بھی تھی کہ گوانتا ناموبے میں جو قیدی ہیں ان کو ان کے عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کا حق نہیں دیا جا رہا۔ یہ بالکل سیدھی سی بات ہے کہ وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمان ہیں اوران کونماز پڑھنے کی آزادی نہیں دی جا رہی، ان کی عقیدے کی آزادی کا حق تلف کیا جا رہا ہے۔

امریکہ نے کہا کہ ہم ان کو نہیں آنے دیں گے پھر اس کے بعد کہا گیا کہ آ جائیں۔ جب رپورٹر چلے گئے، تو ان سے کہا گیا کہ آپ آتو گئے ہیں لیکن قیدیوں سے نہیں مل سکتے آپ ہم سے بات کر لیں، اس پر رپورٹروں نے کہا کہ ٹھیک ہے اگر قیدیوں سے نہیں مل سکتے تو ہم اپنی رپورٹ ویسے ہی دے دیں گے ہم آپ سے بھی بات نہیں کرتے۔ یہ واقعہ میں نے اس لیے سنایا کہ لوگوں کو جاننے کے حق سے محروم رکھنے کے لیے جو عالمی سطح پر کوششیں کی جاتی ہیں وہ بڑی طاقتیں کرتی ہیں اور ان کے جو پٹھو ہیں وہ ان کے ساتھ ہی لگے ہوئے ہیں جس میں ہم بھی خشوع و خضوع سے شیروانی پہن کر شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ عالمی جنگ دراصل سچائی اور جھوٹ میں، حق اور باطل میں شروع ہی سے جاری ہے۔ اس کا بہت سا حصہ ان باتوں پر منحصر ہے کہ ہم لوگوں کو حقیقت کا علم نہ ہونے دیں۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ ہمارا جو کام اور عقیدہ ہے وہ یہی تھا کہ ہم اپنی خبر کو جس حد تک ہو سکے سچائی کے قریب لے جائیں گے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ قانون انصاف نہیں ہوتا۔ یعنی قانون اور انصاف میں کوئی تعلق لازمی نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سے قوانین ایسے ہیں جو ناانصافیوں کو فروغ دیتے ہیں لیکن قانون بنانے کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ وہ جس حد تک ممکن ہو انصاف کے قریب ہو جائے۔ اسی طریقے سے اخبار نویسی میں کم از کم ہم نے یہی پڑھا اور دیکھا تھا۔

کرپٹ نظام

اس سے پہلے کہ میں غربت کے موضوع پر آؤں، یہاں کرپشن کا بہت ذکر ہوا ہے، کرپشن تو واقعتاً بہت ہے، لیکن میں آپ سے یہ عرض کروں گا اور آپ کو اس بارے میں سوچنے کی دعوت دوں گا کہ انفرادی کرپشن زیادہ اہم ہے یا نظام کی کرپشن زیادہ اہم ہے۔ ہمارے ملک میں یہ دستور بن گیا ہے کہ انفرادی کرپشن کو اچھالا جاتا ہے اور نظام کی کرپشن کو چھپایا جاتا ہے۔ اس کی مثال میں اس طرح دینا چاہوں گا کہ لوگ انگریزوں کا زمانہ بہت یاد کرتے ہیں بڑا اچھا زمانہ تھا، بڑا انصاف تھا، بڑی دیانت داری تھی، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ آپ غلام تھے یعنی یہ ایسا نظام تھا جو غلامی کی بنیاد پر استوار کیا گیا تھا اور جو آپ کے تمام حقوق کو سلب کرتا تھا، وہ اس کو بھول جاتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ مجسٹریٹ دو مسلمانوں اور دو ہندوؤں میں انصاف کیسے کرتا ہے۔

اس وقت جو ہمارا مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے ایک ایسا کرپٹ نظام اپنے ملک میں رائج کر دیا ہے جس میں ایمان دار ہونا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے، یہ اخبار نویس بھی اس میں شامل ہیں اس میں کرپشن کا پیمانہ بڑھ گیا ہے پہلے ہم سنا کرتے تھے کہ مکان دیتے ہیں آج کل یہ سنتے ہیں کہ کار دیتے ہیں پھر یہ سنا کہ گاڑی کا پٹرول بھی دیتے ہیں۔ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ کرپشن کی یہ بات شروع ہوتی ہے اس نظام سے جس میں ہم سب زندہ ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غربت کیسے کم کی جائے

دوسرا جو موضوع ہے وہ بہت دلچسپ ہے اور مجھے پسند بھی بہت ہے کہ غربت کیسے کم کی جائے؟ ہماری نجات کی تو بات ہی نہیں کرتے۔ ہمارے ملک میں غربت مٹانے کی بات نہیں ہوتی، غربت کم کرنے کی بات ہوتی ہے جس کو میں نہیں مانتا یہ ایک بیہودہ بات ہے۔ غربت کم کرنے کے کیا معنی ہیں اور اس میں مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ یہ آ گیا کہ اس سال (آپ میری گفتگو معاف کیجیے گا) حکومت نے دعویٰ کیا کہ پاکستان میں غربت ساڑھے نو فیصد کم ہو گئی ہے۔ انڈیپینڈنٹ اکانومسٹ نے کہا کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا بلکہ دنیا کی تاریخ میں یہ نہیں ہوا کہ دو سال میں غربت ساڑھے نو فیصد کم ہو جائے۔ اگر آپ انقلاب لے آئیں، روس کا انقلاب لے آئیں، چین کا انقلاب لے آئیں تب بھی دو سال میں اتنی غربت کم نہیں ہو سکتی۔ آپ نے کیسے کر دی؟ اور آپ کی زراعت میں اتنی ترقی نہیں ہوئی، آپ کی مینوفیکچرنگ میں اتنی ترقی نہیں ہوئی، آپ ملک میں سروسز سیکٹر جو سب سے بڑا اور سب سے زیادہ ہے، جو جی ڈی پی میں گروتھ دکھاتا ہے اس میں ترقی نہیں ہوئی یہ غربت میں کمی کہاں سے ہو گئی؟

انھوں نے کہا کہ انفارمل سیکٹر میں بڑی ترقی ہوئی ہے اب انفارمل سیکٹر میں معلوم کرنے کا کسی کے پاس ذریعہ نہیں ہے۔ آپ مجھے بتا دیجیے کہ کراچی میں چھابڑی فروشوں کی آمدنی کس طرح بڑھ گئی ہے، کسی نے گنے ہیں؟ کسی نے معلوم کیا ہے کہ خضدار میں کتنے چھابڑی فروش ہیں؟ کسی نے معلوم کیا ہے کہ سکھر میں کتنی پان کی دکانیں ہیں؟ انفارمل سیکٹر تو کسی کو پتا ہی نہیں ہے تو پھر انڈیپینڈنٹ اکانومسٹ نے کہا کہ صاحب آپ نے جس ہاؤس ہولڈ انکم سروے کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ غربت کی شرح میں اتنی کمی ہو گئی ہے، اس کی فائنڈنگز ہمیں دے دیں، یعنی یہ جاننے کا بنیادی حق ہے کہ آپ نے کونسا فارمولا لگایا ہے جس کی بنیاد پر غربت کم ہو گئی ہے۔

غربت کی تعریف

بنیادی سوال یہ ہے کہ غریب کون ہے جیسا ابھی اویس صاحب نے کہا جب ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے ہاں تعلیم کی شرح نیچے گر رہی ہے پہلے دو تین سال تو ہم نے یہ کہا کہ صاحب کیونکہ آبادی بڑھ گئی ہے اس لیے تعلیم یافتہ افراد کم ہو گئے ہیں پھر لوگوں نے کہا کہ آبادی تو پہلے بھی بڑھتی رہتی تھی تو پہلے کیسے تعلیمی معیار بڑھتا تھا؟ تو پھر ہم نے کہا کہ اچھا ایسا کرتے ہیں کہ تعلیم یافتہ کی تعریف بدل دیتے ہیں، پہلے تعلیم یافتہ ہونے کی تعریف یہ تھی کہ وہ پڑھ لکھ سکتا ہے، خط پڑھ سکتا ہے، خط لکھ سکتا ہے، ہم نے کہا کہ یہ تو بہت مشکل کام ہے، ہمارے تعلیم یافتہ کی تعریف یہ تھی کہ وہ دستخط کرنا جانتا ہے یا نہیں، یہی ہم نے غربت کے حوالے سے کیا کہ غربت کی تعریف میں ہم رد و بدل کر دیتے ہیں اور اگر غربت کی جامع تعریف کی جائے تو پاکستان میں 99 فیصد لوگ غریب ہیں کیونکہ آمدنی کی غربت ہے، حقوق کی غربت بھی ہے اور ایک اختیارات کی غربت بھی ہے میں کیونکہ انسانی حقوق کے لیے کام کرتا ہوں، میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سمجھتا ہوں کہ اگر ساری کی ساری آبادی اپنے انسانی حقوق سے محروم ہے تو ساری آبادی غریب ہے، ہمارا ملک بچوں کی اکثریت کا ملک ہے اگر بچے کی تعریف اٹھارہ سال کی جا رہی ہے تو اٹھارہ سال سے کم عمروں کی آبادی اٹھاون فیصد ہے اور اگر ان کے حقوق آپ نہیں دے رہے ہیں تو ملک کی اکثریت کے حقوق آپ نہیں دے رہے۔

اسی طریقے سے دوسرا سوال یہ ہے کہ پلاننگ ڈویژن نے پچھلے سال تحقیق کی تھی جس سے ثابت ہوا تھا کہ دس سال میں پاکستان میں غربت کی شرح میں سو فیصد اضافہ ہو گیا۔ دس سال پہلے سترہ فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے تھی اور دس سال کے بعد 34 فیصد پھر 35 فیصد اور ایک اندازے کے مطابق 38 فیصد آبادی غربت کی شرح سے نیچے ہو گئی پھر اس میں یہ بھی ہے کہ یہ تقسیم مستقل نہیں ہے کیونکہ بہت بڑی تعداد میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو غربت کی لکیر پہ ناچتے کودتے رہتے ہیں، کبھی نیچے ہیں کبھی اوپر ہیں تو کبھی اوپر ہیں کبھی نیچے ہیں۔ ہم سب لوگ روز دیکھتے ہیں ایک چھوٹے سے خاندان میں ایک آدمی بیمار ہو جائے تو وہ غربت کی لکیر کے اوپر سے نیچے آ جاتا ہے، ایک بچے کی نوکری چلی جائے تو وہ خاندان لکیر کے اوپر سے نیچے آ جاتا ہے اور جب تک اسے دوبارہ نوکری نہ ملے وہ نیچے ہی رہتا ہے تو اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے اور سوچنے کے لیے ہمیں بتانا پڑے گا کہ یہ کیا ہے؟ لیکن ہم بتائیں گے نہیں کیونکہ جو بتانے والے ہیں وہ غربت کی لکیر سے اوپر رہتے ہیں۔ جس میں اخبار نویس بھی شامل ہیں، ہم سب شامل ہیں۔

کیا کیا جاننے کا حق ہے

میں آپ سے پوچھتا ہوں آپ سب کراچی میں رہتے ہیں، آٹھ نو دن سے ٹرینیں کراچی نہیں آ رہی ہیں کتنے آدمی متاثر ہوئے ہیں ہزارہا آدمی متاثر ہوئے ہیں آپ مجھے وہ اخبار دکھا دیجیے جس میں یہ خبر کرکٹ ٹیسٹ سے زیادہ اہم سمجھی گئی ہو، مجھے وہ اخبار دکھا دیجیے جس میں صدر صاحب نے یا وزیر اعظم صاحب نے کوئی بیان دیا ہو یا اس پر تشویش کا اظہار کیا ہو ایسا کوئی بیان نہیں ملے گا کیونکہ وہ ٹرین میں سفر نہیں کرتے اور اخبار نویس بھی نہیں کرتے ہیں، میں بھی نہیں کرتا ہوں یہ جو غربت کا معاملہ ہے، غربت کے معاملے میں جاننے کا حق، کیوں غریب ہیں؟ محض یہ بتانا تو نہیں ہے کہ 38 فیصد لوگ غریب ہیں بلکہ جاننے کے حق میں یہ بھی شامل ہے کہ شرح خواندگی کیوں کم ہے۔ یہ بتانا کافی نہیں ہے کہ اس ملک میں 44 فیصد شرح خواندگی ہے یا 58 فیصد شرح خواندگی ہے بلکہ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ کیوں کم ہے؟ اور اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ یعنی میرا جاننے کا جو حق ہے، خالی معروضی حقیقت کو جاننا نہیں ہے بلکہ میرا جاننے کا حق جو ہے وہ اس حقیقت سے عہدہ برآہ ہونے کے لیے ضروری ہے یا اس کو بدلنے کے لیے جن ذرائع کی ضرورت ہے وہ بھی معلوم ہونا میرا حق ہے۔ جو ابلاغ کے شعبے میں کام کرتے ہیں میں ان کے سامنے خاص طور پر اس وقت یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ خواہ عالمی تناظر میں آپ جاننے کے حق کو دیکھ لیجیے یا غربت کے حوالے سے دیکھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیجیے، جو سب سے بڑی رکاوٹ اس حق کے استعمال میں حائل ہے وہ قومی یا بین الاقوامی سلامتی کا تصور ہے۔

مجھے عالمی سطح پر سچ بولنے سے روکا جاتا ہے کیونکہ اس سے عالمی نظام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ملکی سطح پر مجھے سچ بولنے سے روکا جاتا ہے کہ آپ سچ نہ بولیے کیونکہ قومی سلامتی کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جسے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سمجھ لیں۔

جاننے کے حق پر پابندی کس حد تک

کیونکہ آپ سب اچھے طلبہ و طالبات ہیں میں آپ کی خدمت میں یہ ایک دستاویز پیش کرنا چاہتا ہوں، اسے جوہانسبرگ پرنسپلز کہتے ہیں، میری آپ سے درخواست ہوگی کہ آپ اس کا اردو میں ترجمہ کر کے آپس میں تقسیم کریں، اس پر غور کریں، اس میں ساری یہ بات کہی گئی ہے کہ قومی سلامتی کے نام پر جاننے کے حق پر پابندی کس طرح اور کس حد تک لگائی جا سکتی ہے اور اس کی میں وضاحت کر دیتا ہوں کہ ہمارے ملک میں تمام حقوق Subject to Law ہیں، آپ بنیادی حقوق کا چیپٹر لیں، but what is law? یعنی قانون کے نام پر کیا آپ کو اختیار ہے کہ آپ جو پابندی چاہیں مجھ پر لگا دیں تو اس لیے ضروری ہو گیا کہ ہم یہ دیکھیں کہ قانون کسے کہتے ہیں؟

ایک زمانہ تھا جب قانون کی تعریف اس طرح ہوتی تھی کہ حکمران کا ہر وہ حکم جس کو وہ اپنی طاقت کے بل پر منوا سکے، قانون ہے۔ اب قانون کی یہ تعریف نہیں ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ قانون مقننہ بناتی ہے پھر قانون اکثریت بنایا کرتی تھی اور خود آپ کے جیسے لنگڑے لولے ملک میں بھی اب یہ عملی طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ قانون اکثریت نہیں بناتی بلکہ اس میں اپوزیشن کا بھی کردار ہوتا ہے اور اسٹینڈنگ کمیٹی اور دیگر کمیٹیوں کا بھی تصور تو ہے لیکن ہم عمل نہیں کرتے۔ عالمی سطح پر اور انسانی حقوق کے حوالے سے اب قانون کا تصور یہی ہے اخبار نویسوں کے لیے قانون کا جو تصور ہے وہ یہ ہے کہ قانون کسی کم قابل و اہل اتھارٹی نے بنایا ہو، وہ ہمیشہ پارلیمنٹ ہوتی ہے اور کوئی نہیں ہوتا، باقی جو قانون ہیں وہ ناقص ہیں اور ناقص ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ ہر شخص کو قانون تک رسائی ہو اور تیسری بات یہ کہ وہ قانون مفاد عامہ میں ہو، میرے آپ کے زید بکر کے مفاد میں نہ ہو اور پھر آگے یہ کہ اس کا نفاذ سب پر یکساں ہو اور آخری بات یہ کہ اس قانون میں اس کے غلط استعمال کے خلاف بھی شق موجود ہو، اس کا مداوا بھی ہو، یہ قانون کی صفات ہیں۔

قومی سلامتی کی تعریف

قومی سلامتی کی تعریف کیا ہے؟ پھر اس کے استعمال کے بارے میں آپ یہ ثابت کریں کہ اس سے واقعی خطرہ ہے۔ مظہر عباس نے جو خبر لکھی ہے، اس سے واقعی قومی سلامتی کو خطرہ ہے یہ ثابت کریں۔ پچھلے سال لاہور میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ لوگ اپنے کسی رہنما کا استقبال کرنے چلے گئے تھے تو حکومت نے پکڑ کر دہشت گردی کا دعویٰ کر دیا اور کہا کہ قومی سلامتی کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ ہائی کورٹ نے کہا حکومت کے خلاف نعرے لگانے سے قومی سلامتی خطرے میں نہیں پڑتی، ان کو آپ رہا کر دیں۔ مطلب یہ کہ آپ قومی سلامتی کے نام پر جب پابندی لگاتے ہیں کہ یہ خبر نہ نکالی جائے، یہ خبر شائع نہ کی جائے، یہ بتایا نہ جائے کہ ہمارے حکمران ننگے ہیں یا کانے ہیں، اس سے قومی سلامتی کو نقصان پہنچتا ہے، یہ آپ ثابت کریں اور یہ معاملہ عدالت میں جانا چاہیے۔

میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ اس کو دیکھیں کہ قومی سلامتی کے نام پر جو پابندیاں لگائی جاتی ہیں اس کے بارے میں ہمارے اصول کیا کہتے ہیں؟ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ کیسے ہوگا اور کون کرے گا؟ یہ ہم سب مل کر کریں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ صاحب یہ فیصلہ کیسے ہو کہ اچھا اخبار نویس کون ہے اور برا اخبار نویس کون ہے؟ بنیادی بات یہ ہے کہ آپ نے اخبار چھاپنا اتنا مشکل اور مہنگا کر دیا ہے جیسے الیکشن لڑنا، کیونکہ آپ غلط نظام چلانا چاہتے ہیں، آپ نے الیکشن کا نظام ایسا بنا دیا ہے کہ کوئی معمولی وسائل کا آدمی الیکشن نہیں لڑ سکتا۔ اسی طریقے سے آپ کے اخبارات کے بھی جو ذرائع ہیں، دیکھیں دنیا بھر کے آئین میں پروویژن ہوتی ہے۔

یہ لازم ہے کہ اظہار رائے کی آزادی ہو (There shall be freedom of expression) چونکہ 1973ء کا آئین بننے سے پہلے ملک میں اخبارات کے حوالے سے ایک بڑی بحث جاری تھی تو اس لیے آپ کے آئین میں لکھا گیا کہ ہر شخص کو اظہار کی آزادی ہے اور پریس آزاد ہوگا (Everbody have right to freedom of expression there shall be freedom of the press.) یہ شامل کر دیا گیا کیونکہ ان دنوں اس کا بڑا ہنگامہ تھا۔ اب آپ الیکٹرانک میڈیا کو دیکھیں۔ حکومت کہہ سکتی ہے کہ جناب اس میں الیکٹرانک میڈیا کا ذکر نہیں ہے ۔ اظہار کی آزادی Freedom of expression ہے اور پریس کی آزادی Freedom of press ہے۔ چونکہ الیکٹرانک میڈیا کا ذکر نہیں ہے، اس لیے ہم نے پیمرا بنا دیا، پاکستان الیکٹرانک میڈیا اور ریگولیٹری اتھارٹی، یہ تو بالکل واہیات بات ہے یعنی بالکل بنیادی حق (آزادی اظہار Freedom of expression) کے منافی بات ہے۔ یہ جو دنیا میں آگے چلنے کی بات ہے، اس میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ایک اچھی بات شروع ہی میں کہی گئی تھی کہ اظہار کی آزادی Freedom of expression صرف اخبار نویسوں کا مسئلہ نہیں ہے۔

یہ محض پریس اور الیکٹرانک میڈیا کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ دراصل پاکستان کے ہر شہری کا مسئلہ ہے، آزادی اظہار پاکستان کے ہر شہری کا حق ہے اور اس میں پریس، ٹی وی اور دوسرے ادارے بھی شامل ہیں۔ اس میں یہ ضروری ہے کہ اس حق کے استعمال کے لیے جو باتیں لازمی ہیں وہ قرار دی جائیں۔ اس کو ہم اس طرح بیان کرتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں کہ جب آپ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے تو زندہ رہنے کے لوازم کو بھی اس کا حق مانا جائے، خالی یہ کہہ دینے سے کہ آپ کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے بات نہیں بنتی ہے، جب تک کہ آپ اس کو خوراک، لباس، سر چھپانے کی جگہ اور روزگار کا حق نہ دیں۔ اسی طریقے سے آپ آزادی اظہار کا حق نہیں دے سکتے جب تک کہ آپ اپنے ملک میں یہ بندوبست نہ کریں کہ ہر شخص کو لکھنے کی آزادی ہو۔

(بشکریہ: ماہنامہ 'جہد حق' جولائی 2008)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الیکٹرانک میڈیا میں غیر تربیت یافتہ عملہ کی بھرمار اور اس کے اثرات

(ڈاکٹر مہدی حسن)

اسلام آباد میں گزشتہ چھ ماہ سے جاری جنگ پسند مہم بہت سے جانی نقصان اور حکومت اور جامعہ حفصہ اور لال مسجد جس کو لال قلعہ کہنا زیادہ مناسب ہے، کے مکینوں کی بدنامی کے بعد اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی۔ یہ المیہ جس کی ابتدا ملک میں ایک ہفتے سے زائد عوام کو شدید ذہنی اور بہت سے لوگوں کو جسمانی تکلیف میں مبتلا رکھنے کے بعد بہت سے سوالات پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ ان سوالات میں سے کئی کے جواب تو وقت کے ساتھ خود ہی منظر عام پر آ جائیں گے مگر کچھ سوالوں کے جواب پاکستانی روایات کے مطابق شاید عوام کو کبھی نہیں مل سکیں گے۔ اسلام آباد کے مرکز میں رونما ہونے والے اس المیے کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بہت سے سبق بھی موجود ہیں بشرطیکہ ہم ان سے کچھ سیکھنا چاہیں۔ لال مسجد اور اس کے اردگرد ایک ہفتے تک جاری رہنے والی ''جنگ'' کے دوران پاکستان کے نوزائیدہ پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینلز میں سے چند بڑے اداروں کے لیے یہ واقعہ زلزلے کی تباہی اور عدالتی بحران کے دوران چیف جسٹس کے مختلف شہروں کے دوروں اور کراچی کے سانحہ کے بعد ایک اور ایسا واقعہ تھا جس کی براہ راست رپورٹنگ کے دوران ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش میں صحافت کے بہت سے اصول اور اخلاقیات نظر انداز کر دیے گئے۔ دراصل گزشتہ چند برسوں میں ملک میں پرائیویٹ چینلز خودرو گھاس کی طرح نمودار ہو گئے ہیں اور وزارت اطلاعات فخریہ یہ اعلانات کرتی رہتی ہے کہ اس وقت ملک میں پچاس کے قریب چینلز شروع ہو چکے ہیں اور بہت سے مزید شروع ہونے والے ہیں۔ اتنے ٹی وی چینلز کے لیے جتنے تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ سٹاف کی ضرورت ہے وہ ملک میں دستیاب نہیں ہے اور نہ ہی ایسے معیاری ادارے موجود ہیں جن کے پاس جدید ترین سہولتیں ہوں اور ایسے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ افراد ہوں جو اس جدید ترین ذریعہ ابلاغ کی تکنیکی اور معاشرتی اثرات کی سائنس کی تعلیم دے سکیں۔ نوزائیدہ ٹی وی چینلز کا بیشتر سٹاف نیوز رپورٹنگ کی خاص طور پر براہ راست رپورٹنگ کی تربیت سے محروم ہے۔ وہ دو چار چینلز جو براہ راست براڈ کاسٹنگ کے لیے ایک دوسرے سے مقابلہ بھی کرتے ہیں، لال مسجد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مسلح تصادم اور چیف جسٹس کے جلوسوں کی رپورٹنگ کرتے وقت جس طرح جذباتی ہو جاتے ہیں اس سے دیکھنے اور سننے والوں کو یہ تاثر ملتا ہے کہ رپورٹر ایک غیر جانبدار پیغامبر نہیں ہے بلکہ خود ایک پارٹی ہے۔ مثال کے طور پر اسلام آباد میں چیف جسٹس کے پہلے جلوس کے موقع پر ایک چینل کے رپورٹر نے جلوس کی رپورٹنگ کرتے وقت بہت جذباتی انداز میں یہ اعلان بھی کیا کہ اب یہ تحریک روکنی ممکن نہیں ہے اور یہ تمام ملک میں پھیل جائے گی۔ یہ رائے اگر کوئی مبصر یا تجزیہ کار دے تو بات سمجھ میں آتی ہے، رپورٹر کی طرف سے اس رائے کا اظہار صحافت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے۔ اس قسم کا اظہار رائے چیف جسٹس کے اسلام آباد سے لاہور تک کے جلوس میں بار بار دیکھنے میں آیا۔ لال مسجد کے مسلح تصادم کے دوران آٹھ دن اور رات اپنے ناظرین کو کوئی ٹھوس اطلاع دیے بغیر ان تمام چینلز کے رپورٹر جو اس محاصرے اور تصادم کو براہ راست رپورٹ کر رہے تھے اپنے کانوں پر موبائل لگائے محض اپنے اندازوں کو یا بعض مفروضوں کو خبروں کے طور پر پیش کرتے رہے۔ ان کا ہر مفروضہ اور ہر اندازہ ''بریکنگ نیوز'' کے طور پر سارے دن اور ساری رات سکرین پر دہرائے جاتا رہا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان رپورٹر حضرات کو ''بریکنگ نیوز'' اور ''اپ ڈیٹ'' کی اصطلاحوں کا صحیح مطلب بھی معلوم نہیں ہے۔ تقریباً ہر رپورٹر نے ''اپنے ذرائع'' کا بہت فراخدلی سے استعمال کرتے ہوئے لال مسجد اور مدرسہ حفصہ کے اندر محصورین کی مہیا کی ہوئی آرا کو تصدیق کے بغیر خبر کے طور پر پیش کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ (میڈیا جو کافی عرصے سے حکومت پر یہ تنقید کر رہا تھا کہ لال مسجد کے مسلح رہائشیوں کی کھلے عام غیر قانونی سرگرمیوں کے خلاف اقدامات کیوں نہیں کیے جاتے حکومتی اقدامات شروع ہونے کے صرف پانچ دن بعد بھی غازی برادران کو ہیرو اور ان کی لٹھ بردار جہاد کے نعرے بلند کرتی خواتین اور گیس ماسک منہ پر چڑھائے ہاتھوں میں ہتھیار اٹھائے سڑکوں پر دھاندلی سے مسجد کے سائے میں سرکاری املاک کو نذر آتش کرتے مسجد کی چھت پر مورچے بنا کر بیٹھے ہیں۔ وہ تشدد پسند افراد ''مظلوم'' سمجھے جانے لگے) ٹی وی چینلز کے بعض سینئر کمپیئرز نے جن کا ٹیلی ویژن پر نیوز اور دیگر پروگرام کا تجربہ پاکستان میں پرائیویٹ چینلز کی عمر کے ہی برابر ہے اپنے طور پر صلح کرانے کا کام بھی سنبھال لیا اور اپنے طور پر اعلانات بھی نشر کر دیے کہ غازی برادران صلح کے لیے تیار ہیں۔ اب حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان کی ''سیف پیج'' کی شرط تسلیم کر کے انہیں پرامن طریقے سے اپنی مرضی کی جگہ جانے دیں۔ یہ کمال ہمارے ٹی وی رپورٹر اور فوٹو گرافروں کا ہے جنہوں نے جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے مسلح مکینوں کو جنہوں نے آٹھ روز تک تربیت یافتہ پیشہ ور فوج کا بھرپور مقابلہ کیا اور اس مقابلے کے دوران ٹی وی رپورٹر یہ اعلانات بھی کرتے رہے کہ فوج کے جوان جامعہ حفصہ کے پیچھے موجود خشک برساتی نالے کی طرف سے جا کر مدرسہ کی دیوار توڑنا چاہ رہے ہیں ان رپورٹروں کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ دہشت گرد اندر ٹیلی ویژن بھی دیکھ رہے تھے۔ ان نیوز رپورٹروں کو یہ احساس بالکل نہیں ہو سکا کہ ان کے بیانات پورے ملک میں مذہبی انتہا پسندوں کو تشدد پر اکسانے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا باعث بن سکتے ہیں۔ ایک چینل کے کمپیئر نے تو یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ ”یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ عبدالرشید غازی حق پر تھے یا انتظامیہ جس نے ان کے خلاف مسلح کارروائی کی۔ اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی کہ حق پر کون تھا“۔ ان رپورٹر حضرات نے فوجی کارروائی شروع ہونے کے دو گھنٹے بعد اس بات کا شکوہ شروع کر دیا تھا کہ کارروائی کے دوران ہلاک ہونے والوں کی تعداد نہیں بتائی جا رہی جس کا جواب آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل نے یہ دیا تھا کہ فوجی سپاہی کارروائی کے دوران ہلاک شدگان کی گنتی نہیں کرتا بلکہ یہ گنتی ایکشن ختم ہونے کے بعد کی جاتی ہے۔ جس عمارت کے اندر اور باہر سے آٹھ دن تک مسلسل فائرنگ ہوتی رہی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا ”مسجد کی دیواریں گولیوں سے چھلنی ہو چکی ہیں“ سادہ لوح مسلمانوں کو تشدد پر ابھارنے کے لیے بہترین نسخہ ہے۔ اس کے ساتھ اس قسم کی غیر مصدقہ ”بریکنگ نیوز“ کہ انتظامیہ نے ایک ہزار کفن منگوا لیے اور تین سو چادریں ہلاک شدگان کے جسموں کے ٹکڑے جمع کرنے کے لیے منگوائی گئیں۔ یہ غیر ذمہ دارانہ رپورٹنگ کی بہترین مثال ہے۔ دراصل تربیت کی کمی کی وجہ سے رپورٹنگ اور نیوز کمپیئرنگ کرنے والے صحافت میں ”گیٹ کیپر“ کے فرائض سے ناواقف ہیں۔ اخبار، ٹی وی اور ریڈیو کا رپورٹر، نیوز ایڈیٹر اور پروڈیوسر ”گیٹ کیپر“ کا فرض ادا کرتے ہوئے ایسی تمام اطلاعات کو روک لیتا ہے جس سے معاشرے میں بدامنی، فساد اور بے چینی کا خدشہ ہو بیشک ایسی اطلاع درست اور مصدقہ ہی کیوں نہ ہو۔ پاکستان کے اخبارات اکثر اس قسم کی خبریں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں جن میں کہا جاتا ہے ”ایک مسیحی نوجوانوں نے قرآن کی بے حرمتی کر دی“ خبر کے متن میں کہا جاتا ہے کہ مسیحی نوجوان پر یہ الزام اس کے کسی ہمسائے نے عائد کیا ہے۔ لال مسجد کے مسلح تصادم کے دوران ٹی وی چینلز کے رپورٹروں اور کمپیئروں نے نہ صرف گیٹ کیپر کا فرض ادا نہیں کیا بلکہ ناظرین کی معلومات میں کوئی اضافہ کیے بغیر ان کی پریشانی میں اضافہ کیا اور اس المیے کو بھی کارکنوں نے اپنی پبلسٹی کے لیے بھی استعمال کیا اور ایک دوسرے کے ”انٹرویو“ لے کر یہ بتاتے رہے کہ کس طرح اپنی جان خطرے میں ڈال کر وہ یہ فرائض پورے کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے ٹی وی چینلز اپنے رپورٹروں کے لیے غیر معمولی حالات میں رپورٹنگ کرنے کی تربیت کا انتظام کریں۔

(بشکریہ: روزنامہ ”وقت“ 16 جولائی 2007)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نوزائیدہ نجی ٹی وی چینلز کی مقابلہ بازی اور لاشعوری طور پر انتہا پسندی کا فروغ

(ڈاکٹر مہدی حسن)

پاکستان گزشتہ سات سال سے دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ جہاں تک شدت پسندی اور عدم برداشت کا سوال ہے تو یہ رویہ پاکستانی قوم کو اکتیس سال پہلے ملک پر قابض ہونے والے فوجی آمر نے تحفے میں دیا تھا جس کا خمیازہ قوم آج تک بھگت رہی ہے۔ دہشت گردوں کی کارروائیوں میں انتخابات کے اعلان کے بعد ہی اضافہ ہو گیا تھا اور ان کا نشانہ وہ جماعتیں اور افراد بننا شروع ہو گئے تھے جو دوسری بہت سی جماعتوں اور گروہوں کے مقابلے میں سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کو استعمال نہیں کرتے۔ مذہبی نعرے لگا کر اور ایک مخصوص قسم کی شخصیت اختیار کیے ہوئے افراد اور ان کے لواحقین مذہب کے نام پر ہونے والے تشدد سے محفوظ ہیں۔ جنرل ضیا کا دور حکومت مذہب کے نعرے بازوں کے لیے اقتدار کا سنہری زمانہ تھا، وہ عناصر جنہیں ان کے ہمسائے بھی نہیں پہچانتے تھے، اقتدار کی راہداریوں میں گیارہ سال تک گھومتے پھرتے رہے۔ صحافی اس دور میں آزادی اظہار اور جمہوری حقوق کی جدوجہد میں ہراول دستے کا کردار ادا کر رہے تھے، جیل جا رہے تھے، قلعے کے عقوبت خانوں میں بند تھے، بیروزگار ہو رہے تھے اور کوڑے کھا رہے تھے، چنانچہ مارشل لا کے منصوبہ سازوں نے ان حریت پسند صحافیوں کے اندر بھی غیر معروف اور پیشہ ورانہ لحاظ سے نااہل افراد کا ایک گروہ کھڑا کیا جسے سرکاری دربار میں ''دامے، درمے، سخنے'' ہر طرح سے بھرپور سرپرستی مہیا کی گئی، دربار میں پذیرائی کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کو گالی دینا اقتدار کی راہداریوں میں داخلے کا اجازت نامہ تھا اور اسی گیٹ پاس کے ذریعے اپرنٹس سب ایڈیٹر اور خواہ مخواہ کے ''رپورٹر'' کا لیبل سینے پر سجائے نیم خواندہ افراد ریاست کے ستون قرار پائے اور سرکاری دربار کے مہیا کردہ پیسوں سے بہت سے چیتھڑوں کے ''ایڈیٹر''، چیف ایڈیٹر قرار پائے۔ بڑا اور باثر صحافی ہونے کی سند کے طور پر غیر ملکی ایجنسیوں سے تعلقات اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روابط کو استعمال کرنے کا چلن اسی دور کا تحفہ ہے جو آج تک سکہ رائج الوقت ہے۔ انہوں نے گیارہ سال تک جس شدت پسندی کے فلسفے کو پروان چڑھایا ہے وہ ان کے انتقال کے بعد بھی اسی شدت کے ساتھ قائم و دائم ہے چونکہ ضیاالحق کے نظریات کو چیلنج کرنے والی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی اور اس کی نوجوان لیڈر شپ روایتی اور خاندانی موقع پرستوں کے نرغے میں آ گئی جنھوں نے نظریات کو اہمیت دینے کی بجائے ''کرسی'' بچانے کے لیے اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل ضیا کے بچھائے ہوئے مہرے اپنی اپنی جگہوں پر قائم رہے اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔

پرویز مشرف نے اہل مغرب سے اپنے غیر آئینی اقتدار کو قبولیت دینے کے لیے پاکستان اور امریکہ کے تیار کردہ مذہبی شدت پسندوں کے خلاف افغانستان میں اقوام متحدہ کی منظور کردہ فوجی کارروائی کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کیا تو شدت پسندوں نے جو پاکستانی عوام اور یہاں کے وسائل کو ضیاالحق کے فلسفہ کے مطابق اپنی جاگیرداری اور اپنے فلسفے کو امریکہ کے مہیا کردہ اسلحہ اور تربیت کی بنیاد پر مسلط کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، پہلا ٹارگٹ پاکستان کو بنا لیا۔ پاکستان کے ''ترقی پسند''، رواداری پر یقین رکھنے والی قوم ضیاالحق کے دور اقتدار سے ہی خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بھی مسلسل خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے، بھٹو دور کے صحافتی نظریات کے حامل صحافی قومی مفاد، قوم اور پاکستان کے مستقبل کو نظر انداز کرتے ہوئے آزادی کے نام پر انتہا پسندی کو بھرپور کوریج مہیا کر رہے ہیں۔

اخبارات اور نوزائیدہ نجی ٹی وی چینلز کے بعض رپورٹر تبصرہ نویس اور میزبان اپنے حریفوں کے خلاف پوائنٹ سکور کرنے کے شوق میں نئے انداز سے بیانات اور تبصروں کو اپنے اخبارات کے صفحات اور چینلز کی سکرینوں پر جگہ دیتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر، سن کر اور دیکھ کر یہ تاثر ملتا ہے کہ اخبارات اور ٹیلی ویژن کے ''بڑے'' یا تو اتنے بالغ نظر نہیں کہ انہیں اپنی کوریج کے پاکستانی عوام اور بین الاقوامی برادری پر اثرات کا اندازہ نہیں ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو ''اہل اور تجربہ کار'' صحافی سمجھتے ہیں تو پھر وہ یقیناً جان بوجھ کر شدت پسند عسکری باغیوں کو پروموٹ کر کے پاکستانی عوام کو خوفزدہ اور بے حوصلہ کر رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں لاہور کے علاقہ گڑھی شاہو میں جوس کی چند دکانوں میں بموں کے دھماکے ہوئے جن میں ایک نوجوان ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے۔ ان کی ذمہ داری قبول کرنے والی تنظیم نے یہ اعلان کیا کہ جوس کی ان دکانوں میں ''لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے بیٹھ کر جوس پیتے تھے، جو فحاشی کے مترادف ہے'' اور ان دکانوں کو اسی فحاشی کی سزا دی گئی ہے۔ دھماکوں کے دو روز بعد انگریزی کے ایک اخبار اور اردو کے متعدد اخبارات نے بڑے اہتمام کے ساتھ یہ خبریں شائع کیں کہ جوس کی دکانیں واقعتاً نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے فحاشی کے اڈے تھے اور شام کے اوقات میں یہاں لڑکے اور لڑکیاں ملاقات کرتے تھے۔ چار اور پانچ کالم کی کوریج کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ ان خبروں نے بم دھماکے کرنے والی تنظیم کے مؤقف کو دہرا کر بم دھماکوں کے جواز کو جائز قرار دے دیا۔

ایک بہت اہم سوال یہ ہے کہ ان ''رپورٹوں'' نے یہ ''تحقیقاتی خبر'' کہ جوس کی دکانوں میں کھلے عام فحاشی ہو رہی ہے، بم دھماکوں سے پہلے کیوں شائع نہیں کی۔ ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ کیا لڑکے اور لڑکیوں کا جوس کی دکانوں میں اکٹھے بیٹھ کر جوس پینا فحاشی قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو پھر طالبان جس اسلام کو پاکستان میں رائج کرنے کے لیے مسلح بغاوت کیے ہوئے ہیں اس کے مطابق موٹر سائیکلوں پر عورت مرد کا اکٹھے بیٹھنا بھی فحاشی ہے اور طالبان کے افغانستان کی طرح خواتین مریضوں کا مرد ڈاکٹروں سے علاج کرانا بھی فحاشی قرار پائے گا۔ ان جفادری صحافیوں نے جوس کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں ہونے والی فحاشی کی مذمت کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے شدت پسند عناصر کو مزید دھماکے کرنے کے جواز بھی مہیا کر دیے اور معمول کے مطابق زندگی کی عام سرگرمیوں میں مصروف عوام کو خوفزدہ کرنے کے لیے بھرپور تعاون کیا۔ جب انہوں نے بالواسطہ طور پر یہ تجویز کیا کہ اگلا ہدف ہال روڈ کی سی ڈی اور میوزک فروخت کرنے والی دکانیں یا باغ جناح اور ریس کورس پارک میں سیر و تفریح کرنے والے خواتین و حضرات ہوں گے۔ یہ خبر شائع کرنے والوں کو کیا اس بات کا اندازہ ہے کہ اس سے ہال روڈ کے دکانداروں کے کاروبار اور پارکوں اور باغوں میں سیر کرنے والوں کی نفسیات پر کیا اثر پڑے گا۔ کیا ان جفادری صحافیوں کو یہ علم ہے کہ وہ دہشت گردوں کے حوصلے بلند اور عوام کے حوصلے پست کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ 'وقت' 15 اکتوبر 2008)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندی کے انسداد یا فروغ میں میڈیا کا کردار

(امجد علی شاکر)

دہشت گردی اب تو سیلاب بلا بن گئی ہے۔ یوں سمجھیں کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ ہر طرف الامان الحفیظ کا شور ہے۔ میڈیا صرف زرداری کے بارے میں بتا رہا ہے کہ اس کا ہر فیصلہ غلط اور ہر ادا بد دیانتی پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ دہشت گردی ایک ایسا مظہر ہے جس کی جڑیں تلاش کریں تو جناب امیر المومنین حاجی ضیاالحق کے عہد تک...... پیچھے جانا پڑے گا۔ آں جناب کے دور ہی میں دو محکمے پرائیویٹ ہوئے تھے ایک دفاع اور دوسرا خارجہ امور۔ خارجہ امور اور دفاعی پالیسی پرائیویٹ سیکٹر میں چلے گئے تھے، ابھی تک انہیں تو میانے کی ہر ترکیب ناکام ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ابھی تک بہت سی جماعتیں نہ یہ بات مانتی ہیں کہ خارجہ امور طے کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے اور نہ یہ تسلیم کرتی ہیں کہ دفاع خالصتاً ریاست کا شعبہ ہے۔ اس کے لیے ہماری فوج موجود ہے اور ہم اس پر بہت سا پیسہ اور توانائی خرچ کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں دنیا کی چھٹی بڑی فوج موجود ہے۔ ظاہر ہے ریاست اس پر بہت کچھ خرچ کرتی ہے، مگر اک طرفہ تماشا ہے کہ جماعت اسلامی، لشکر طیبہ اور جیش محمد جیسی تنظیمیں جہاد کے لیے چندہ بھی مانگتی ہیں اور فرزند و زن بھی مانگتی ہیں۔ فرزندانِ قوم ان کے پلان میں شامل ہو کر شہادت سے ہمکنار ہوتے ہیں اور بیوگان سے نکاح ثانی کے لیے جہادی قائدین کی خدمات حاضر ہیں۔ یہ بات تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ جہاد کے لیے جانے والے مجاہد ہی جوان نہیں ہوتے۔ ان کی بیوگان بھی نو عمر ہوتی ہیں۔

جنرل ضیاالحق کے عہد عدل گستر میں پرائیویٹ سیکٹر میں جہاد شروع ہوا تھا اور سرکاری سیکٹر میں فوری انصاف کا ڈول ڈالا گیا۔ ادھر کسی پر شک پڑا کہ یہ اسلامی حکومت کی مخالفت میں سوچتا ہے، ممکن ہے کبھی کوئی ناپسندیدہ عمل بھی کر بیٹھے۔ اسے جرم کے ارتکاب سے پہلے کیفر کردار تک پہنچا دیا جاتا اور یوں ایسا امن اور چین نصیب ہوئے کہ قبرستان کے سناٹے رشک کرنے لگے۔ فیض احمد فیض کا شعر بھی سن لیجیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تیری انجمن سے پہلے
عتاب جرم سخن سے پہلے، سزا خطائے نظر سے پہلے

اس عہد میں ارادہ قتل پر قتل کی سزا دی جاتی تھی۔ عدالت میں یہی ثابت ہوا تھا کہ مرحوم بھٹو نے احمد رضا قصوری کے قتل کا ارادہ کیا اور آں مرحوم کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ احمد رضا ابھی زندہ ہے (ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق) اور اس کا قاتل پھانسی پا چکا ہے۔ یہ کمالات عدل جنرل ضیا کے دور ہی میں ممکن تھے۔ شاعروں کو بس یہ اعتراض تھا کہ لوگ ظلمت کو ضیا کہتے ہیں۔ بہر حال جنرل صاحب کے جرنیلی بندوبست کو اہل نظر ریاستی دہشت گردی کا دور کہتے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو ریاستی دہشت گردی کو برملا دہشت گردی کہتی رہیں اور آخر کار خود دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ جنرل ضیا صاحب کے عہد میں ہمارا میڈیا جہاد اور ریاستی دہشت گردی کی تائید کرتا رہا۔ ریاستی دہشت گردی نے جنرل ضیا کے دنوں میں کتنی ہی جانوں کی قربانی مانگی تھی سو پیش کر دی گئی۔ ان کی پیٹھ پر پڑنے والے کوڑے ان کے علاوہ تھے۔

ریاستی دہشت گردی کو میڈیا کی تائید تو حاصل رہی کہ مارشل لاؤں کی تائید شاید ہمارے میڈیا کا پسندیدہ طور طریقہ رہا ہے۔ جنرل ضیا کا دور اور جہاد کا باب ایک ساتھ بند ہو گئے۔ اس کے باوجود دفاع اور خارجہ امور پرائیویٹ سیکٹر میں رہے۔ جہاد ختم ہوا تو جہادی نیٹ ورک نیا روپ دھار گئے۔ جہاد عالمی قوتوں کی زیر نگرانی اور زیر سرپرستی ہو رہا تھا۔ ان کے سرپرست حضرات نے دستِ شفقت اٹھا لیا تو جہاد بے سر اور پر کا تو نہ ہوا مگر طریق کار بدلا اور خوب بدلا۔ بڑے گروہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہوئے اور وطن کے بیٹے وطن میں اپنے دشمن تلاش کرنے لگے۔ دشمن نہ ملیں تو کیا جہاد منسوخ کر دیں۔ جی نہیں جہاد جاری رہا۔ دشمن نہ ملیں، نہ سہی، دشمن بنانے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ ان دشمنوں کو وطن میں تلاش کر کے فرزندانِ وطن کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچانا ایک نیا طرز جہاد ٹھہرا، جسے دہشت گردی کہا جاتا ہے۔

ان دنوں خودکش حملے ہو رہے ہیں۔ حملہ آور وطن کے وہ نونہال ہیں جنہیں بستے اٹھا کر سکول جانا تھا۔ علم کی روشنی حاصل کرنا تھی۔ زندگی کے خواب دیکھنے تھے۔ محبت کے پھول کھلانے تھے۔ مستقبل سنوارنا تھا۔ انہیں بستے کی جگہ خودکش جیکٹ دے کر بھیج دیا گیا۔ اب ان کے ننھے منے ہاتھ قلم کی بجائے ٹریگر پر تھے۔ ان کے کاندھوں پر کتابوں کا بوجھ نہیں تھا۔ اب یہ انسانی جانوں کا بوجھ اٹھانے نکلے تھے اور موت بانٹتے تھے، ان کی آنکھوں میں خون تھا، خواب نہیں تھے۔ دلوں میں محبت نہیں، غضب موت بانٹتا تھا۔ یہ لوگ ہر جگہ موت بانٹنے کے لیے حاضر ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ لوگ اندھیروں کے سفر سے لوٹ آئیں اور روشنی کے سفر پر نکلیں۔ علم ان کیساتھ ہو اور خوشبو ان کی رہبری کرے۔

ہمارا میڈیا عوامی حکومت کے دور میں دو دھاری تلوار ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ سیاسی حکومتوں کو جس قدر نفرت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے دیکھتے اور حقارت سے یاد کرتے ہیں وہ خود ایک نیا اسلوب حیات ہے۔ یہ لوگ سیاسی حکومت کے عدم جواز پر بحث کرتے ہیں اور اس کے خاتمے کی ڈیڈ لائن دیتے ہیں۔ مقصد یہ کہ یہ حکومتیں کمزور ہوں۔ ان کے مقابلے میں دہشت گرد کھل کھیلیں اور ان لوگوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا جائے۔ ہمیں دہشت کے ایجنڈے سے ہمدردی نہیں ہے۔ مگر ہمیں یہ بات سمجھنا بہت مشکل ہو رہا ہے کہ اپنے ہی ایجنڈے کے ہاتھوں مقتول ایک دم شہید ہو گئے ہیں۔ انہیں صرف مقتول لکھ دینا ہی کافی تھا۔ انہیں شہید بنانے میں ہمارے میڈیا کا اچھا خاص رول ہے۔ اب یہ بات ہر کسی کو سمجھ تو نہیں آتی کہ کون مقتول شہید ہوتا ہے اور کون حرام موت مرتا ہے۔ یہ شعبہ تو میڈیا کے سپرد ہے۔ پھر یہ فیصلہ بھی میڈیا کر رہا ہے کہ کون قاتل صرف قاتل ہے اور کون قاتل غازی ہے۔ قاتل کو غازی بنا کر پیش کرنے کا کام ہمارا میڈیا جس ذوق وشوق اور جوش وجنوں سے کرتا ہے، یہ اپنی مثال آپ ہے۔

ہمارا میڈیا جہادی لیڈروں کا موقف پیش کرتے ہوئے ان کی بولی بولنے لگتا ہے۔ غیر جانبدارانہ تجزیے کا انداز ہی بدل جاتا ہے۔ ہمارا میڈیا سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین کا تمسخر اڑاتا ہے اور ان کے کردار ایسے مسخروں کے روپ میں پیش کرتا ہے کہ میڈیا خود مسخرا بن جاتا ہے۔ اب بھلا میڈیا کی مجال ہے کہ وہ جس انداز میں زرداری صاحب کو پیش کرتا ہے، اسی انداز میں قاضی حسین احمد یا منور حسن کو پیش کرے۔ جس روپ میں مولانا فضل الرحمٰن دکھاتا ہے، اسی رنگ روپ میں مولانا مسعود اظہر کو پیش کرے۔ صاف واضح ہے کہ میڈیا کا انداز سیاسی کارکنوں اور قائدین سے متعلق اور ہے، جہادی لیڈروں سے متعلق اور ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارا میڈیا مستقلاً دہشت گردی کو مقدس روپ میں پیش کر رہا ہے۔

ہر بالغ نظر شخص جانتا ہے کہ تمام علماء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ جہاد ریاست کی ذمہ داری ہے۔ کسی پرائیویٹ تنظیم کو جہادی کہنا یا اس کے لیڈر کو جہاد کا لیڈر کہنا ہر لحاظ سے غلط اور ناروا ہے۔ اب کون اینکر ہے جو ان لوگوں کو دہشت گرد کہنے کی جرأت کرے گا۔ میڈیا دہشت گردوں کو غازی کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ جب تک غازی ہیں، دہشت گردی کے خلاف لڑنا مشکل سے مشکل تر ہوتا رہے گا۔ جنگ کا پہلا قدم یہ ہے کہ معاشرہ آپ کی حمایت کرے۔ پبلک میں دہشت گرد کا امیج باقی ہو تو اسے ختم کرنا کیونکر ممکن ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ 'نوائے انسان' جون 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فکر کے زاویے

(حفیظ بزدار)

- کیا ہمارا میڈیا اپنے فرائض ذمہ داری سے ادا کر رہا ہے؟
- کیا میڈیا کے نیوز ایڈیٹر اور پروڈیوسر ''گیٹ کیپر'' کی ذمہ داری یوں نبھار ہے ہیں کہ رواداری کا فروغ ہو؟
- کیا سانحہ لال مسجد اور عدلیہ بحالی تحریک کی رپورٹنگ میں بازی لے جانے کی خاطر صحافت کے بہت سے اصول اور اخلاقیات نظر انداز ہوئے؟
- کیا کسی میڈیا رپورٹر اور تبصرہ نگار کو کسی بھی سانحہ کو اپنی خواہش اور سوچ کا رنگ دے کر پیش کرنے کا حق ہے؟
- کیا میڈیا نے بعض بیانات کو سیاق وسباق سے جدا کر کے جنونیوں کو اکسانے کا کام نہیں کیا؟
- کیا سلمان تاثیر اور شہباز بھٹی قتل کے بعد اشتعال انگیز صحافت کو روکنا وقت کی اہم ضرورت نہیں؟
- کیا ہمارے میڈیا نے ایک قاتل کو پھولوں کے ہار پہناتے ہوئے دکھا کر اسلام کے امن وسلامتی کے پیغام کو زک نہیں پہنچائی؟
- کیا فرقہ وارانہ مذہبی بنیاد پر قائم کئے گئے ٹی وی چینلز جناح کے پاکستان کو مستحکم یا انتہا پسندی کو فروغ دیتے ہیں؟
- لاؤڈ سپیکروں سے پھیلائی فرقہ واریت کیا کم تھی جو ان میں مذہبی ٹی وی چینلز کا اضافہ ضروری تھا؟
- کیا یہ چینلز دوسرے فرقوں کے لئے ''امن وآشتی اور محبت'' کا پیغام بھیجیں گے یا اپنے پیروکاروں کے لئے موثر کنٹرول کمانڈ کا مرکز بھی ہوں گے۔
- سوات میں انتہا پسندوں نے لوکل FM ریڈیو سے کنٹرول اینڈ کمانڈ کا کام لیا تھا۔ اس کے نتائج تو قوم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے دیکھ لئے اب دیکھنا ہے کہ فرقہ وارانہ ٹی وی چینلز کیا گل کھلاتے ہیں۔

- کیا یہ بھی معلوم کیا کہ الیکٹرانک میڈیا کا لائسنس نیلام میں بھاری بولی دے کر حاصل کرنے والوں کا ایجنڈا کیا ہے؟
- 7 ستمبر 2008 کو ایک ٹی وی پروگرام میں فتویٰ دیا گیا کہ احمدی واجب القتل ہیں......اور اگلے ہی دن سندھ میں کئی احمدی قتل کر دیئے گئے۔
- ہمارے ٹی وی چینلز کے بعض اینکرز ہر تبدیلی کو اپنے کھاتے میں ڈالتے ہیں چاہے وہ ججوں کی بحالی ہو، مشرف جمہوریت کی اقتدار کا خاتمہ۔ اب تو انہیں بادشاہ گری کا بھی دعویٰ ہے کہ وہ جب چاہیں حکومت بنوا بھی سکتے ہیں اور گروا بھی سکتے ہیں اور جس حکمران کو چاہیں مروا بھی سکتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذرائع ابلاغ میں اخلاقی اقدار کا فروغ اور عملہ کی تربیت وقت کی اہم ضرورت

(زہرہ یوسف)

جب حکومت نے گذشتہ نومبر وکلاء تحریک کے بارے میں ٹی وی رپورٹنگ اور اخبارات میں شائع ہونے والی شہ سرخیوں سے بوکھلا کر ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی اور ذرائع ابلاغ پر پابندیاں عائد کر دیں تو صحافیوں کے احتجاج کو عوام کی زبردست حمایت حاصل ہوئی۔ صحافیوں کا موقف اس وقت بھی درست ثابت ہوا جب انھوں نے پرویز مشرف کی حکومت کی طرف سے یکطرفہ طور پر نافذ کردہ ''ضابطہ اخلاق'' کو مسترد کر دیا۔

تاہم، جب پرائیویٹ الیکٹرونک میڈیا نے تشدد کے تکلیف دہ اور پریشان کن واقعات کو جو پاکستان میں کثرت اور انتہائی سفاکانہ طریقے سے رونما ہو رہے تھے۔ ٹی وی سکرین پر دکھانا شروع کیا تو یہ حقیقت کھلی کہ عوام اور صحافی برادری کی ذرائع ابلاغ کے حوالے سے توضیع وتشریح میں ہم آہنگی کا فقدان تھا۔

میڈیا کوریج کے بعض ناپسندیدہ پہلوؤں پر کی جانے والی تنقید نے پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (PFUJ) کو انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹس کے اشتراک سے ایک مشاورت منعقد کرنے کی ترغیب دی تاکہ رضا کارانہ ضابطہ اخلاق کے دائرہ کار کو زیر بحث لایا جا سکے۔ اس مشاورت کے اختتام پر 26 نقاط پر مشتمل ایک ضابطہ اخلاق مرتب کیا گیا جسے PFUJ نے تبصرے اور تجاویز کے لیے مشتہر کیا ہے۔

یہ ضابطہ اخلاق دیگر عوامل کے علاوہ تشدد کے واقعات کی مفصل کوریج کے حوالے سے عوام کے شدید رد عمل کو زیر بحث لاتا ہے..... خاص طور پر خودکش حملوں کے واقعات جن میں مرنے والے کی حرمت وتوقیر یا ان کے خاندان والوں کے جذبات کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ٹی وی چینلوں پر ایسے واقعات کی تشہیر اتنی ڈراؤنی اور ہولناک بنا دی گئی ہے کہ بعض چینلوں کو اس بات کی پیشگی وارننگ دینا پڑتی ہے کہ بچوں کو ان مناظر کی ٹیلی کاسٹ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے دوران ٹی وی سیٹوں سے دور رکھا جائے۔

مجوزہ ضابطہ اخلاق کے نقطہ 20 کے مطابق

''کوئی بھی صحافی تشدد، جسمانی قطع و برید، انسانی لاشوں یا حملے سے متاثر ہونے والے افراد کے حد اعتدال سے متجاوز مناظر یا تصاویر شائع یا براڈ کاسٹ نہیں کرے گا...... جب تک کہ ایسا کرنا مفاد عامہ میں نہ ہو......''

یہاں حیرانگی کی بات یہ ہے کٹے ہوئے انسانی اعضاء کی تصاویر یا مناظر کی عکاسی ''مفاد عامہ'' میں کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ تو آئین پاکستان کی ان شقوں سے مشابہت رکھتی ہے جو بنیادی آزادیوں کی ضمانت فراہم کرتے وقت ''قومی مفاد'' کی ذیلی شقوں کا اضافہ بھی کر دیتی ہیں۔

ضابطہ اخلاق کی پیش رفت کے تناظر کا ذکر کرتے ہوئے PFUJ کی دستاویز کہتی ہے کہ: ''میڈیا نے 26 نقاط پر مبنی ضابطہ اخلاق اختیار کیا اور پانچ رکنی کمیٹی تشکیل دی...... تا کہ میڈیا کمپلینٹس (شکایات) کمیشن کے لیے ڈرافٹ تیار کیا جا سکے...... کمیٹی میڈیا کے دیگر متاثرہ فریقین کو بھی اعتماد میں لے گی۔ کمیشن میڈیا کے خلاف عوامی شکایات کی تحقیقات کرے گا (مطابق متن)...... میڈیا کمپلینٹس (شکایات) کمیشن کے متعلق ڈرافٹ پیپر (مجوزہ مسودہ) کے منظر عام پر آنے کا ابھی انتظار ہے۔

ذرائع ابلاغ کے لیے رضا کارانہ ضابطہ اخلاق وضع کرنے کی طرف اٹھایا جانے والا پہلا قدم قابل تعریف ہے۔ نفرت کو ہوا دینے کے حوالے سے بعض اوقات میڈیا جو مہلک اور تباہ کن کردار ادا کر سکتا ہے...... لسانی یا نسلی...... اس سلسلے میں متعدد نقاط ضابطہ اخلاق وضع کرنے والوں کی تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔

> ''ایک صحافی اس امر کو یقینی بنانے کی کوشش کرے گا کہ اس کی تحریر یا براڈ کاسٹ میں کوئی ایسا مواد یا تبصرہ موجود نہیں ہے جو امتیازی سلوک کی عکاسی کرتا ہو اور جو نسل، قومی یا لسانی ماخذ، رنگ، عمر، جنس، ازدواجی حیثیت یا جسمانی یا ذہنی معذوری کے معاملات پر مبنی ہو......'' (نقطہ نمبر 16)

تاہم، اس مشق میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ پاکستان کے سیاق و سباق میں یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے دائرہ کار میں ایسے مسائل شامل کیے جائیں جن کا تعلق فرقہ واریت اور مذہبی تعصب سے ہے۔ پاکستان میں رنگ اور نسل حتمی طور پر کوئی ایسی بنیاد فراہم نہیں کرتے جو امتیازی سلوک کا سبب بنے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مشق اسی قسم کے ملتے جلتے کسی دوسرے ضابطہ اخلاق سے اٹھائی گئی ہے۔ جبکہ اس ضابطہ اخلاق کے دیگر نقاط فرقہ وارانہ ہلاکتوں کی رپورٹنگ کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ اس شق میں متعصبانہ تبصروں کے خطرے کا خصوصی طور پر ذکر کیا جائے۔ مذہب پر مبنی نفرت کو بھڑکانے کے حوالے سے میڈیا کی طاقت کا بھرپور اظہار حال ہی میں اس وقت ہوا جب ایک ٹیلی ویژن پر پروگرام نشر ہونے کے بعد سندھ کے مختلف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصوں میں تین احمدیوں کو قتل کر دیا گیا...... واضح طور پر یہ ہلاکتیں ان آراء کے ردعمل کا نتیجہ تھیں جن کا اظہار اس ٹاک شو میں کیا گیا۔ جبکہ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے ان ہلاکتوں اور ان ہلاکتوں پر اکسانے کے لیے متذکرہ پروگرام کی مذمت کی۔ اسے ایسی کینہ پرور نشریات روکنے کے لیے سخت تحفظات کی فراہمی پر بھی غور کرنا چاہیے۔

مجوزہ PFUJ - IFJ ضابطہ اخلاق خواتین کے خلاف کی جانے والی متعصبانہ اور نقصان دہ رپورٹنگ کا ٹھیک طور پر ادراک کرتا ہے۔ خواتین کے حقوق کی وکالت کرنے والی تنظیمیں عرصہ دراز سے یہ مطالبہ کر رہی ہیں کہ خواتین کو اخبارات اور ٹی وی پر جس غلط اور دقیانوسی انداز میں پیش کیا جا رہا ہے اس روایت کو ختم کیا جائے۔ کرائمز رپورٹنگ کا شعبہ اس روایت کی بدترین مثالیں پیش کرتا ہے جن میں صنف عمر، شکل وصورت اور نجی تفصیلات کو مزے لے لے کر بیان کیا جاتا ہے۔ مجوزہ ضابطہ اخلاق کا نمبر 17 کہتا ہے:

> ''پیشہ صحافت سے منسلک ہر کارکن صنفی مساوات کے اصولوں کا احترام کرے گا...... اپنے پیشے وارانہ فرائض کی ادائیگی کے دوران...... چاہے وہ خاتون ہو یا مرد...... اور ساتھی صحافیوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے میں......کوئی بھی صحافی امتیازی سلوک روا رکھنے کا مرتکب نہیں ہوگا اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں خواتین کے حوالے سے رجعت پسندانہ رپورٹنگ اور ان کے استحصال سے اجتناب برتے گا......''

ایک بار پھر، مجوزہ ضابطہ اخلاق، خواتین کے خلاف امتیازی رپورٹنگ کی قطعی طور پر حوصلہ شکنی کرنے کے لیے متاثر اقدامات کی نشاندہی نہیں کرتا۔ اگر چہ اگر اسے دوسرے نقاط کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ خواتین کے حقوق کا احترام کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے اور میڈیا سے ان کے لیے منصفانہ اور مساویانہ سلوک کی بات کرتا ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیموں کو چاہیے کہ وہ مجوزہ ضابطہ اخلاق کے ان نقاط کی طرف تجزیہ کارانہ طریقے سے توجہ دیں جس کا تعلق خواتین کی کوریج سے ہے اور PFUJ - IFJ کی مرتب کردہ دستاویز کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر وضع کریں۔

مجوزہ ضابطہ اخلاق سب سے اہم مسائل میں سے ایک مسئلے کے ساتھ بخوبی نمٹتا ہے اور وہ مسئلہ ہے دہشت گردی کا اور یہ کہ دہشت گردی اور اس سنگین مسئلے سے نمٹنے کے لیے جاری مہم (پاکستانی سکیورٹی فورسز کی طرف سے یا امریکن فوج کی طرف سے) کے حوالے سے میڈیا کو کیا رد یہ اختیار کرنا چاہیے۔ درج ذیل نقاط اس کی عکاسی کرتے ہیں:

> ''کوئی بھی صحافی تشدد کی غیر قانونی کارروائیوں کے مرتکب ہونے والے افراد کی مدح سرائی نہیں کریں گے...... یہ کارروائیاں کوئی بھی لبادہ اوڑھ کر یا کوئی بھی مقصد حاصل کرنے کے لیے کیوں نہ کی گئی ہوں...... بشمول غیرت اور مذہب......'' (نقطہ نمبر 14)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گذشتہ جولائی سے جب لال مسجد میں فوجی کارروائی عمل میں لائی گئی تھی۔ میڈیا کی حقیقت پسندی کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا جارہا ہے...... خاص طور پر اس وقت جب میڈیا دہشت گردی کے واقعات کی رپورٹنگ کررہا ہوتا ہے......اس وقت کی حکومت کو کوئی کارروائی عمل میں نہ لانے کی پاداش میں شدید تنقید کا نشانہ بنانے کے بعد، میڈیا نے اس وقت مکمل قلابازی لگائی جب بالآخر سکیورٹی فورسز نے مسلح عسکریت پسندوں کو مسجد سے باہر نکالنے کے لیے کارروائی کا آغاز کیا۔ جبکہ بروئے کار لائی جانے والی طاقت کی شدت یا منصوبہ بندی کے فقدان کو چیلنج کیا جا سکتا تھا۔ نیوز چینلز اور صحافی حضرات نے......مجموعی طور پر...... ایک ایسا کردار ادا کرنا شروع کردیا جو جانبدارانہ تھا اور اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا تھا کہ ان کی ہمدردیاں کس فریق کے ساتھ تھیں۔

اسی طرح، فاٹا اور سوات میں جاری فوجی کارروائیوں کی رپورٹنگ کرتے وقت اکثر عسکریت پسندوں کو ہیروز بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جن مبصرین کو اپنی رائے دینے کے لیے بلایا جاتا ہے ان میں عام طور پر وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جن کے رویے میں کوئی لچک نہیں ہوتی......مثال کے طور پر جنرل (ریٹائرڈ) گل حمید......جس کی طالبان کے حوالے سے ہمدردیاں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اس بات پر یقین کرلیا گیا ہے کہ امریکہ مخالف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کی طرف سے کی جانے والی فوجی کارروائیوں کی مخالفت کی جائے۔ اور نتیجتاً طالبان کی بربریت کی حمایت......(انھیں آپ دہشت گرد کہہ لیں یا کوئی بھی دوسرا نام دے دیں)۔

مجوزہ ضابطہ اخلاق، جس مقصد ''ذمہ دار میڈیا'' کو فروغ دیتا ہے۔ قطعی اقدار پر مبنی ایک ایسا نظام تجویز کرتا ہے جو اخلاقیات پر مبنی صحافت کو یقینی بنائے...... ذاتی اور ادارہ جاتی دونوں سطحوں پر...... میڈیا کمپلینٹس (شکایات) کمیشن کی مدد سے یہ اس بات کی یقین دہانی چاہتا ہے کہ: ''صحافیوں اور میڈیا پروفیشنلز کی طرف سے خود تنظیمی کے نتیجے میں پیشے سے وابستہ افراد پر مشتمل ایک ایسا قابل اعتماد اور موثر احتسابی نظام وجود میں لایا جائے جو ذرائع ابلاغ میں ایڈیٹوریل کو خود مختاری کے علاوہ سچائی، معتبریت اور کوالٹی کے اعلیٰ معیاروں کو فروغ دے......

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس نے ضابطہ اخلاق کی مجوزہ دستاویز ذرائع ابلاغ کی تنظیموں اور افراد کو ارسال کی ہے تاکہ ان کے تبصروں اور تجاویز سے آگاہی حاصل کی جاسکے۔ یہ ایک ایسا قدم ہے جس کی عرصہ دراز سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی......اور یہ ایک ایسا قدم ہے جسے وسیع پیمانے پر حمایت کی ضرورت ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ' جہد حق' نومبر 2008)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پانچواں باب

(پاکستان میں بین المذاہب آہنگی اور عدم برداشت کے مسائل)

- مذہبی رواداری۔ تاریخی پس منظر (ڈاکٹر مبارک علی)
- رواداری مفہوم، تاریخی حوالہ اور عصری تقاضے (جہد حق)
- ذاتی مقاصد کے لیے مذہب کا استعمال۔ تکفیر مذہب کے چند اہم مقدمات (جہد حق)
- اسلام کی لبرل اقدار۔ رواداری اور بھائی چارہ کے لیے مشعلِ راہ (خالد رحمان)
- فرقہ واریت سے نجات کا راستہ (ڈاکٹر مہدی حسن)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبی رواداری۔ تاریخی پس منظر

(ڈاکٹر مبارک علی)

تاریخ میں مذہبی جنونیت اور اپنے عقیدے کی سچائی پر مکمل ایمان معاشروں میں رہا ہے اور اسی وجہ سے 'مومن و کافر' موحد اور مشرک کے درمیان تقسیم کو جائز قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ایک مرتبہ جب کسی کو اپنے عقیدے کی سچائی پر ایمان ہو جاتا ہے تو اس صورت میں وہ دوسرے لوگوں کو گمراہ اور فاسق سمجھتا ہے اور انہیں سماجی و ثقافتی طور پر اپنے ''دائرے'' سے نکال کر دور کر دیتا ہے۔ اس طرح اس کی نگاہ میں ان لوگوں کا درجہ بحیثیت انسان کے بھی گھٹ جاتا ہے۔ اس لیے ایک طرف اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ انہیں تبلیغ کے ذریعہ یا تشدد کے ذریعہ اپنی سچائی پر ایمان لانے پر مجبور کرے اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو اس صورت میں ان پر تشدد و اذیت اور سختی کر کے انہیں ذلیل وخوار کرے۔

اسی طرح اگر کوئی فرد ان کے عقیدے کو تسلیم کرنے کے بعد، اس سے انحراف، یا اس سے نکل کر دوسرے عقیدے کی سچائی تسلیم کرے تو ایسے شخص کے لیے سخت سزا اس لیے ہوتی ہے کہ اس کے اس عمل کو غداری سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ غداری جماعت کو کمزور کر کے اسے دوسروں کی نظروں میں حقیر کرتی ہے۔

انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں عقیدہ کی یہ سختی نہیں تھی۔ ہر قبیلہ اور جماعت کے اپنے اپنے دیوی اور دیوتا ہوتے تھے اور ان کی تعداد ہمیشہ زیادہ ہوتی تھی۔ اس لیے اگر ضرورت پڑتی تھی تو وہ دوسروں کے دیوی و دیوتاؤں کو بھی اپنا لیتے تھے لیکن جب بڑی سلطنتیں قائم ہونا شروع ہوئیں اور ان سلطنتوں نے فتوحات کے بعد مختلف قبائل اور اقوام کو اپنے اندر ضم کرنا شروع کر دیا، تو سیاسی طور پر اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ دیوی اور دیوتاؤں کی تعداد محدود کر دی جائے تاکہ سلطنت کی تمام رعیت ایک قسم کے دیوتاؤں کی پرستش کرے اور اس طرح سے سیاسی اتحاد کے ساتھ ساتھ ان میں مذہبی اتحاد بھی قائم رہے کیونکہ مذہبی اتحاد کی وجہ سے ان کی وفاداریاں ریاست و حکمراں کے ساتھ ہو جائیں گی اور بغاوت کے خطرات کم ہو جائیں گے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی لیے دنیا میں بڑے بڑے مذاہب کو حکمرانوں اور بڑی سلطنتوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اشوک نے بدھ مذہب کو اختیار کر کے اپنے سامراجی عزائم کو پورا کیا تو قسطنطین اعظم نے عیسائیت کو اختیار کر کے اور رعایا کو عیسائی بنا کر اپنی ریاست کو مستحکم کیا۔ اسلامی تاریخ میں صفویوں نے ایران کی فتح کے بعد شیعہ مسلک کو زبردستی پھیلایا اور ایران کی سنی آبادی جو اکثریت میں تھی، اسے شیعہ بنا کر ازبکوں اور عثمانیوں کے خلاف اپنا دفاع کیا۔

جب ریاست مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے، تو وہ ہر تشدد اور سختی کو جائز قرار دیتی ہے اور حکمران اداروں کی مدد سے دوسرے مذاہب کو ختم کر کے، لوگوں کو مجبور کرتی ہے کہ ریاستی مذہب کو اختیار کیا جائے۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کچھ عہدیداروں نے بھی اس بات کی کوشش کی تھی کہ اہل ہندوستان کو عیسائی بنا لیا جائے تا کہ ان کی وفاداریاں مذہب کی بنیاد پر تاج برطانیہ سے وابستہ ہو جائیں۔

مگر 1858ء کے ہنگامہ کے بعد انہوں نے ان کوششوں کو کم کر دیا اور مشنریوں کی ریاستی طور پر امداد کم کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کامیاب رہی کہ اس نے یہاں کے مذہبی معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیا اور اس بنیاد پر علماء نے انگریزی اقتدار کے باوجود اسے دارالحرب قرار نہیں دیا کیونکہ انہیں ان کی حکومت میں مذہبی آزادی تھی۔

اور یہی صورت حال ہندوستان میں مسلمان خاندانوں کے دور حکومت میں رہی۔ انہیں ہندوستان کے حالات کے تحت مذہب اور سیاست کو علیحدہ کر کے مذہبی رواداری کے اصولوں پر عمل کرنا پڑا کیونکہ ہندوستان ایک ایسا ملک تھا کہ جس میں کئی مذہب اور نسلوں کے لوگ آباد تھے اور ان لوگوں کا تعاون اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا کہ جب انہیں عقیدہ کی پوری پوری آزادی دی جائے۔ اسی لیے ان کی حکومتوں میں مسلمان، ہندو اور عیسائی سب ہی شریک تھے۔ ہندوؤں کے کاستھ طبقے نے انتظامی امور میں حکومت کی بڑی خدمات سرانجام دیں اور یہی کچھ سندھ میں ہوا کہ یہاں پر ہندوؤں کے عامل طبقے نے مسلمان حکمرانوں کے دربار میں وفاداری کے ساتھ ملازمتیں کیں۔

خصوصیت سے مغل زوال کے بعد جب ہندوستان میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں تو ان ریاستوں کے ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے دربار میں ہر مذہب کے ماننے والے تھے۔ میسور، بنگال، حیدرآباد، دکن اور اودھ کی ریاستوں کی مثالیں کافی ہیں کہ جن کے اعلیٰ عہدے دار ہندو تھے اور یہ سب اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ اس وقت معاشرہ میں مذہبی رواداری تھی، اور کسی کو اس کے عقیدے کی بنیاد پر نہ تو کم تر سمجھا جاتا تھا، اور نہ اسے عقیدہ بدلنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سماجی اور ثقافتی تعلقات کی وجہ سے مذہبی رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ کا پکا کھانا نہیں کھاتے تھے، اور شادی بیاہ کے موقعوں پر علیحدہ ہندو و مسلمان باورچی کھانا پکاتے تھے مگر ان باتوں کو مذہبی ضرورت سمجھ کر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کی بنیاد پر ایک دوسرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے نفرت نہیں کرتے تھے کیونکہ نفرت اور علیحدگی کی صورت میں سماجی وثقافتی تعلقات متاثر ہوتے اور معاشرہ کی ہم آہنگی برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے مذہبی رواداری وقت کی ضرورت بن گئی تھی۔

صورت حال اس وقت بدلی جب پاکستان کی تحریک کو مذہب کے نام پر چلایا گیا۔ اگرچہ اس تحریک کے پیچھے سیاسی اور معاشی مقاصد تھے مگر ان مقاصد کے حصول کے لیے مذہب کو استعمال کیا گیا اور ایک عام مسلمان کو یہ تاثر دیا گیا کہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان اپنے مذہب اور عقیدے کا تحفظ نہیں کر سکیں گے اور نہ اپنے مذہبی فرائض کو آزادی سے سرانجام دے سکیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب پاکستان بنا تو عام مسلمانوں میں یہ خیال تھا کہ یہ صرف مسلمانوں کے لیے ہے اور یہاں دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہیں سے مذہبی تعصب اور نفرت کی ابتدائی ہوئی۔

اس کے علاوہ جیسے جیسے ہماری سیاسی لیڈرشپ لوگوں کے مسائل حل کرنے میں ناکام ہوتی چلی گئی اسی طرح اس نے مذہب اور نظریہ پاکستان کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں جو نصاب بنایا گیا اس میں خصوصیت سے ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ صرف ہم سچائی پر ہیں اور باقی تمام عقیدے باطل اور فاق ہیں۔ یہی کچھ ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعہ ہوا، چنانچہ ایک عام شہری کے ذہن میں یہ خیالات پختہ ہو گئے ہیں کہ ہندو اور مغرب کے ممالک ہمارے دشمن ہیں اور یہ سب مل کر مسلمانوں کی تباہی کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ اس لیے ہماری ہر ناکامی کے پیچھے ہندو، یہودی اور عیسائی کی سازش چھپی ہوتی ہے۔ سازش کی اس تھیوری کی وجہ سے لوگوں میں ہر پرائے سے نفرت پیدا ہوتی ہے، ہر غیر مسلمان میں اسے اپنا دشمن چھپا نظر آتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ یورپ میں بھی مذہبی تنگ نظری اور جنونیت کا دور دورہ تھا، مگر وہاں ذہن کو بدلنے کی ابتدا رینا ساں کے دور سے شروع ہوئی اور معاشرہ سماجی وثقافتی اور معاشی طور پر اس وقت تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں کہ جب سرمایہ کاری نے آہستہ آہستہ پرانے جاگیردارانہ اداروں اور اقدار و روایات کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ فنی تبدیلیوں سے سماجی رشتوں میں تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں۔ شہروں کی آبادی بڑھی تو اس نے دیہاتی آبادی کے پختہ سماجی نظام کو توڑ دیا اور فرد کو شہر میں گمنام کر کے اس شناخت کو جم غفیر میں ملا دیا لہٰذا اس نے روایتی معاشرہ کے تمام ڈھانچہ کو بدل دیا۔ زندگی کے ہنگاموں میں انسان اور انسان کے تعلقات معاشی اور سماجی طور پر مضبوط ہوئے اور مذہبی طور پر کمزور، جرمنی کے مشہور مورخ ارنسٹ زیلِتش نے اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ سرمایہ داری کے پھیلاؤ سے چرچ اور اس کے ماننے والوں کے تعلقات کمزور ہو جائیں گے، اور اس صورت حال میں یونیورسل چرچ اپنے تسلط کو برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ ایک دوسرے مصنف جارج قامل نے اس کی نشاندہی کی تھی کہ جدید سماجی اور ثقافتی رجحانات، سرمایہ داری کا بڑھنا اور شخصی طور پر ہر فرد کی اپنی شناخت کا ابھرنا، مذہب کی ان بنیادوں کو ختم کر دیں گے کہ جن پر اس کا انحصار ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس مغربی تہذیب میں جب جمہوری اقدار کا فروغ ہوا تو اس میں آہستہ آہستہ فرد کی اہمیت بڑھتی گئی اور اس کی سیاسی اہمیت نے اس کے مذہب اور عقیدے کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور جب قومی ریاست کا نظریہ مضبوطی کے ساتھ اُبھرا تو اس نے قوم کی تشکیل، زبان، نسل اور ایک جغرافیائی حدود میں رہنے والوں کی بنیاد پر کی۔ مذہب کے نام سے نہیں۔ اس نے ریاست کے ہر فرد کو معاشرہ میں مساوی مقام دیا اور اس کی شناخت اس کی قوم سے ہونے لگی جس کی وجہ سے مذہبی شناخت کی اہمیت ختم ہو گئی۔

چنانچہ یورپ کی تاریخ میں مذہبی رواداری کو قائم کرنے اور مذہبی شناخت کو ختم کرنے میں قومی ریاست کے قیام اور جمہوری اداروں کے فروغ کو بڑا دخل ہے۔ ان ہی کی وجہ سے یورپ کا معاشرہ سیکولر ہوا اور ریاست نے خود کو مذہب سے جدا کر کے اسے لوگوں کا نجی معاملہ قرار دے دیا۔

اس مختصر سے جائزہ کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کے امکانات ہیں کہ پاکستان بھی اس عمل سے گزرے گا اور کیا سرمایہ داری اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ جو فنی تبدیلیاں آئیں گی وہ ہمارے سماجی رشتوں کو بدلیں گی اور کیا جمہوری ادارے اور روایات مذہبی شناخت کو کمزور کریں گے۔

یہ ممکن ہے مگر یہ صرف اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہمارا جاگیردارانہ معاشرہ کمزور ہو گا اور جب جاگیردارانہ روایات ٹوٹیں گی کیونکہ اس وقت جاگیردارانہ اداروں اور مذہب کے درمیان زبردست رشتہ ہے جو ایک دوسرے کو سہارا دیے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ہماری جمہوریت بھی جاگیردارانہ ہے کہ جس میں جاگیردار انتخابات میں کامیاب ہوتے ہیں اور جمہوری اداروں کو اپنے طبقاتی مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کی مثال ہماری اسمبلیوں کی کارروائی سے ہو سکتی ہے کہ جس میں وہ تمام قوانین منظور ہوئے کہ جو معاشرہ کو مسلسل پیچھے کی جانب دھکیل رہے ہیں۔

اور یہی کچھ فنی تبدیلیوں کا ہے کہ اس وقت لاؤڈ سپیکر ٹی وی، ریڈیو، ویڈیو اور کمپیوٹر ان سب کا استعمال بنیاد پرست جماعتیں زور شور سے کر کے پرانے عقائد کی تبلیغ کر رہی ہیں اور اپنے پیغام کو شہروں شہروں اور گاؤں گاؤں پہنچا رہی ہیں۔ چنانچہ معاشرہ کی سماجی اور ذہنی بنیاد کے تبدیل نہ ہونے کی وجہ سے جمہوری ادارے اور سائنس و فنی آلات معاشرہ کو گمراہ کرنے اور ان میں تنگ نظری و جنونیت پیدا کرنے کے کام آ رہے ہیں۔ بلکہ اس ماحول میں یہ دونوں راستے حکمران طبقوں کے ہاتھ میں خطرناک ہتھیار ہیں کہ جن سے وہ اپنے ہر عمل کو جائز قرار دیتے ہیں اور اپنی پوزیشن کو مضبوط و مستحکم بناتے ہیں۔

ان حالات میں ایسا نظر آتا ہے کہ حکمراں طبقے اور مذہبی جماعتیں اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے اور خود کو مقبول بنانے کے لیے مذہبی جذبات کو بھڑکاتے رہیں گے اور ان کا نشانہ مذہبی اقلیتیں رہیں گی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ ان کے اس عمل سے اقلیتوں میں بے چینی پھیل رہی ہے اور وہ احساس کمتری میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مبتلا ہو رہی ہیں جس کے نتیجہ میں معاشرہ کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہیں اور معاشرہ کئی حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک ٹوٹا ہوا معاشرہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتا ہے کہ وہ اپنا دفاع کر سکے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود وہ اقتدار کی بنیادوں کو مذہبی تنگ نظری پر رکھنا چاہتے کہ جو مساوی بنیادوں پر تمام شہریوں کو متحد کر کے ان کے سماجی، سیاسی اور معاشی رشتوں کو مضبوط کرتا ہے۔ معاشرہ کی اس ہم آہنگی سے ایک مشترکہ ثقافت پیدا ہوتی ہے جو کسی بھی قوم کی شناخت کے لیے ضروری ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ 'بدلتی دنیا' لاہور)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رواداری، مفہوم، تاریخی حوالہ اور عصری تقاضے

رواداری کے معنی یہ ہیں کہ انسانی کنبے کے تمام افراد، بلالحاظ رنگ ونسل، جنس وعقیدہ ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک روا رکھیں، ایک دوسرے کی اچھائیوں پر نظر رکھیں اور خامیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کرتے رہیں۔ رواداری انسان کا فطری جذبہ ہے جبکہ نارواداری حیوانی جذبات کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ رواداری قوموں کو استحکام اور ترقی کی ضمانت دیتی ہے اور عدم رواداری قوموں کے زوال کے اسباب پیدا کرتی ہے۔

ہمیں اپنے ملک کی ترقی کے لیے برداشت اور رواداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور مختلف خیالات اور عقیدوں کو ماننے والوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ہم تاریخ کی مثالوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مثلاً 1026 میں جب محمود غزنوی نے سومنات کے مندر پر حملہ کیا اور اسے تباہ کر دیا تو اس کے دو سو سال بعد جب دوبارہ اسی جگہ مندر بنایا گیا تو وہاں کے بااختیار لوگوں نے ہرمز کے ایک مسلمان تاجر نورالدین فیروز کو مندر کی زمین پر مسجد بنانے اور وہاں کے مسلمانوں کو رہنے، کاروبار کرنے کی اجازت دی۔ وہاں آج بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کی ملی جلی آبادی امن وسکون اور رواداری کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ساتھ ساتھ رہ رہی ہے اور یہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف عقیدوں کو برداشت کرتے ہوئے ایک ساتھ مل جل کر رہنے کی ایک اچھی مثال ہے۔

نارواداری کی لہر بعض اوقات عام انسانوں سے ایسے افعال سرزد کرا دیتی ہے جن پر بعد میں وہ نادم ہوتے ہیں۔ سوات میں ایک عبادت گاہ تھی جسے ہندو اور سکھ دونوں استعمال کرتے تھے، بابری مسجد کے انہدام کے خلاف نفرت کی رو میں بہہ کر مقامی مسلمانوں نے وہ عبادت گاہ تباہ کر دی۔ کچھ دن بعد اُنہیں احساس ہوا کہ یہ کام غلط ہو گیا۔ جن ہاتھوں نے مندر گرایا تھا اُنہی ہاتھوں نے اُسے دوبارہ تعمیر کر دیا۔ یہ رواداری کے جذبے کی حیوانی بے راہ روی پر فتح کی مثال ہے۔ ایسی ہی مثالیں ہندوستانی پنجاب میں اُن مساجد کی تعمیر نو کی تحریک فراہم کر رہی ہے جنہیں 1947 میں ڈھا دیا گیا تھا اور جنہیں مقامی لوگوں کی مدد سے دوبارہ عبادت گاہ کے طور پر استعمال کے قابل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنایا جا رہا ہے۔

پاکستان کے مسلمان بھی دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کر کے ایک اچھی مثال قائم کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شامل ہو کر ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ اندرون سندھ اور پاکستان کے تمام شہروں میں دیگر مذاہب کی عبادت گاہیں موجود ہیں جن میں چرچ، مندر اور گردوارے شامل ہیں۔ سب شہریوں کو ان عبادت گاہوں کا احترام اور حفاظت کر کے رواداری اور پرامن زندگی کی مثال قائم کرنا چاہیے۔ بالخصوص مسلمانوں کو ان عبادت گاہوں کی حفاظت اور احترام بھی اسی طرح کرنا چاہی جس طرح وہ اپنی مسجدوں کا احترام کرتے ہیں۔ ہمیں ان شرپسندوں کی بھرپور مخالفت کرنی چاہیے جو ہمارے ملک کے امن کو تباہ کرنے اور ہمارے قومی اتحاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں صوبہ خیبر پختونخوا میں صدیوں سے آباد سکھ افراد کو ان کی بستیوں سے زبردستی نکال دیا گیا اور وجہ سرکاری کیمپوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ نہ صرف ان پاکستانی شہریوں کو بلاوجہ تکلیف اُٹھانی پڑی، ملک کی بڑی سبکی ہوئی۔ پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ایسے واقعات آئندہ سامنے نہ آئیں۔

ہم لوگوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کس طرح امن وسکون سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس لیے کہ کوئی نہیں چاہتا کہ اسے بے گھر کر دیا جائے یا اس سے نفرت کی جائے۔ آپس کے امن وسکون کو صرف اس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے کہ ہم مختلف مذہبوں اور مختلف ثقافتوں کے لوگوں کے درمیان موجود جھگڑوں اور اختلافات کو کم کرنے کی کوشش کریں اور ان کے درمیان دوستانہ تعلقات مضبوط کریں۔ اس طرح مختلف مذہبوں کے لوگوں، الگ الگ زبانیں بولنے والوں اور دیگر افراد کے درمیان برداشت اور احترام کے جذبات بیدار کیے جائیں۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ آپس کا احترام اور محبت کے جذبات پیدا کرنے کا فرض رضا کارنہ بنیادوں پر ادا کیا جائے تاکہ اس سے مختلف مذاہب، فرقوں اور دیگر گروہوں میں مقابلے کی فضا پیدا نہ ہو بلکہ آپس میں دوستی کا رویہ پیدا ہو، کیونکہ مقابلے کی فضا سے اتحاد اور امن کو نقصان ہو سکتا ہے۔ شرپسند افراد ایسے ہی حالات کا فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر لڑائی جھگڑے اور بدامنی کا ماحول پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ذات پات اور نسل کو بنیاد بنا کر بھی لڑائی جھگڑے کا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے خطے میں مذہبی رواداری اور برداشت:

برصغیر ہندو پاک کے دریاؤں پر جو تجارتی بندرگاہیں قائم ہیں ان کے ذریعے مسلمانوں، ہندوؤں، مسیحیوں اور دیگر مذہبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے پرامن تجارت کی ہے۔ یہ بندرگاہیں آپس کے امن کا ذریعہ بنیں اور یہ تجارتی راستے کئی سو سال سے موجود رہے ہیں۔ کبھی کبھار آپس میں اختلافات بھی ہوئے لیکن مجموعی طور پر امن قائم رکھا گیا۔ لوگوں نے متحد ہو کر مذہبی گروپوں کے درمیان جھگڑوں کو ختم کرنے میں اہم خدمات انجام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیں۔ گجرات اور الابار کے تاجروں کی جماعتوں اور مختلف مذہبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے اداروں نے بھی اس سلسلے میں اہم کام انجام دیے۔ جب کبھی کسی بھی عقیدہ یا نسلی گروہ کے کسی فرد پر دوسرے گروہ کے کسی فرد کی جانب سے زبردستی کی جاتی تو وہ جماعت اس ظلم کے خلاف متحد ہو جاتی اور ایک دوسرے کی مدد کے ذریعے مسائل حل کر لیے جاتے۔ اس طرح مختلف نسلوں اور مذہبی گروپوں کے درمیان مسلسل رابطے قائم رہے۔ جس کی وجہ سے ان کے درمیاں احترام اور اعتماد کے جذبات پیدا ہوئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی ساری کوششوں کے بعد بھی رواداری اور امن کا یہ جذبہ جاری کیوں نہ رہ سکا اور یہ کہ ہم کس طرح رواداری اور امن قائم کریں اور بھائی چارے میں اضافہ کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ کچھ طاقت ور طبقے امن اور اتحاد کے جذبات کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ پریشانی ہوتی ہے کہ اگر مختلف گروہوں نے رواداری اور امن کو اپنا لیا تو ان کی طاقت اور اقتدار کو نقصان پہنچے گا۔ اس لیے وہ جان بوجھ کر ایسے منصوبے بناتے ہیں کہ لوگ آپس میں لڑیں اور متحد نہ ہو سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف گروہ ایسے افراد اور گروہوں کے منفی منصوبوں کو سمجھیں اور انہیں ناکام بنائیں اور اپنی پوری کوشش کریں کہ محبت، احترام اور اتحاد کے جذبات کو اور زیادہ مؤثر طریقے سے پھیلایا جا سکے۔

علم تمام دنیا کے انسانوں کا مشترکہ حق ہے۔ قدرت کی پیدا کی ہوئی نعمتوں یعنی ہوا، پانی، فصلوں اور دیگر قدرتی وسائل کے علاوہ علم اور سائنسی تحقیق اور جدید سائنسی طریقہ سے ساری دنیا کے لوگ فائدہ حاصل کر یت ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی مذہب کے ماننے والے ہوں۔ درج ذیل چند اہم قیمتی چیزیں قدرت نے تمام انسانوں کے فائدے کے لیے پیدا کی ہیں۔

قدرتی نظام جیسا کہ آب وہوا، پانی، علاقائی ماحول اور زندگی پیدا کرنے کا نظام ورثے میں ملنے والا علم جیسے سائنسی ترقی اور تحقیق، علاقائی علوم جو سب انسانوں کے لیے مشترکہ جائیداد کی طرح ہیں اور سب ہی اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

یونیسکو کا عالمی اعلامیہ

یونیسکو نے اپنے اعلامیہ میں مختلف ثقافتی خصوصیات کی حفاظت اور ان کی ترقی کے حوالے سے جن اہم باتوں پر توجہ دی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

1- مختلف ثقافتی اقدار کسی علاقے کے انسانوں کی خصوصیات کی نشاندہی کرتی ہیں۔

2- مختلف ثقافتی اقدار اور خصوصیات تمام انسانوں کا مشترکہ ورثہ ہیں اس لیے ان کی ترقی اور تحفظ بھی ضروری ہے کیونکہ یہ تمام انسانوں کا مشترکہ ورثہ ہیں اس لیے ان کی ترقی اور تحفظ بھی ضروری ہے کیونکہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ تمام انسانوں کے لیے فائدہ مند ہیں۔

-3 ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ مختلف ثقافتیں دنیا کو زیادہ دلچسپ اور رنگ برنگی بناتی ہیں جس کی وجہ سے انسانوں کی صلاحیتوں اور خوبیوں کو سمجھنے اور انہیں ترقی دینے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح یہ ثقافتیں مختلف گروہوں، افراد اور حکومتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر کے ان کی ترقی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

-4 یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مختلف ثقافتی خصوصیات جمہوریت، رواداری، انصاف اور آپس کے احترام کے ماحول میں ترقی پاتی ہیں اور یہ مقامی، علاقائی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر امن اور تحفظ کے لیے بہت ضروری ہے۔

-5 ثقافتی خصوصیات کا دن پورے اہتمام سے منایا جائے۔

-6 اس بات کی ضرورت ہے کہ نہ صرف قومی اور بین الاقوامی ترقیاتی منصوبوں میں ثقافت اہم ہے بلکہ بین الاقوامی ترقیاتی کارپوریشن میں بھی ثقافت کو ضرور شامل ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے 2000 کے معاہدے کے اعلان میں دنیا سے غربت کے خاتمہ پر خاص زور دیا گیا ہے۔

-7 ہر ثقافت پر وقت اور جگہ کے اثرات ہوتے ہیں اور اس کا اثر انسانوں پر پڑتا ہے۔

-8 مقامی افراد کی ترقی میں بھی ثقافت کا اہم کردار ہے۔

-9 ثقافت کے ساتھ ساتھ مختلف ثقافتی اشیا کا تحفظ بھی ضروری ہے۔

-10 معاشرے کے تعلقات اور معاشرے میں خواتین کی اہمیت اور کردار کو اہم سمجھنا بھی ضروری ہے۔

-11 مختلف ثقافتوں کے درمیان تعلق سے پوری طرح باخبر رہنا

-12 معاشرے میں میڈیا کا کردار بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔

-13 ثقافت میں رائے کا اظہار اہم ہے

-14 ثقافت کے اظہار اور فروغ میں تعلیم کا اہم کردار ہے۔

-15 اکثریتی قوموں اور اقلیتوں کے میل جول سے ثقافت ترقی پاتی ہے۔

-16 ثقافتی رابطوں سے معاشرے میں ترقی ہوتی ہے۔

-17 ذہین افراد ثقافت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

-18 ثقافتی سرگرمیاں اور خدمات ثقافت اور معیشت دونوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں۔

-19 گلوبلائزیشن کی وجہ سے امیر اور غریب ممالک کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

-20 ہم جانتے ہیں کہ یونیسکو ممالک کے درمیان معاہدوں کی توثیق کرتا ہے جس سے معلومات کے آزادانہ پھیلاؤ میں آسانی ہوتی ہے۔ یونیسکو ملکوں کو محض زمین کے ٹکڑے نہیں سمجھتا بلکہ انہیں ایک ایسے معاشرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی حیثیت سے دیکھتا ہے جہاں انسانوں کی ترقی ممکن ہے۔ یونیسکو تمام زبانوں، نسلی گروہوں، مذاہب اور عقیدوں کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔

مختلف برادریوں کا ایک دوسرے کے لیے احترام

مختلف تہذیبوں کے درمیان مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی اختلافات دور کرنے کے لیے ان کے درمیان درگزر اور رواداری کے جذبات پیدا کرنے ہوں گے۔ مختلف نسلی گروہوں کے درمیان بات چیت کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح ان گروہوں میں ایک دوسرے کا احترام اور امن قائم ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ان کے آپس کے اختلافات کو سمجھنے کا موقع ملے گا اور اختلافات ختم کرنے کی کوشش کی جا سکے گی۔ ہمیں امن قائم کرنے کے لیے مختلف ثقافتی گروہوں اور مذہبی افراد کے درمیان رواداری، احترام اور دوستی کو اہمیت دینی ہوگی۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر انسان، عالمی برادری کا رکن ہے اور دنیا کے اکثر افراد امن، محبت اور احترام سے رہنا چاہتے ہیں۔ ایسا صرف اس وقت ممکن ہے جب ہم دوسروں کو بھی محبت اور احترام دیں۔ پرسکون ماحول کے لیے رواداری اور فراخدلی ضروری ہے۔

آج کی تقسیم شدہ دنیا میں ثقافتی آزادی

دنیا میں موجود ملکوں میں مختلف نسلوں کے لوگ رہتے ہیں۔ 200 ملکوں میں تقریباً 5000 نسلی گروہ آباد ہیں۔ جن میں سے آدھے سے کچھ کم ایسے ہیں جن کے عقیدے اور خیالات دیگر لوگوں سے مختلف ہیں۔ ساری دنیا میں ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کا عمل بھی تیزی سے ہو رہا ہے۔ اس طرح مختلف ملکوں کی آبادی میں خاص طور پر شہری آبادیوں میں تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے۔ ہر ملک میں بہت ساری ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہو رہے ہیں۔ یوں دنیا میں ایسے معاشرے تیزی سے بڑھ رہے ہیں جہاں ایک سے زیادہ ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہیں۔ ملکوں کے لیے تمام ثقافتوں کی شناخت اور ان کی رنگا رنگی کو قائم رکھنا مشکل کام ہے۔ مختلف ثقافتوں کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ مختلف ریاستیں رواداری، ایک دوسرے کے لیے احترام اور امن و امان کے جذبات کو عوام میں پھیلائیں۔ اسی طرح ملکوں کو عوام کے حقوق کا بھی مکمل طور پر تحفظ کرنا چاہیے تاکہ عوام میں حکومت کا اعتبار قائم ہو۔ بھوکے اور بیمار عوام کس طرح حکومت کی بات سن سکتے ہیں۔ تمام ملکوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کی کوشش کریں کہ غربت کا خاتمہ ہو اور لوگوں کو برابری کی بنیاد پر ترقی کرنے کا حق حاصل ہو۔

(بشکریہ ماہنامہ 'جہد حق')

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبی ہم آہنگی اور رواداری

(سوچ کے دریچے)

(حفیظ بزدار)

- موروثی سوچ اور مذہبی عقائد
- ایک دوسروں کو کافر کہنے کا اختیار کس نے دیا؟
- اگر کوئی کافر ہے تو کیا اس کو مار دینا چاہیے؟
- ''جو میں سوچتا ہوں وہ ٹھیک ہے'' اور اس کو دوسروں پر مسلط کرنے کی مذہبی، قانونی اور معاشرتی دلیل کیا ہے؟
- کیا پڑھی لکھی پر امن اور باشعور لوگوں کی اکثریت کی ''خاموشی'' مذہبی جنونیوں کے بے لگام ہونے میں تقویت نہیں دے رہی؟
- کیا ہم جناح کی 11 اگست کی تقریر پر عمل پیرا ہوئے؟
- کیا ہماری سیاسی جماعتیں اپنے مقاصد کے لیے مذہب کو استعمال نہیں کرتی رہیں؟
- کیا سیاسی جماعتوں کے سربراہ اپنے ووٹ بینک کے تحفظ کے لیے مذہبی جنونیوں کے خلاف بات کرنے سے ڈرتے نہیں ہیں؟
- کیا مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کے فروغ کے لیے ہمارے دانشوروں اور میڈیا کا کردار قابل تحسین ہے؟
- کیا مدارس کو ملنے والی اربوں روپے کی امداد کا آڈٹ ہوتا ہے؟
- مدارس سے فارغ التحصیل طلباء وطالبات کی ہمارے معاشرے میں افادیت کیا ہے؟
- کیا ہم سوات جیسے مزید سانحات برداشت کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں؟
- کیا معاشروں کی ترقی میں مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کوئی کردار ادا کرتی ہے؟
- کیا معاشرہ کی خوبصورتی مذہبی ہم آہنگی اور رواداری میں مضمر نہیں؟
- کیا مذہبی جنونیت کے واقعات ہمارا عالمی تشخص تباہ نہیں کر رہے؟
- کیا مذہبی جنونیت کے واقعات ہماری معیشت کو اپاہج نہیں کر رہے؟
- کیا سورۃ الکافرون اور صلح حدیبیہ کے واقعہ میں ہمارے لیے کوئی سبق ہے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذاتی مقاصد کے لیے مذہب کا استعمال

تکفیر مذہب کے چند اہم مقدمات

پاکستان پینل کوڈ دفعہ 295، جسے عام طور پر تکفیر مذہب قانون کہا جاتا ہے، پہلی بار انگریزوں کے دور میں 1860 میں متعارف کروایا گیا تھا۔ اس زمانے میں یہ قانون تمام مذاہب پر لاگو ہوتا تھا اور اس کی زیادہ سے زیادہ سزا دو سال قابل ضمانت تھی۔ اور کسی مذہبی اجتماع میں خلل بھی اس قانون کی خلاف ورزی سمجھا جاتا تھا۔ رپورٹس کے مطابق اندازاً 1988 سے لے کر 2010 تک اس قانون کے تحت 1274 افراد ملزم قرار پائے ہیں۔

1927 میں ایک متنازعہ مقدمہ، جس کا دفاع برصغیر کے نامور وکیل محمد علی جناح کر رہے تھے، میں بحث کے بعد اس قانون میں ترمیم کی گئی۔ قانون سازنے ''ارادتاً اشتعال'' یا ''اشتعال کی کوشش'' کی بجائے "جان بوجھ کر" یا "بری نیت سے'' کے الفاظ استعمال کرنے کی تنبیہ کی۔

1980-1986، دفعہ 295 میں 5 ترامیم کی گئیں، مقدس ہستیوں کے بارے توہین آمیز الفاظ کا استعمال، قرآن پاک کی توہین اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی۔

1990 میں وفاقی شرعی عدالت ترمیم کر کے موت کی سزا شامل کر دیتی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت نے کہا کہ اگر قومی اسمبلی نے اس سلسلے میں کاروائی نہ کی تو عمر قید 30 اپریل 1991 کو ختم ہو جائیگی۔

1991 میں قومی اسمبلی نے کوئی کاروائی نہ کی۔ اس لئے سزائے موت دفعہ 295 کی خلاف ورزی کی سزا بن گئی۔

1992 میں سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے قانون اور انصاف نے دفعہ 295 میں سے "عمر قید" کے الفاظ خارج کرنے کی تجویز دی لیکن اراکین نے محسوس کیا کہ دفعہ 295 مبہم ہے اور کسی بھی عمل سے پہلے اسلامی نظریاتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کونسل کو اسے واضح کرنا چاہیے۔ اراکین پارلیمنٹ کی جانب سے متبادل سزا کے اخراج کی مخالفت کی گئی اور پاکستان مسلم لیگ کی حکومت نے بل اسمبلی سے ہٹا دیا اور "یا عمر قید" کے الفاظ موجود رہے۔

80 سالہ سماجی کارکن اختر حامد خان، ایک مسلمان، کو ایک ہندوستانی صحافی کو انٹرویو دیتے وقت توہین مذہب کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں اسے دوبارہ گرفتار کر لیا گیا کیونکہ اس نے بچوں کے لیے ایک نظم لکھی تھی جس کے بارے میں کہا گیا کہ اس میں حضور پاک اور ان کے خاندان کی شان میں گستاخی کی گئی ہے۔ حکومت اور دانشوروں کی جانب سے پرزور اسرار کے باوجود مقدمہ عدالت میں ایک سال سے زیادہ چلتا رہا ہے۔

1993 میں 11 سالہ سلامت مسیح، 38 سالہ منظور مسیح اور 44 سالہ رحمت مسیح کو ایک مسجد کی دیوار پر توہین آمیز تبصرے لکھنے کے جرم میں پکڑ لیا گیا حالانکہ سلامت کی ماں نے کہا کہ اس کا بیٹا پڑھنا نہیں جانتا۔

اپریل میں سیشن کورٹ کی سماعت کے بعد منظور مسیح کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ سلامت اور رحمت مسیح زخمی ہو گئے لیکن بچ گئے۔ بشپ جان جوزف اس ظلم کے خلاف بول اٹھے۔

فروری 1995 میں 14 سالہ سلامت مسیح اور 46 سالہ رحمت مسیح کو سزائے موت سنائی گئی۔

23 فروری کو لاہور ہائی کورٹ رحمت مسیح اور سلامت مسیح کو اس بنیاد پر رہا کر دیتی ہے کہ مسیحی عربی سے نابلد ہوتے ہیں اس لئے وہ عربی میں اللہ کیسے لکھ سکتے ہیں؟ بینچ میں جسٹس عارف اقبال بھٹی اور جسٹس چوہدری خورشید احمد شامل تھے۔

مختلف مذہبی گروپوں کی جماعت ملی یکجہتی کونسل مئی میں پورے ملک میں ہڑتال کرتی ہے۔ اہم شہروں کراچی، پشاور، لاہور، چترال، کوئٹہ اور راولپنڈی میں ہڑتال ہوتی ہے۔

1997 میں جسٹس عارف اقبال بھٹی کو لاہور ہائی کورٹ میں ان کے چیمبر میں قتل کر دیا جاتا ہے۔

1998، اپریل میں ایوب مسیح کو توہین آمیز تبصرے کرنے پر سزائے موت سنائی جاتی ہے لیکن ہائی کورٹ یہ سزا معطل کر دیتی ہے۔

جب 6 مئی کو بشپ جان جوزف ایوب مسیح کو سزائے موت سنائے جانے کے خلاف کمرہ عدالت میں بہت سے لوگوں کے سامنے خودکشی کرتے ہیں تو اس مقدمے کو عالمی شہرت ملتی ہے۔

جسٹس عارف اقبال بھٹی کا قاتل پکڑا گیا اور اس نے کہا کہ اس نے جسٹس عارف کو اس لئے قتل کیا کہ وہ دو مسیحوں سلامت اور رحمت کو توہین مذہب سے رہائی دینے والے بینچ میں تھا۔

2000 میں ایک فزیشن، یونس شیخ، کو اس بنیاد پر توہین مذہب کا الزام لگایا گیا کہ اس کے طلبا کا دعوی تھا کہ اس نے دوران لیکچر ایسے کلمات ادا کیے۔ ایک جج نے کہا کہ شیخ 100,000 جرمانہ ادا کرے اور اسے پھانسی دی جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

2003 میں سیموئیل مسیح کو مبینہ طور پر ایک مسجد کی دیوار پر تھوکنے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ دوران قید مسیح کو ٹی بی ہوتا ہے اور اسے ہسپتال منتقل کروایا جاتا ہے۔ پولیس کی حراست میں ایک پولیس افسر اسے ایک ہتھوڑے سے مار دیتا ہے اور دعوی کرتا ہے کہ بطور مسلمان اسے مارنا اس کا فرض تھا۔

پولیس انور مسیح کو گرفتار کرتی ہے اور دفعہ 295 کے تحت جرم لگاتی ہے۔ پولیس کو اس کے ایک ہمسائے اطلاع دی تھی کہ وہ توہین مذہب کا مرتکب ہوا۔ لاہور ہائی کورٹ نے مسیح کو 2005 میں رہا کیا اور وہ غائب ہوگیا۔

ایک عدالت نے ڈاکٹر یونس شیخ کے مقدمے کی دوبارہ سماعت کی اور اسے رہا کردیا جس نے تھوڑے عرصے بعد نومبر میں پاکستان چھوڑا اور یورپ کی راہ لی۔

2006 میں مسلمان ڈان براؤن کے ناول "دی ڈاونسی کوڈ" کو توہین آمیز قرار دیتے ہیں۔ فلم پر پابندی لگادی جاتی ہے۔

2009 میں فیصل آباد، پنجاب کے دو بزرگ مسیح اپریل میں لاہور ہائی کورٹ کے کہنے پر رہا ہوتے ہیں۔ 2006 میں دونوں ملزموں کو مبینہ طور پر قرآن کے صفحات جلانے کے جرم میں، 10,10 سال سزا ہوئی تھی۔ یہ الزام زمین کی لڑائی میں سے ابھرا تھا۔

جولائی میں ایک کالعدم مسلم تنظیم، سپاہ صحابہ، نے گوجرہ اور کوریاں میں مسیحوں کے گھر جلا دیے اور انہیں ہلاک کردیا۔ تشدد کی وجہ یہ تھی کہ ایک مسیح پر قرآن کے صفحات پھاڑنے کا الزام لگایا گیا تھا۔

2010، جولائی میں لاہور ہائی کورٹ نے شہادت نہ ہونے کی بناء پر زینب النساء کو رہا کردیا۔ اس عورت کو قرآن پاک پھاڑنے کے الزام میں 1996 میں جیل بھیج دیا گیا تھا۔

آسیہ بی بی، پہلی مسیحی خاتون جسے توہین مذہب کی بنا پر سزائے موت دی گئی۔ ابھی مقدمے کو لاہور ہائی کورٹ میں جانا ہے اور اس پر بین الاقوامی ردعمل سامنے آیا ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ جہد حق' اکتوبر 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام کی لبرل اقدار......رواداری اور بھائی چارہ کے لیے مشعل راہ

(خالد رحمان)

انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز کے مطابق لبرلز اور لبرل ازم کے بارے میں تحریر ہے کہ "لبرل ازم جبر سے رہائی پر زور دیتا ہے۔ یہ ضمیر کی آزادی اور مذہبی رواداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ لبرل ازم پر یقین رکھنے والے لوگ اکثر اوقات مذہب کے پابند نہیں ہوتے۔ سیکولر خیالات رکھتے ہیں بلکہ بعض تو مذہب کے مخالف بھی ہوتے ہیں۔ روایتی اتھارٹی کی بجائے وہ عقل کی بالادستی کی حمایت کرتے ہیں اور ایسے سچ کو مانتے ہیں جو مشاہدے سے ثابت ہو بہ نسبت اس کے جو الہامی ہو۔"

اگر لبرل ازم کی تشریح کا موازنہ اسلام کے اس دعوے سے کیا جائے کہ یہ سچا اور الہامی مذہب ہے تو یہ تاثر ابھرتا ہے کہ اسلام اور لبرل ازم دو بالکل مختلف اور الگ الگ چیزیں ہیں۔ اسلام کی بنیاد الہامی علم پر ہے جبکہ لبرل ازم علم ودانش کے مقابلے میں عقل کو اہم تر قرار دیتا ہے تو کیا اسلام اور لبرل ازم دو مختلف فلسفے ہیں جن میں کوئی بھی مشترک نہیں ہے؟

گو بظاہر یہ بات درست نظر آتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ بلاشبہ اسلام غیب پر ایمان کا تقاضا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اندھی تقلید کی حمایت بھی نہیں کرتا۔ اس کی بجائے اسلام لوگوں کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کریں اور عقل اور منطق کی بنیاد پر فیصلہ کریں۔ قرآن پاک میں کئی جگہ پر کہا گیا ہے کہ دنیا میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے قدرت کے بے شمار مظاہر پر غور کرو۔

"زمین وآسمان کی تخلیق میں اور دن اور رات کے تغیر میں انسانوں کے سمجھنے کے لیے نشانیاں ہیں"۔

(القرآن)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لبرل ازم کی سب سے نمایاں اور اہم خصوصیات میں سوچ اور عمل کی آزادی اور تنوع کو تسلیم کرنا شامل ہے۔سوچ اور عمل کی آزادی کے بارے میں قرآن اور حدیث کے احکام بہت واضح ہیں۔ان میں ہر چیز کو حلال قرار دیا گیا ہے سوائے ان چیزوں کے جن کے نقصانات ان کے فوائد سے زیادہ ہوں۔اسلام میں بعض چیزوں کو واضح طور پر حرام قرار دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام چند رسومات اور عبادات کا یا زندگی کے بے لچک قواعد کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ہمہ پہلو طریقہ زندگی ہے۔اسلام لوگوں کو اپنی زندگیوں کے لیے بنیادی اصول فراہم کرتا ہے۔اس بعد لوگوں کو آزادی ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت، مقام اور حالات کے مطابق زندگی گزاریں۔

قرآن، حدیث اور صحابہ کرام کے اجماع کے علاوہ اسلام میں اجتہاد کا راستہ بھی کھلا رکھا گیا ہے تاکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نئے حالات سے مطابقت پیدا کی جا سکے۔

اسلام تحقیق اور غور وفکر کو اہمیت دیتا ہے۔رسول پاک ﷺ کی ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ

”مجاہد کو دوہرا ثواب ملتا ہے اگر اس کی سوچ اور فکر اسے درست نتائج تک پہنچائے۔اگر وہ درست نتائج تک نہ بھی پہنچے تب بھی اسے ثواب ملتا ہے“۔

اس حدیث میں یہ بات واضح ہے کہ لوگ اپنے اپنے انداز فکر اور حالات و واقعات کی وجہ سے مختلف نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں مسلمانوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے، وہاں مسلمان علماء نے ہر زمانے میں اس کی تشریح و توضیح کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔یہ تفسیریں ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو محض اس وجہ سے کہ یہ مختلف ادوار میں لکھی گئی ہیں۔انہیں مختلف علما نے لکھا (جن میں سے ہر ایک کا علم بہت وسیع تھا مگر انہوں نے اپنے اپنے پس منظر کے مطابق اور مختلف پہلوؤں سے قرآن کی تفسیر کی) اور ان کا سیاق وسباق بھی مختلف تھا۔اس کے باوجود ان نقطہ ہائے نظر کو نہ صرف یہ کہ تسلیم کر لیا گیا بلکہ تمام بعد میں آنے والے علماء وفقہا اپنے پیشروؤں سے رہنمائی بھی پاتے۔یہ بات واضح ہے کہ کوئی جامد فلسفہ جو لوگوں کی زندگی پر چند مخصوص پابندیاں عائد کر دے بدلے ہوئے وقت اور حالات میں قابل عمل نہیں ہو سکتا۔

اسلام افکار کے تنوع اور کثرت کو زندگی کی اٹل حقیقت کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔اسی طرح اسلام کے لیے ممکن ہے کہ وہ سماجی اور انفرادی تعلقات کے بارے میں اپنی تعلّامات کو برقرار رکھے جو تنوع اور اقسام کا برابری، باہمی احترام اور مشاورت اور سماجی انصاف کا خوبصورت ملاپ پیش کرتی ہیں۔

”اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت کے جوڑے سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں بنایا۔تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو (نہ کہ ایک دوسرے سے نفرت کرو) بے شک اللہ کے نزدیک تم سب میں زیادہ عزت والا وہی ہے جو سب سے زیادہ نیک ہو“۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انفرادی تعلقات کے حوالے سے اسلام کی تعلیمات کا ایک واضح پہلو یہ ہے کہ اس میں حقوق العباد پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کی تعلیمات جامع اور ہمہ پہلو ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کا انفرادی تعلقات، اجتماعی بہبود اور اس کے لیے فرد کے کردار پر زور اس قدر وسیع اور جامع ہیں کہ لبرل ازم اس میں پیچھے رہتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ پڑوسی، مسافر، حاجت مند، غریب اور ماتحت کے حقوق کے سلسلے میں اسلام مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ اسلام بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ کسی عقیدے اور خیالات کے امتیاز کے بغیر اچھے سلوک اور ان کی مدد کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلام جو ہدایت دیتا ہے وہ نہ صرف ایسے اعمال سے منع کرتی ہے جو معاشرے یا فرد کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں بلکہ ایسے اعمال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو فرد کی یا سماجی گروہ کی بھلائی کے لیے کیے جانے چاہئیں۔ اسلام کا نکتہ نظر یہ ہے کہ انسان کو دوسروں کی جانب سے اس پر عائد کردہ فرائض ادا کرنے چاہئیں خواہ یہ فرائض انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ بجائے اس کے کہ صرف اپنے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ یہ نکتہ نظر تمام لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی انتہائی پرامن انداز میں ضمانت دیتا ہے۔ یہ وہ انداز فکر ہے جو ''بہترین کی بقاء'' کے نظریے کو غلط قرار دیتا ہے اور کمزور ترین (فرد یا سماجی گروہ) کو وہ کچھ دیتا ہے جو اس کا حق ہے۔

اسی پر بس نہیں بلکہ اسلام دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینے کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اسلام محض بنیادی حقوق بشمول حق ملکیت، کاروبار کرنے کی آزادی، آزادی عمل اور آزادی اظہار وغیرہ کو تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے عقائد اور احساسات کے احترام کا حکم بھی دیتا ہے۔ خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ دوسروں کے احساسات و جذبات کا احترام تبھی ممکن ہے جب برداشت، رواداری اور فراخدلی کے اصولوں کی پابندی کی جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔ رسول ﷺ نے نہ صرف غصہ کرنے سے سختی سے منع کیا ہے بلکہ یہ ہدایت بھی دی ہے کہ غصے پر کیسے قابو پایا جائے۔ اس سلسلے میں قرآن اور احادیث کی تعلیمات نہایت واضح اور قابل قدر ہیں:

''نیک ہیں وہ لوگ جو غصے پر قابو رکھتے ہیں اور دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں''۔

''اگر تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے چاہیے کہ وہ خاموش ہو جائے''۔

''اگر تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اگر وہ کھڑا ہے تو اسے چاہیے کہ بیٹھ جائے اس طرح اس کا غصہ دور ہو جائے گا۔ اگر اس کا غصہ کم نہیں ہوتا تو وہ لیٹ جائے''۔

(رسول ﷺ نے طیش کی حالت میں بیٹھ جانے اور لیٹ جانے کو کہا تاکہ غصے میں آدمی وہ کچھ نہ کر جائے جس پر بعد میں اسے پچھتاوا ہو)

ایک روز آنحضرتؐ کے پاس ایک شخص آیا اور ان سے نصیحت کرنے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے کہا ''غصہ نہ کیا کرو''۔ اس آدمی نے اپنی درخواست کئی مرتبہ دہرائی اور ہر مرتبہ رسول ﷺ نے وہی جواب دیا۔ ''غصہ نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا کروں"۔ ایک اور روایت کے مطابق اس آدمی نے کہا کہ "میں نے غور کیا کہ رسول ﷺ نے کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ غصہ بہت ہی برائیوں کی جڑ ہے"۔

اس حوالے سے چند مزید احادیث کا تذکرہ کرنا نہایت مناسب ہوگا۔ رسول ﷺ نے فرمایا:

"طاقتور وہ نہیں جو دوسروں پر (پہلوانی میں) قابو پا سکے بلکہ وہ ہے جو غصے میں اپنے آپ پر قابو پا سکے"۔ "اگر کوئی صبر کا مظاہرہ کرے اور معاف کر دے تو یہ واقعی بہت بڑی بہادری ہے اور معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت کا اظہار ہے"۔

سماجی اور انفرادی تعلقات کے حوالے سے اسلام کی تعلیمات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خیرات اور رضا کارانہ خدمت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ معاشرے میں جو لوگ خوشحال ہیں ان سے کہا گیا ہے کہ وہ معاشرے کی بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور ضرورت مندوں اور کمزوروں کی مدد کریں۔ اسلام کہتا ہے کہ ان کے اچھے کام کی جزا ان کی زندگی میں ہی ختم نہیں ہوگی بلکہ آنے والے لوگ ان کے کام سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ اس لیے (صدقہ جاریہ کے حوالے سے) ایسے طویل مدت اور دیرپا اثرات کے حامل کاموں اور منصوبوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جن کا فائدہ آئندہ نسلوں کو بھی پہنچتا رہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ زکوٰۃ جو کہ فرض عبادت ہے وہ سال بھر کی فاضل دولت کا صرف اڑھائی فیصد ہے۔ یہ ایک پیمانہ ہے کہ اسلام نجی ملکیت کو کیا اہمیت دیتا ہے اور اس پر صرف معمولی سا ٹیکس عائد کرتا ہے جبکہ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ رضا کارانہ طور پر خود اپنی مرضی سے اور گنجائش کے مطابق خیرات کی جائے۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ کے ذریعے اکٹھی ہونے والی رقم کو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ پہلے اسلام کی تعلیمات اور سیاسی نظام میں لبرل ازم کے سیاسی تصورات کا جائزہ لیا جائے۔

لبرل ازم کا فلسفہ کوئی جامد چیز نہیں ہے جس کی ایک بار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تشریح کر دی گئی ہو۔ سترہویں صدی میں ایک فلسفہ زندگی کے طور پر ظہور پذیر ہونے کے بعد سے یہ ارتقائی حالت میں ہے اور اس حوالے سے کئی ارتقائی مراحل سے گزرا ہے۔ دنیا کے بہت سے علاقوں میں مشکل حالات کی وجہ سے اس کا ارتقاء پوری دنیا میں یکساں نہیں ہوا۔ تاہم لبرل ازم کا مطلب عمومی طور پر ایسا نظام ہے جس میں لوگ آزادی سے ایک آزاد معاشرے میں رہتے ہوں جہاں ان کے حقوق محفوظ ہوں اور ان کی تمام آزادیوں کا احترام کیا جاتا ہو۔ ان حقوق میں اظہار رائے کی آزادی، اختلاف رائے کی آزادی، نجی ملکیت کی آزادی، کاروبار اور مساوی مواقع کے حصول کی آزادی، معلومات تک رسائی کا حق اور ہر فرد کے لیے تعلیم اور ترقی یکساں مواقع کا حق شامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں لبرل ازم ایسا نظام ہے جس میں افراد پر ریاست اور اس کے اداروں کی طرف سے کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزادی کے اس تصور کے پیچھے جو فلسفہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی ترقی اور نشو ونما کے لیے اسے اپنی صلاحیتوں کو استعمال میں لانے کی آزادی ملنا ضروری ہے۔ سوچ اور عمل کی آزادی سے ہی علم، ثقافت، سیاسی نظام، معیشت اور دوسرے تمام شعبوں میں ترقی ممکن ہے۔ اپنی ظاہری کشش کے باوجود لبرل خیالات کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہر فرد واقعی میں مکمل آزادی کے ساتھ رہ سکتا ہے؟ یہ بات واضح ہے کہ ایسا ناممکن ہے کیونکہ ایک فرد کی مکمل آزادی دوسرے کی آزادی کو کم کرنے کا باعث بنتی ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے طاقتور لوگ کمزوروں کو ان کے حقوق سے محروم کردیں گے۔ اس سے معاشرے کا امن تباہ ہو جائے گا اور ایسی صورت حال جنگل کے قانون کی حکمرانی سے زیادہ کچھ مختلف نہیں ہوگی۔ اس لیے کیا یہ درست ہے کہ لبرل ازم کے تصورات پر ایسے نظام میں عمل نہیں کیا جاسکتا جو مکمل آزادی کے اصول پر قائم ہو؟

انسان کی آزادی پر کچھ پابندیاں لبرل ازم میں قابل قبول ہیں تاکہ ایک فرد کو دوسرے کی آزادی میں مخل ہونے سے روکا جائے۔ اسی لیے لبرل ازم لوگوں کے منظم ہونے کے حق کی حمایت کرتا ہے اور ایسے سیاسی نظام کو ضروری قرار دیتا ہے جو معاشرے میں نظم وضبط قائم کرے اور اس کے ارکان کے حقوق کا تحفظ یقینی بنائے۔ ایسا نظام جس میں سوچ اور عمل کی آزادی ہو مگر جہاں سب لوگوں پر قواعد اور ضوابط کا اطلاق بھی ہوتا ہو اس لیے لبرل سیاست ہمیشہ جمہوریت کے فروغ کے لیے کوشش کرتی ہے۔ ایسی ریاست کے قیام کی حمایت کرتی ہے جس میں قوانین اور قواعد وضوابط کا احترام کیا جائے اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو جس میں ریاستی ادارے نظام کی کارکردگی پر نظر رکھیں مگر معاشی اور سماجی میدان میں افراد سے مسابقت نہیں کریں۔

لبرل ازم کو جغرافیائی حدود میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک عالمگیر معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اور ایسا نظام تشکیل دینا چاہتا ہے جس میں مقامی اور غیر مقامی کا فرق نہ ہو جہاں رابطوں، باہمی تعاون اور خیالات، مہارتوں اور معلومات کے تبادلے کی مکمل آزادی ہو اور جہاں دنیا کے تمام لوگوں کے درمیان آزادانہ اور منصفانہ مسابقت کی فضا قائم ہو۔ یوں بنیادی طور پر لبرل ازم کے تصورات اسلام کی تعلیمات اور خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ دراصل اسلام نے آج سے چودہ سو برس پہلے یہ تصورات پیش کردیے تھے۔

اسلام کا یہ تصور کہ انسان کی آزادی فکر وعمل انفرادی اور اجتماعی آزادی کی کلید ہے بشرطیکہ اس میں دوسرے کی آزادی میں مخل نہ ہوا جائے، لبرل تصورات کی بھی روح ہے۔ اسلام منصفانہ سماجی نظام قائم کرکے افراد کے حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور اس سماجی نظام کے لیے اسلام بنیادی رہنما اصول طے کردیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام دوسرے مذاہب سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ یہ صرف رسوم ورواج کا مجموعہ نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی مہیا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ حقوق کی بحث میں اسلام دوسرے نظاموں سے آگے ہے کیونکہ یہ جانوروں کے حقوق اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُن سے رحم دلی کے سلوک کی بات کرتا ہے۔ اسلام میں انسان حقوق کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے مگر وہ اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر مظاہر فطرت، قدرتی وسائل اور ہر جانور اور غیر موذی جاندار کے تحفظ پر بھی زور دیتا ہے۔

اسلام سیاسی میدان میں جو آزادی دیتا ہے اور جس قسم کے تحفظ کی بات کرتا ہے وہ ہمہ پہلو ہے۔ اسام کا پیغام ہے آفاقی ہے جو ہر زمانے اور ہر مقام کے لوگوں کے لیے ہے یعنی تمام لوگوں کے لیے تمام زمانوں میں اسلام کا پیغام سچا اور قابل عمل ہے۔ اس کے باوجود اسلام لوگوں کو آزادی دیتا ہے کہ وہ جو چاہیں عقیدہ اختیار کریں۔ قرآن پاک میں کئی جگہ پر کہا گیا ہے کہ انسان کو اپنا مذہب چننے کی آزادی ہے اور یہ کہ اس سلسلے میں کوئی زور اور زبردستی نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ:

''اگر اللہ چاہتا تو وہ تم سب کو ایک ہی سماجی گروہ بنا دیتا مگر اس نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ وہ تمہیں آزما سکے اس سے جو اس نے تمہیں دیا ہے...... تمہارے لیے تمہارا راستہ اور میرے لیے میرا ساتھ''۔

عقیدے میں ایک دوسرے سے اختلاف کا حق تمام لوگوں کے لیے یکساں ہے۔ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام لوگوں کو یکساں مواقع فراہم کرے۔ عقیدے، رنگ، نسل وغیرہ کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جانا چاہیے۔ ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ مذہب کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں ہے اور غیر مسلموں کے جان، مال، عزت و آبرو بھی اتنی ہی قابل احترام ہے جتنی مسلمانوں کی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جو کوئی بھی ایک شخص کو قتل کرتا ہے وہ سوائے اس کے کہ وہ معاشرے میں بدی یا قتل کے خاتمے کے لیے ہو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کیا اور اگر اس نے ایک کی جان بچائی تو ایسا ہی ہے کہ اس نے پوری انسانیت کو بچایا۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرقہ واریت سے نجات کا راستہ

(ڈاکٹر مہدی حسن)

پشاور کے امام بارگاہ میں دہشتگردی کی حالیہ واردات نے ایک بار پھر واضح کر دیا ہے کہ مذہب کے نام پر قتل و غارت گری اور تخریب کاری کا بازار گرم کرنے والوں کا مقصد ملک میں رائج ناکام سیاسی نظام اور حکمرانوں کی طرف سے امریکی خواہشات کی تکمیل کے خلاف احتجاج تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ عناصر مذہب کی ایک بہت محدود تشریح پر عمل پیرا ہیں اور اس عقیدے پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ جو لوگ ان کے عقائد سے اتفاق نہیں کرتے انہیں زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ سیاست کے میدان میں یہ اعلانات کہ پاکستان میں تمام تر انتشار اور بدامنی جنرل مشرف کی امریکہ کی اطاعت قبول کر لینے کی وجہ سے ہے۔ اس لئے آدھا سچ ہے کہ سوات میں انتہا پسندوں کا اقتدار جنرل مشرف کے اقتدار پر قبضے سے بہت پہلے شروع ہو گیا تھا۔ 2001 میں امریکہ کے افغانستان پر حملے سے بہت پہلے پاکستان میں فرقہ وارانہ بنیاد پر رونما ہونے والے واقعات میں گزشتہ تیس سال کے دوران تقریباً پانچ ہزار افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ پشاور کے حالیہ بم دھماکے سے قبل کئی ماہ سے پارا چنار میں فرقہ واریت کی وجہ سے حالات انتہائی کشیدہ ہیں۔ لہذا سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کی طرف سے انتہا پسندی کی بھرپور مذمت اور ان واقعات کے رونما ہونے کے بعد معذرت خواہانہ بیانات اس انتہائی سنگین مسئلے کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہیں۔

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ تشویشناک حد تک بڑھتی ہوئی فرقہ واریت فوجی آمر ضیاء الحق کی ان کوششوں کا نتیجہ ہے جو انہوں نے نفاذ اسلام کے نام پر مخصوص عقائد کو قوم پر مسلط کرنے کے لیے کی تھیں جنرل ضیاء الحق کم علمی اور تاریخ کے محدود اور تعصب زدہ مطالعہ کی وجہ سے ان تاریخی حقائق سے ناواقف تھے جن کا ادراک بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو بہت اچھی طرح تھا۔ انہوں نے 14 اگست کو دستور ساز اسمبلی کے تاسیسی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کی ریاست کے وجود میں آنے سے تین دن پہلے قوم کو خبردار کر دیا تھا کہ اگر پاکستان کی سیاست میں مذہب کا عنصر شامل ہو گیا تو نہ صرف مسلم اور غیر مسلم کا سوال موجود رہے گا بلکہ ان کے کہنے کے مطابق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خود مسلمانوں میں شیعہ، سنی کے اختلافات کے علاوہ ذات پات کے حوالے سے پٹھان، راجپوت، چوہدری اور اسی قسم کے دیگر تعصبات قوم کے لئے نقصان دہ ثابت ہوں گے۔ انہوں نے اس سلسلے میں انگلستان کی مثال بھی دی تھی جہاں چند سو سال پہلے مذہب کے استعمال کی وجہ سے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے اختلافات قتل و غارت گری کا سبب بنتے رہے۔

برصغیر میں مسلمان معاشرے کی ساخت دیگر مسلمان ملکوں سے مختلف ہے ایران، سعودی عرب، لیبیا یا ترکیہ میں مسلمانوں کی غالب اکثریت اپنے اپنے مخصوص فقہ پر عمل کرتے ہیں لہذا وہاں پر کسی ایک فقہ کے نفاذ کے لیے کوئی بڑا تنازعہ پیدا نہیں ہوتا لیکن برصغیر میں مخصوص تاریخی پس منظر کی وجہ سے مسلمان آبادی میں مختلف اسلامی فقہ کو ماننے والوں کی تعداد میں کوئی ایک فرقہ بہت بڑی اکثریت میں نہیں ہے۔ اس لئے پاکستان، بھارت یا بنگلہ دیش جب بھی اسلامی نفاذ کے نفاذ کی بات کی جائے گی تو یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ ''کونسا اسلامی نظام'' نافذ ہو رہا ہے مثال کے طور پر برصغیر کی سرزمین پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں صوفی بزرگ اور اولیاء دفن ہیں ان میں سے کچھ بزرگوں کے مزارات ایک بہت بڑی تعداد کے لئے مقدس زیارت کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ان مزارات میں آنے والوں میں غیر مسلم بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد مزاروں پر جانے والوں کے عقیدے پر شدید اعتراض کرتی ہے جنرل ضیاء کے دور میں اسی مکتبہ فکر والوں کا بول بالا تھا اس وقت خود سنی فرقہ میں ''یا رسول اللہ'' کانفرنس کے موقع پر دو مختلف عقائد رکھنے والے اہلسنت کے گروہوں میں بڑا فساد برپا ہوا تھا۔

پاکستان میں اس مسئلے کا پہلا مظاہرہ 1953 میں اس مذہبی فساد کے موقع پر ہوا تھا جب مجلس احرار کی احمدی عقائد رکھنے والوں کے خلاف تحریک تشدد کا رنگ اختیار کر گئی تھی اور لاہور میں امن وامان کی بحالی کے لئے مارشل لاء نافذ کرنا پڑا تھا۔ ان فسادات کے بعد عدالتی تحقیقات کے دوران جسٹس منیر احمد اور جسٹس رستم کیانی پر مبنی عدالتی کمیشن نے مسلمانوں کے مختلف مسالک کے متعدد نامی گرامی علماء کو عدالت میں طلب کر کے ان سے اسلام کی تعریف کرنے کو کہا تھا۔ ان دو جج صاحبان نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ یہ علماء کئی دنوں کی بحث کے بعد بھی اسلام یا مسلمان کی کسی ایک تعریف پر متفق نہیں ہو سکے۔ یہ تحقیقاتی رپورٹ ایک پبلک دستاویز ہے اور آسانی سے بازار میں دستیاب ہے۔ جنرل ضیاء الحق ان تمام حقائق سے بے خبر تھے یا اپنے عقائد کے بارے میں زیادہ متعصب تھے کہ انہوں نے پاکستانی معاشرے کو اپنی خواہش کے مطابق اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی جو کوشش کی اس نے معاشرے کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر بری طرح تقسیم کر دیا اس کے ساتھ ہی افغانستان میں کامیاب کمیونسٹ بغاوت کے بعد امریکہ کی مسلط کردہ جنگ میں پاکستان کے ملوث ہونے کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہو گئے کیونکہ امریکہ کے نفسیاتی جنگ کے ماہرین نے یہ جنگ مذہب کے نعرے ''جہاد'' پر شروع کی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افغانستان کے وہ سادہ لوح مسلمان جو لاکھوں کی تعداد میں پاکستان میں منظم تھے اور آج تک موجود ہیں انہوں نے اس جنگ کو اسلام کی خدمت سمجھتے ہوئے بڑے خلوص سے امریکی مقاصد پورے کیئے۔ امریکہ کی مسلط کی گئی اس جنگ کے دوران پاکستان کی سرزمین پشاور سے کراچی تک ایک اسلحہ خانہ میں تبدیل ہوگئی اور امریکی جہاد کے لیے اسے اسلحہ کے انبار بہت آسانی سے پاکستان کے ان شرپسندوں کی دسترس میں آ گئے جو افغان جہاد میں شریک تھے۔ جدید ترین اسلحہ سے لیس امریکہ اور پاکستان کے ماہرین کے تربیت کردہ ان عناصر کی وجہ سے فرقہ واریت ایک سنگین شکل اختیار کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں مسلمانوں کو گزشتہ پچیس برسوں سے مسجدوں میں نماز مسلح محافظوں کے حصار میں ادا کرنی پڑتی ہے اور محرم کے جلوس بازاروں میں خاردار تاروں کی باڑ لگا کر کرفیو کا سا ماحول بنا کر نکالے جاتے ہیں۔ جنرل ضیاء کے دور سے پہلے محرم میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جس رواداری کا مظاہرہ ہوتا تھا وہ آج کے ماحول میں قصے، کہانیوں یا خوابوں کی بات لگتی ہے۔ اب مسجدوں، امام بارگاہوں مختلف مزاروں اور درگاہوں پر جانے کے لیے میٹل ڈیٹیکٹرز سے گزرنا پڑتا اور تلاشی دینا پڑتی ہے۔

ان سنگین مسائل کا حل محمد علی جناح کے بنائے ہوئے اصولوں کو اپنانے میں ہے پولیس، رینجرز اور فوج کو کہاں کہاں تعینات کیا جائے گا۔ مسجد، امام بارگاہ اور درگاہیں تو پہلے ہی مسلح پہرے میں ہیں۔ کیا اب حجاموں کی دکانیں، وڈیو اور سی ڈی شاپس اور درزیوں کی دکانوں پر بھی مسلح پہرے دار تعینات کیئے جائیں گے۔ اصل مسئلہ ان عناصر کی سوچ تبدیل کرنے کا ہے جنہیں مذہب کے نام پر یہ سبق امریکہ اور ضیاء الحق کے پالیسی سازوں نے پڑھایا تھا اور یہ سوچ اب حکمرانوں کی کمزوری اور سیاسی جماعتوں کی لاتعلقی کی وجہ سے پھل پھول رہی ہے۔ عوام کو چاہے کہ وہ ایسے تمام عناصر اور تنظیموں کو مسترد کر دیں جو مذہب کے نام پر اسلام، ملک اور قوم کی بدنامی کا سبب بن رہی ہیں اور اپنے اللہ سے اپنے تعلق میں کسی اور کو دخل دینے کی اجازت نہ دیں، یہ ہر فرد کا اپنا انفرادی فیصلہ ہے اور اسے اس بات کا حق بھی ہے کہ وہ اپنے خالق سے کس قسم کا تعلق رکھتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھٹا باب

(مختلف مذاہب میں انسانی حقوق کا تصور)

- انسانی حقوق کا تصور، مذہبی اور تاریخی پس منظر (پروفیسر رفیق محمد)
- مذاہب میں انسان کی عظمت اور حقوق کا تصور (عدنان عادل)
- اقلیتوں کو درپیش مسائل کو مذہبی نہیں سیاسی بصیرت سے دیکھنے کی ضرورت (آئی۔اے۔رحمٰن)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسانی حقوق کا تصور، مذہبی اور تاریخی پس منظر

(پروفیسر رفیق محمد)

انسان کے حقوق کی بات جتنی سادہ لگتی ہے اتنی ہے نہیں۔ انسان جس معاشرے میں رہتا ہے اسکا اثر اسکی سوچ پر پڑنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ہم اسلامی معاشرے میں رہتے ہیں تو اسلامی نظریے کی طرف دھیان جائے گا۔ اور ہم اسلامی نظریے کو ہی معیار سمجھتے ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے۔

لیکن کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ ہم اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی عالمی ثقافت سے دور نہیں رہ سکتے؟ اب یہ دیکھنا ہے کہ عالمی ثقافت کیا ہے اور کیا اس سے بچا جا سکتا ہے؟ اس اجتناب کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہم اسلامی ثقافت کو عالمی ثقافت سے غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ اور ہم اس خوف میں مبتلا ہیں کہ اسلامی ثقافت عالمی ثقافت کا مقابلہ اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک ہم ارادی طور پر اسلامی ثقافت پر محافظ بن کر کھڑے نہ رہیں۔ گویا مسلمان کا کام یہ رہ گیا ہے کہ وہ ہر وقت اس فکر میں مبتلا رہے کہ اسلامی ثقافت کسی طرح عالمی ثقافت کے نرغے میں نہ آ جائے۔ اور یہ فکر اس لئے دامن گیر ہے کہ عالمی ثقافت موجود ہے۔ اور اس لئے بھی کہ اسلامی ثقافت ہر نئے ماحول میں ایک دائمی خطرے سے دوچار ہے۔ ہم اس مغالطے میں جب تک رہیں گے اپنی سوچ کو مثبت انداز دینے سے قاصر رہیں گے۔

مثبت سوچ کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہر ماحول کو نعمت سمجھیں البتہ جو اعمال اخلاق اور اخلاص سے عاری ہوں ان سے اجتناب کریں۔ کیا عالمی ثقافت میں بالکلیہ صرف بری اقدار ہی روا رکھی گئی ہیں یا معاملہ کچھ اور ہے؟

آیئے دیکھیں کہ عالمی ثقافت کیا ہوتی ہے اور یہ کس طرح وجود میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ ہر روز ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ یہ نئی شان کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا وطیرہ بنایا ہے؟ یہ نئی شان اسکی دمادم تخلیق ہے۔ یہ وہی کن فیکون ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنا تخلیقی وطیرہ فرمایا ہے۔ کیا مسلمان کبھی سوچ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے عمل کو خیر باد کہہ کے کائنات میں جمود کو اسکا مقدر بنا دے گا؟ اگر مسلمان کا ایمان سلامت ہے تو اسکی سوچ کبھی ایسی نہیں ہوسکتی۔

لیکن بصد افسوس کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان اللہ تعالی کی اس تخلیق کو صرف مادی سطح پر جاری رکھنے کا قائل رہ گیا ہے۔ معنوی اور جمالیاتی سطح پر تخلیق کو مسلمان یا تو سمجھ نہیں پاتا یا سمجھنا نہیں چاہتا۔ انسان کے بارے میں خدا کا یہ ارشاد مسلمان کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اے انسانو تم ضرور بالضرور ایک سطح سے اگلی سطح پر جاؤ گے۔ لترکبن طبقاعن طبق (س:۸۴آ۔۱۹)۔ انسانوں کا یہ کونسا ارتقاء ہے جس پر انہیں بہر صورت جانا ہے۔ کیا یہ صرف جسمانی اور مادی ارتقاء ہے یا اس میں اسکی شعوری اخلاقی اور جمالیاتی سطحیں بھی شامل ہیں؟ اگر یہ بھی انسانی ارتقاء کا حصہ ہیں تو پھر کیا عالمی ثقافت میں انسان ان جہتوں پر آگے نہیں بڑھ رہا؟ کیا مکان بنانے سے لیکر اعلی انسانی رویوں تک عامی انسانی ثقافت انفرادی سطح سے بلند ہوکر اجتماعی سطح کو چھونے کی کوشش میں نہیں ہے؟

آج جو اجتماعی ادارے مثال کے طور پر یو این او اور یو ایس ایف تشکیل پاچکے ہیں کیا ان کا تصور آج سے ایک ہزار سال قبل کیا جاسکتا تھا؟ آپ ان اداروں کی کارکردگی پر حرف گیری کرسکتے ہیں لیکن انکی افادیت سے انکار نہیں کرسکتے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ ادارے انسانی حقوق کی بازیابی میں جو کام کررہے ہیں اور جس سطح پر کررہے ہیں کیا عالمی ثقافت کے تصور سے پہلے یہ ممکن تھا؟ اور اگر یہ عالمی ادارے اپنے کام میں مصروف ہیں تو کیا انہیں انسان کی ترقی قرار دیا جائے گا یا تنزل؟ اور کیا یہ قرآن کی اس آیت کی تعبیر سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں؟ اور اگر رکھتی ہے تو پھر یہ معرکہ خدا کی اس تخلیق اور حکمت کا حصہ ہے یا نہیں؟ اسلام کے اعلی تصور حیات کے تحت دیکھیں تو انسان کا ایک مرحلہء ثقافت سے اگلے مرحلہء ثقافت کی طرف سفر کرنا خدائی منصوبہ ہے۔ اور اس میں نہ تو کچھ غیر اسلامی ہے اور نہ کچھ غیر انسانی۔

اگر عالمی ثقافت ایک خدائی تخلیق کے سوا کچھ نہیں ہے تو کیا مسلمان کا وہ رویہ جس کے تحت وہ عالمی شعور اور عالمی ثقافت سے خوفزدہ لگتا ہے درست ہوا یا غلط؟

مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں رہے گا کہ انسانی حقوق کی بحث بھی آج کے عالمی ثقافتی تناظر کے بغیر ادھوری رہے گی۔ اور یہ کہ یہ بات اسلامی سوچ سے غیر ہم آہنگ نہیں ہے۔ نیز یہ کہ حقوق کی معرفت عالمی تناظر میں ہونی چاہئے اور یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ اگر بازیاب شدہ حقوق انسانیت کے اعلی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں تو اسلام کے ان اعلی تقاضوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس بارے میں اگر کسی کے ذہن میں کچھ ابہام ہو تو آیئے قرآن کے اس خالص انسانی رویے کی طرف نگاہ کریں جو اسنے انسانی رویوں کی درستگی کیلیئے اختیار کیا ہے۔ قرآن کا فرمان ہے لیس للانسان الا ما سعی (۵۳۔۳۹) یعنی انسان کو وہی کچھ حاصل ہوگا جسکی اسنے کوشش کی ہوگی۔ یہ ایک خالصتاً انسانی معیار پر کی ہوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نصیحت ہے۔اس میں اگر کچھ گہرائی کا عنصر ہے تو اس قدر کہ کوشش کرتے وقت انسان میں خلوص اور اعلیٰ پن کا ہونا ضروری ہے۔ یہ بات اس لئے کہی جارہی ہے کہ قرآن مجید انسان سے تخاطب میں انسان کی روحانیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔یعنی انسان کا اعلیٰ پن اور اعلیٰ معاشرتی تقاضے پیش نظر ہوں تو انسان کا کیا ہوا کام اسلامی زبان میں ایک خدائی کام بن جاتا ہے۔ہاتھ ہے اللہ کا بندہء مومن کا ہاتھ۔صرف یہی نہیں قرآن اس سے بھی ایک ہاتھ آگے جاتا ہے۔

وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ کہ کر اللہ تعالیٰ نے انسان کی نیک نیتی کو بھی اپنی نیت قرار دیا ہے۔اس میں کیا راز ہے یہ جاننے کے لئے ہمیں ابھی چار قدم اور آگے جانا پڑیگا۔اس مقدمے میں جو اصل نکتہ ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشیئت کا حقدار کس کو قرار دیا ہے۔آیت کا لفظی ترجمہ اردو میں کچھ یوں ہے۔

اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔اس عبارت سے اردو اور عربی دونوں میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ بندہ چاہے تو اللہ چاہیگا اور یہ بھی کہ اللہ کے چاہے بغیر بندہ نہیں چاہ سکتا۔یہ آیت قرآن مجید میں دو مرتبہ آئی ہے۔ ایک کا سیاق یہ ہے کہ سورہ انسان میں:

نحن خلقنٰھم وشددنا اسرھم واذا شئنا بدلنا امثالھم تبدیلا۔ان ھذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا۔وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ ان اللہ کان علیما حکیما۔

یعنی ہم نے ان لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ مضبوط کیئے ہیں۔اور جب چاہیں ان جیسے اور پیدا کردیں۔بیشک یہ ایک نصیحت ہے۔بس جو چاہے اپنے رب کی طرف راہ اپنا لے۔اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

دوسری مرتبہ یہی الفاظ سورہ التکویر میں اس طرح آئے ہیں:

ان ھو الا ذکر للعلمین۔لمن شاء منکم ان یستقیم۔وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العالمین۔

یعنی یہ قرآن تمام جہانوں کیلئے نصیحت ہے۔ہر اس شخص کیلئے جو استقامت چاہتا ہے۔اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔وہ تمام جہانوں کا رب ہے۔

ان مقامات کے سیاق کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسان کا کسی عمل پر آمادہ ہونا خود انسان پر بھی ہے اور اللہ تعالیٰ پر بھی ہے۔گویا دونوں کا چاہنا کسی عمل کی وجہ بنتا ہے۔آیئے ایک مرتبہ پھر علامہ اقبال کی طرف رجوع کریں اور دیکھیں کہ وہ اس گتھی کو کیسے سلجھاتے ہیں۔

علامہ کے نزدیک اللہ اور انسان کے درمیان جو رشتہ ہے اسے علامہ نے انسانی خودی اور اللہ کی خودی کے درمیان رشتے سے تعبیر کیا ہے۔وہ اللہ تعالیٰ کو بھی ایک خودی قرار دیتے ہیں اور انسان کو بھی۔ان دونوں میں فرق اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ لامحدود خودی ہے اور انسان ایک محدود خودی ہے۔یہ خیال ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ماخوذ ہے۔جس میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا:

فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین۔ (۱۵۔۲۹) یعنی اے فرشتو جب میں آدم میں اپنی روح پھونک دوں تو تم آدم کیلئے سجدے میں گر جاؤ

علامہ انسان اور خدا دونوں کی روح کو ایغو سے تعبیر کرتے ہیں اور ان میں صرف محدود اور لامحدود کا فرق روا رکھتے ہیں۔ اسی لئے انسان کے اپنے گہرے باطن سے چاہنے کو خدا کا چاہنا قرار دیتے ہیں۔ یوں بھی دیکھا جائے تو اس آیت کا اور کوئی معقول مفہوم نہیں بنتا جس میں انسان کے چاہنے کو خدا کے چاہنے پر منحصر قرار دیا گیا ہے۔ انسانی روح کو خدا نے امر ربی سے ہونا قرار دیا ہے: یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی و ما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ (۱۷۔۸۵) اگر امر رب کو روح کا سبب قرار دیا گیا ہے اور خود اپنی روح کو آدم میں پھونکا ہے تو گویا انسان میں امر کی صلاحیت بھی عطا کی ہے۔ اب اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو امر یعنی اختیار سے نوازا ہے۔ اور اصل اختیار جب صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تو اسی اصل اختیار میں سے انسان کو بھی عطا کیا ہے۔ انسان کے محدود خودی رکھنے کی وجہ سے انسان کا اختیار محدود تو ہوسکتا ہے لیکن انسان بے اختیار نہیں ہوسکتا۔

اب یہ بھی طے ہے کہ اس اختیار میں مسلمان اور غیر مسلم سب ہی شریک ہیں۔ جس طرح مسلمان اپنے اختیار کے غلط استعمال پر سزا کا مستحق ہوتا ہے اسی طرح غیر مسلم بھی اختیار کے غلط کے استعمال پر سزا پاتا ہے۔ تمام اخلاقی عیوب مسلم اور غیر مسلم کیلئے برابر کے عیوب ہیں۔ کیونکہ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے مذہبی نہیں۔ انسانی حقوق کے حوالے سے یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے اگر چہ مذہبی حوالہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کر رہا ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو اعلیٰ انسانی حوالوں کو نظر انداز کرسکے۔ خدا نے مذاہب اسی لئے بھیجے تھے کہ انسانی اعلیٰ پن نکھر کر سامنے آئے اور بنی نوع انسان اس اعلیٰ پن کے ذریعے اپنے خالق کے رضا حاصل کرسکیں۔

اسلام کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ﷺ کو اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کیلئے مبعوث فرمایا تھا۔ آپ کا یہ فرمان کسی مسلمان سے اوجھل نہیں ہے:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ یعنی آپ نے فرمایا کہ مجھے رسول بنا کر بھیجنے کا واحد مقصد اعلیٰ اخلاق کی تکمیل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اعلیٰ اخلاق کی بنیاد انسان کا خلوص اور انسان دوستی ہے۔ اس لئے یہ کہنے میں کچھ حرج نہیں کہ دین کی اساس اعلیٰ اخلاق ہے۔ اور کسی مذہب کے بارے میں یہ بات کہی جاسکے یا نہ لیکن اسلام کے بارے میں انتہائی وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اسکی بنیاد اصل میں اعلیٰ اخلاق انسانی ہی ہے۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں اعلیٰ اخلاق بنیادی حیثیت رکھتے ہیں تو اس میں کچھ شک نہیں رہ جاتا کہ انسانی حقوق کی بازیابی جو اعلیٰ اخلاق کا اصل ثمرہ ہیں کسی طرح اسلام کی نظر سے اوجھل نہیں رہ سکتے۔

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ اسلام دیگر مذاہب سے اس ضمن میں کیسے ممتاز ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام اپنے آپ کو دین کی اصطلاح سے متعارف کرواتا ہے۔ جس کا مفہوم فرمانبرداری کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ تعالی کے حوالے کرنا بنتا ہے۔ لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس دین نے انسان کو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے کے علاوہ اور کیا ہدایات دی ہیں۔ خود اسکی الہامی ہدایت یعنی قرآن مجید نے انسان کو کیا مقام دیا ہے۔ اور یہ بھی بہتر ہوگا کہ انسان کو خدا کی بندگی کا سبق دینے والے بڑے بڑے مذاہب نے انسان کو خدا کی فرمانبرداری کے ساتھ اور کیا ہدایات دی ہیں جن سے اس مذہب کی پہچان باقی رہتی ہے۔

ہم آریائی مذہب ہندومت سے آغاز کرتے ہیں۔ اس مذہب میں انسان میں بھی روح ہے اور پرم آتما میں بھی۔ انسانی روح کو پرم آتما میں جذب ہونا ہے لیکن اس کیلئے ہزاروں لاکھوں جنم درکار ہیں۔ انسان کو اپنی دنیاوی اغراض سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جانا ہے اور اپنے گہرے باطن کی طرف رجوع کرنا ہے جہاں خود خدا جلوہ افروز ہے۔ ہندومت میں انسانی جذبات اور اسکی جسمانی ضرورتیں اسکی دشمن ہیں ان سے بہرصورت چھٹکارا پانا ضروری ہے۔ ہندومت میں یہ سب کچھ انتہائی دھیرج سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس مذہب میں انسان جس حال میں ہے ٹھیک ہے۔ البتہ اعلی پن کی طرف سفر کرنا خود انسان کے بھلے میں ہے۔ اس لئے اپنے گہرے باطن میں جا کر جب بھی اپنی اصلیت یعنی پرم آتما سے ہمکنار ہو جائے اس کے لئے بہتر ہے۔ ہندومت میں سارا معاملہ انسان کے پہل کرنے پر منحصر ہے۔

اس مذہب کی رو سے انسانی حقوق کا سوال اتنا اہم نہیں بنتا جتنا اس کا خدا میں جذب ہونا اہم ہے۔ انسان ہر کیفیت میں زندہ ہیں اور اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ تبدیلی صرف خدا میں جذب ہونے کی طرف ہونی چاہئے اور کسی طرف تبدیلی کچھ خاص اہم نہیں۔ اس لئے کہ انسان کسی بھی حالت میں ہو وہ خدا کی طرف اپنے مقام اور منصب ہی کے لحاظ سے بڑھے گا۔ اس طرح دیکھیں تو ہندو دھرم میں انسان کی روح کی بالیدگی اور اس کا پرم آتما میں جذب ہونا تو اہم ہے لیکن اس کی معاشرتی زندگی اور اسکے دیگر حقوق کی بات پر زیادہ زور نہیں دیا گیا۔ بلکہ یہ لگتا ہے کہ انسانوں کے مختلف معیاروں اور صلاحیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں اسی ذات پات یعنی Caste system میں زندگی بھر رہنے کی تعلیم نے انسانی حقوق کو اول درجہ کی بحث نہیں مانا۔ اسکا دھیرج والا مزاج اسے ایک گونہ امتیاز تو بخشتا ہے لیکن معاشرتی اصلاح کیلئے کوئی فوری پیغام نہیں دیتا۔

بدھ مت دوسرا آریائی مذہب ہے۔ اس کے مطابق انسان ایک لامحدود صلاحیت کا مالک ہے۔ اسے اپنی اس حیثیت کو پہچاننے میں صرف ایک چیز رکاوٹ ہے اور وہ ہے اسکی خودغرضی۔ انسان کو خودغرضی سے نجات حاصل کرنے کیلئے بڑی سخت محنت اور گہرے شعور کی ضرورت ہے۔ اس کیلئے بدھ مت میں آٹھ نکات پر مبنی ایک پروگرام دیا گیا ہے جس پر گامزن ہو کر انسان اپنے آپ کو خودغرضی کے تنگ ماحول سے نکال کر لامحدود صلاحیت حاصل کر سکتا ہے۔ جسے نروان کا نام دیا جاتا ہے۔ نروان کے حصول پر انسان اپنی خودغرضی سے نجات پا کر تمام ذوی الارواح کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ ایک ہو جاتا ہے اور جو چیز اس کیلئے محدودیت کا باعث تھی اس سے نکل جاتا ہے۔ یوں اس میں ایک لامحدودیت پیدا ہوتی ہے جو اس کا اصل مقصود ہے۔ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب اچھے اور برے کی تمیز بھی مٹ جائے گی اور سب کچھ اچھا ہی اچھا ہو گا اور یہی نروان کی کیفیت ہے جو انسان کا مطلوب ہے۔ جسمانی اور شعوری وہ محنت جو نروان حاصل کرنے کیلئے از بس ضروری ہے یہی بدھ مت کا اصل پروگرام ہے۔ اس کے ثمرات کی کچھ حد نہیں ہوتی۔

بدھ مت میں اصل پروگرام ہی دوسروں کو اپنے جیسا سمجھنا اور تمام ماحول کو نروان بنانا ہے۔ اس لئے انسانی حقوق کا مسئلہ بدھ مت میں انسانی فرض ہی کی صورت میں حل ہو جاتا ہے۔ یعنی جب ہر شخص خود غرضی کی دلدل سے باہر نکل آئے گا تو حقوق انسانی از خود پورے ہونا شروع ہو جائیں گے۔ بدھ مت نے اس مقصد کے حصول کیلئے ایک بہت بڑا اقدم یہ اٹھایا کہ مذہبی پیشوائیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ مہاتما بدھ کی تعلیم یہ ہے نروان حاصل کرنے کیلئے کسی مذہبی پیشوا کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام ہر انسان کو اپنے لئے خود ہی کرنا ہے۔ یوں بدھ مت آریائی مذاہب میں یہ امتیاز رکھتا ہے کہ اس نے ہندومت کی برھمنیت سے اپنے پیروکاروں کو آزاد کر کے انفرادی طور پر نروان حاصل کرنے کی تعلیم دی۔ دوسرے تمام انسانوں کو اپنی طرح کا انسان سمجھنے کا ایک لازمی فائدہ یہ ہوا کہ بدھ مت میں مذہبی پیشوائیت کی ضرورت نہ رہی۔ اگرچہ مہاتما بدھ کے بعد اس کی گنجائش پھر نکال لی گئی۔

آیئے اب کچھ بات سامی مذاہب کی ہو جائے۔ ان میں سب سے پرانا مذہب یہودیت ہے۔ اس مذہب میں خدا کی توحید کی بات بڑی شد و مد سے کی جاتی ہے اور خدا کے احکام پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید پائی جاتی ہے۔ یہ مذہب جتنا زور خدا کے حکم پر دیتا ہے اور کسی بات پر نہیں دیتا۔ کیونکہ خدا کا حکم یعنی Commandment ہی ان کے ہاں سب سے اہم چیز ہے اس لئے خدا کے حکم پر عمل کرنا ہر صورت میں لازمی ہے۔ خدا کی نافرمانی کا شائبہ بھی پیدا ہو جائے تو یہودیت کے لئے قابل سزا ہے۔ جس سختی کا تقاضا اس مذہب میں ملتا ہے اسکی وجہ سے یہودی اپنے آپ کو ایک چنیدہ قوم قرار دیتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا نے اس قوم کو اس لئے منتخب کر رکھا ہے کہ ان سے ذرا سی نافرمانی بھی سخت سزا کا موجب ہوتی ہے۔ یہودی نظریے کے مطابق یہ مقام انہیں اس لئے عطا ہوا ہے کہ کوئی اور قوم اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ دنیا بھر کی اقوام کیلئے یہودی اپنے آپ کو نمونہ شمار کرتے ہیں کیونکہ جو سزا کسی قوم کو خدا کی نافرمانی پر سبق سکھانے کیلئے ملنی چاہئے تھی اس کا مظاہرہ یہودی قوم کے ذریعے کر دیا گیا ہے۔ اس لئے یہ امتیاز اسی قوم کو حاصل ہے کہ خدا نے انہیں اس عظیم کام کیلئے منتخب کیا۔

حقوق انسانی کی بات اس مذہب میں براہ راست نہیں کی گئی بلکہ اطاعت کے نتیجے کے ذریعے اس مقصود کو حاصل کیا جاتا ہے۔ حکم کے آگے اطاعت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہودیت میں حقوق کی بات اطاعت میں پوشیدہ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک اور نہایت اہم مذہب نصرانیت ہے جس کا اصل نقطہء اہمیت یہ ہے کہ نصرانیت انسان کو اس مقام عظیم کے لائق سمجھتی ہے جس پر خود خدا فائز ہے۔اس مذہب میں یہ ماننا ضروری ہے کہ جناب یسوع مسیح بہ یک وقت مکمل طور پر خدا بھی ہیں اور مکمل طور پر انسان بھی۔یوں دیکھا جائے تو یہ مذہب انسانی تاریخ میں وہ بات کھل کر کہ پایا ہے جو دوسرے مذاہب در پردہ کہتے آئے ہیں۔انسان کی مذہبی تاریخ کو غور سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مذہب انسان کو خدا سے اور خدا کو انسان سے ہمکنار کرنے کی ایک سعی ہے۔نصرانیت نے انسان اور خدا کے درمیاں حائل ہونے والے تمام پردے ہٹا دئے اور انسان کو اس پرانے تصور سے نجات دیدی جس میں انسان بنیادی طور پر گناہگار سمجھا جاتا تھا۔یہ پہلا مذہب ہے جس نے انسان کو یہ حوصلہ بخشا کہ وہ خدا سے دور نہیں ہے بلکہ خدا اگر بنی نوع انسان کے جہان میں پوری طرح جلوہ گر ہونا چاہے تو اسے کوئی عار نہیں۔مقام انسانیت کو اس مذہب نے جو رفعت بخشی ہے وہ اپنی جگہ پر ایک بہت بڑا اقدم ہے۔اس مذہب کے آنے کے بعد اور اس سے پہلے کی فکری اور ثقافتی تاریخ میں ایک نمایاں فرق ہے۔

اس مذہب نے اس بات کا آغاز کر دیا جس کا صدیوں سے انتظار تھا۔انسان نے اپنی تاریخ میں آہستہ آہستہ اس آگہی کو پایا ہے جسے ہم انسانیت کا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا کہتے ہیں۔آریائی اقوام میں ہندومت نے جس راز کو فاش کیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان اور خدا روح کے لحاظ سے ایک ہیں۔خدا کی روح ہی انسان کو متحرک رکھتی ہے لیکن انسان اپنی غفلت کی وجہ سے اس بات کا ادراک نہیں کر پا رہا۔اس غفلت سے انسان کو جگانے کا نام آریائی مذاہب میں ہندومت ہے۔بدھ مت نے آ کر اس حقیقت کو واضح کیا کہ کہ صرف اس بات کو چند ماہرین مذہب تک محدود رہنا اس کی حقیقت کو واضح نہیں ہونے دیگا۔اس کیلیئے ضروری ہے کہ اس نقطہء عظیم کو عام انسان کے کام کی چیز بنایا جائے تا کہ اس حقیقت پر محض مذہبی طبقے کا قبضہ نہ رہے۔سامی اقوام میں یہی کام نصرانیت نے کیا ہے۔لیکن یہاں بھی وہ اندیشہ ایک عرصہ کارفرما رہا جو آریائی مذاہب میں رونما ہوا تھا۔یعنی اس عظیم راز پر صرف مذہبی طبقے کا اجارہ رہا۔نصرانیت نے اس طوق کو اپنی گردن سے اتارنے میں بہت دیر کر دی لیکن آج نصرانی دنیا میں وہ طوق اتر چکا ہے۔البتہ اسکی کمزور سی جھلک اب بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے۔آج اگر حقوق انسانی کی بات نصرانی ماحول سے اٹھ رہی ہے تو اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔خدا اور انسان کے درمیان فاصلے کو نصرانیت نے ہی ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔جب مذہبی زنجیریں انسان کی فہم وادراک میں بھاری محسوس ہونے لگیں تو انسان کو یہی احساس اپنے پاؤں پر کھڑا رکھ سکتا تھا کہ خدا اور انسان ایک دوسرے سے نہ صرف دور نہیں ہیں بلکہ وہ اعلی مقاصد میں ایک ہیں۔بدھ مت کے اثرات کے تحت آریائی اقوام میں بھی اس کار خیر کی ابتدا ہو چکی تھی۔

سامی اقوام میں آج سے کوئی ڈیڑھ ہزار سال پہلے ایک اور مذہب آیا جسے مذہب کی بجائے دین کہا جائے تو بہتر ہوگا۔مذہب کا لفظ اردو میں راستے کا مفہوم رکھتا ہے جبکہ دین کا لفظ انسان کی اپنی پوری شخصیت کو کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقصد عظیم کیلئے وقف کرنے کا نام ہے۔اس دین کا نام اسلام ہے۔ جو اپنے لفظی معنی میں تو سر جھکانے کا مفہوم رکھتا ہے لیکن اصل میں اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنے کا ایک پروگرام ہے۔ زندگی کی یہ امانت جو انسان کو ایک محدود وقت کیلئے سونپی گئی ہے انسان اسے کیسے استعمال کرتا ہے یہ انسان کیلئے ایک امتحان ہے جس میں وہ پورا اترے تو اسکی کامیابی ہے ورنہ ناکامی۔

اسلام کے ذریعے جو بندھن خدا اور بندے کے درمیان وجود میں آیا وہ اطاعت سے بڑھ کر اعتماد کا بندھن ہے۔ خدا نے فرشتوں کو گواہ بنا کر جس رفعت انسانی کی بات کی ہے وہ فرشتوں کو انسان کے مقام سے یوں متعارف کرواتی ہے کہ اب یہ انسان زمین پر میرا خلیفہ ہوگا۔ یعنی میرا یہ نائب جو کرے گا اس پر میں کوئی فوری گرفت نہیں کروں گا بلکہ اس کے کئے کا جب تک واضح نتیجہ سامنے نہیں آتا میری طرف سے انسان کو مہلت ہوگی۔ جب نتیجے سے یہ ثابت ہوگا کہ انسان نے جو کام کیا تھا غلط تھا تب میرا اختیار اس ضمن میں حرکت میں آئے گا۔ وہ کیا ہوگا اس کا ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ وقت بتائے گا۔ جس کو میں نے اپنا نائب بنایا ہے اسے اپنی ذمہ داری پر کام کرنا ہے اور مجھے اپنے نائب پر اعتماد ہے کہ وہ منافقت سے کام نہیں لے گا۔ البتہ اس سے کسی جگہ پر غلطی ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ میں نے خود یہ زندگی گذارنے کی ذمہ داری انسان کو سونپی ہے۔ اس لئے جب تک وہ نیک نیتی سے کام کرے گا اپنا اعتبار قائم رکھے گا۔ انسانی حیات میں یہ ایک بہت بڑا انقلاب ہے۔

اسلام نے یہ بات کر کے انسان کو ایک شرف بخشا ہے جس کا حق دار وہ صرف اس وقت تک ہے جب تک اپنے اعتماد کو خدا کی نظر میں قائم رکھے۔ انسان کو خلافت کے مقام پر فائز کر کے اللہ تعالیٰ نے اسے جو رفعت بخشی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خدا نے اپنے اختیار کو اس حد تک محدود کر لیا جس حد تک انسان کو اختیار دینے کا تقاضا ہے۔

اسلام میں یہ مقام انسان کو عطا ہوا ہے۔ اور یہ بات بھی نظر سے اوجھل نہیں رہنی چاہئے کہ اسلام ختم نبوت کا دعوی بھی رکھتا ہے۔ ختم نبوت کے صحیح مفہوم کو پانا بھی مسلمانوں کیلئے اور باقی اقوام عالم کیلئے از بس ضروری ہے۔ اب کسی نبی کا آنا ممنوع اس لئے نہیں ہے کہ اب خدا کو انسان سے کچھ نہیں کہنا۔ اب خدا کا کلام انسان کے ساتھ کسی اور پیرائے میں ہوتا ہے۔ اسلام کے پیغام میں اس نکتے کو علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں کہ آج انسان اپنے تجرباتی ماحول میں اس قدر آزاد ہے کہ محض روایتی عقلی ڈھانچوں سے ہی کام نہیں لے گا بلکہ اپنے تجربے کی بنا پر نئے اسلوب افکار کو بھی تشکیل دے گا۔ یعنی Deductive انداز فکر سے آگے بڑھ کر Inductive انداز فکر بھی اپنائے گا۔ اور یہ بات صرف اہل اسلام ہی کیلئے مخصوص نہیں ہے دنیا میں انسان اتنا عاقل اور بالغ ہو گیا ہے کہ اسے اب وحی اور الہام کی انگلی پکڑ کر چلنے والے طریق کو خیر باد کہہ کر اپنی عقل اور فہم سے وہ مراحل طے کرنے ہیں جن کیلئے وہ اس سے قبل اہل نہیں تھا۔ اب انسان کو قرآن کی نشاندہی کے مطابق دو اور منابع علم سے استفادہ کرنا ہے۔ وہ منابع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم کا ئنات کے مطالعے اور خود انسانی باطن کے مطالعے میں پوشیدہ ہیں۔ علامہ کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

the Prophet of Islam seems to stand between the ancient and the modern world. In so far as the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world ; in so far as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life discovers other sources of knowledge suitable to its new direction. The birth of Islam, as I hope to be able presently to prove to your satisfaction, is the birth of inductive intellect. In Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition. This involves the keen perception that life cannot for ever be kept in leading strings; that in order to achieve full self-consciousness man must finally be thrown back on his own resources.

یہ الفاظ علامہ کے انگریزی خطبات میں اس مضمون میں ہیں جس میں انہوں نے مسلم ثقافت کی روح پر بحث کی ہے۔ ان الفاظ کا سیاق یہ ہے کہ آپ زمانہ قدیم اور زمانہ جدید کے تقاضوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وحی الٰہی قدیم زمانے میں انسان کو انگلی سے پکڑ کر چلنا سکھاتی تھی لیکن آج وحی الٰہی کائنات کے مطالعے اور انسان کے اپنے گہرے باطن کو سمجھنے کی سعی پر مشتمل ہے۔ اب انسان کو اسکے اپنے ذرائع سے وہ کچھ حاصل ہوسکتا ہے جو کبھی اسے خدا کی طرف سے وحی کی صورت میں حاصل ہوتا تھا۔ زندگی کو ہمیشہ انگلی پکڑ کر نہیں چلنا ہے۔ اسے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔ انسان کو مکمل خود آگہی کی منزل پر لانے کیلئے اس کے اپنے ذرائع پر چھوڑنا ضروری ہے۔ گویا اب انسان کسی ایک شخص کی رہنمائی کا محتاج نہیں ہے۔ بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی اپنے لئے نئی راہیں تلاش کر سکتے ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ کام کب کا شروع ہو چکا ہے۔ اب ان منابع علم سے استفادے کا کام انسان واقعتاً کر رہا ہے اور حیرت انگیز نتائج تک پہنچ رہا ہے۔ اس میں رسمی طور پر مذہبی ہونے یا نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ آج انسان اس رسمی مذہبی وابستگی سے بالاتر ہو کر اصلی اور حقیقی وابستگی سے فیضیاب ہو رہا ہے۔

آج بھی انسان کی اصلی اور حقیقی وابستگی کائنات کی اس ازلی حقیقت سے ہے جو مذہب کے حوالے سے انسان کی طفولیت کے دور میں اسکی تربیت کرتی رہی ہے۔ وہی حقیقت لم یزل آج بھی انسانی معاشرے کی ربوبیت کر رہی ہے جو پہلے نبوی انداز میں اسکی تربیت کرتی تھی۔ ایک بات جو انسان کے انفرادی دائرے سے نکل کر اجتماعی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دائرے میں داخل ہوتے ہی شروع ہو جاتی ہے وہ ہے ایک انسان کا دوسرے انسانوں سے تعلق اور اسکا اس تعلق کو نبھانے کا سلیقہ۔

جب تک انسان اور خدا کے درمیان انفرادی اور مذہبی معاملہ تھا انفرادیت کا دور دورہ تھا۔لیکن آج ہم ایک ایسے ماحول میں رہتے ہیں جس میں انسان اور خدا کا معاملہ تو انسان کا ذاتی مسئلہ رہ گیا ہے اور انسان اور انسان کا مسئلہ اجتماعی نوعیت اختیار کر گیا ہے۔ایک دور تھا جب انسان کا تعلق دوسرے انسانوں سے ایک قبیلے یا ایک قوم کی شکل میں ہوتا تھا۔اور اس قبیلے یا قوم کا مذہب ایک ہی ہوتا تھا۔اس لئے انسان کا اپنے قبیلے یا اپنی قوم کے ساتھ تعلق بھی مذہب کی تعلیمات سے پورا ہو جاتا تھا۔اب صورت حالات یکسر بدل گئی ہے۔اب کسی ایک مذہب سے ساری دنیا کے باہمی انسانی تعلقات کے بارے میں ہدایت میسر نہیں ہے۔

اب یا تو ہر مذہب اپنی تعلیمات کو دوسروں پر عائد کرے گا یا تمام دنیا کے لوگوں کو ایک مذہب کی پیروی کرنا ہوگی۔اور اس طرح مذہب کی بقا کا اہتمام کرنا ہوگا۔لیکن کیا کوئی قوم اس پر تیار ہے کہ اپنے مذہب کی تعلیمات کو اس طرح ترتیب دے لے کہ وہ تمام اقوام عالم کو منظور ہوں؟ یا کیا تمام دنیا کے لوگ اس پر تیار ہیں کہ وہ کسی ایک مذہب کی پیروی کرنا شروع کر دیں؟ میری ناقص رائے میں ان دونوں ہی باتوں کیلئے دنیا کے لوگ تیار نہیں ہیں۔

تو یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ انسان اپنے خدا کے ساتھ جو انفرادی تعلق رکھتا ہے اسکی حفاظت کرتے ہوئے ہم سب انسانوں کو اس باہمی رابطے سے فائدہ اٹھانا چاہئے جو فی زمانہ ہمیں حاصل ہے۔اور انسان ایسا کرنے سے اپنے خدا کے ساتھ تعلق میں کسی کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوگا کیونکہ یہ تمام تگ و دو اس ایمان کے بغیر ممکن نہیں ہے جو انسان کے گہرے باطن میں خدا اب بھی موجزن کئے ہوئے ہے۔اس طرح دیکھیں تو جتنی بین الاقوامی تنظیمیں آج وجود میں آچکی ہیں انہیں رحمت سمجھتے ہوئے اس سلسلے میں انسان کو اپنی مساعی میں مزید آگے بڑھنا چاہئے اور انسانی حقوق کے تحفظ اور ضمانت کیلئے جو کچھ ہو سکتا ہے کیا جانا چاہئے۔

لیکن ایک بات یہاں احتیاط کے طور پر ضرور سمجھ لینی چاہئے کہ سرمایہ داری کے دام میں آکر مستحق لوگ ان بین الاقوامی تنظیموں کی برکت سے محروم نہ ہو جائیں۔سرمائے میں ایک ایسی طاقت ہوتی ہے جو سرمایہ داروں کے ذاتی مفادات کا تحفظ کچھ اس طرح کر سکتی ہے کہ اصل حقداروں کے حقوق کی بازیابی بعض صورتوں میں ناممکن ہو جاتی ہے۔اس خطرے کو جتنی جلد بھانپ لیا جائے بہتر ہوگا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذاہب میں انسان کی عظمت اور حقوق کا تصور

(عدنان عادل)

دوسری جنگ عظیم (1945-1939) کی ہولناک تباہ کاریوں کے بعد مغربی ممالک نے مستقبل میں امن اور بھائی چارہ قائم کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے جن میں اقوام متحدہ کے ادارہ کا قیام، یونیسکو کا منصوبہ، انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ اور تباہ شدہ یورپ کے لیے مالی امداد کا مارشل پلان شامل ہیں۔ جنگ عظیم دوئم میں 61 ممالک شامل تھے اور 5 کروڑ انسان لقمۂ اجل بنے۔

انسان کی عظمت یا احترام (Dignity)، انسان کی آزادی (Liberty)، مساوات (Equality) اور بھائی چارہ (Brotherhood)۔ یہ وہ چار بنیادی ستون ہیں جن پر انسانی حقوق کے اعلامیہ (1948) کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے 27 نکات تشکیل دیے گئے۔ یورپ میں 18 ویں صدی میں شروع ہونے والی روشن فکری (Englightement) کی تحریک، سوشلسٹ تحریک اور صنعتی انقلاب کے پیدا کردہ حالات ان حقوق کی صورت گری پر گہرے اثر انداز ہوئے۔ خرد افروزی یا روشن فکری کی تحریک ہالینڈ اور انگلستان سے شروع ہو کر سارے یورپ میں پھیل گئی تھی۔ اس تحریک کے مفکرین نے تمام نوعِ انسانی کے ایک ہونے اور ایک جیسے ہونے کے تصورات کو فروغ دیا اور یہ کہا کہ تمام انسان 'عقل اور حق' کے ایک فطری قانون (نیچرل لاء) کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد فرانس کے بننے والے آئین اور امریکی دستور پر اس تحریک کے زیر اثر انسانی حقوق کا اعلامیہ شامل کیا گیا۔ یوں دیکھا جائے تو انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ (1948) خرد افروزی کی تحریک کا نقطۂ عروج تھا۔ تاہم اس اعلامیہ کی تیاری میں چینی فلسفی اور سفارت کار Peu - Chung Chang، لبنانی فلسفی چارلس ملک (Charles Malik) اور فرانسیسی قانونی اسکالر Rene Cassin جیسی شخصیات نے حصہ لیا جو مختلف تہذیبی پس منظر رکھتے تھے۔ مزید برآں، یونیسکو نے اس اعلامیہ کی تیاری کے لیے تمام رکن ملکوں میں سوالنامے بھیجے تا کہ مختلف معاشروں اور مذاہب میں انسانی حقوق کے تصورات کی تحقیق کی جا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکے۔اعلامیہ کو ڈرافٹ کرنے والے Rene Cassin نے اس کی مذہبی اور فطری (Natural) بنیادوں کا اقرار کیا۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی حقوق کی جڑیں یورپ کی خرد افروزی سے بڑھ کر تمام عالمی مذاہب میں موجود ہیں۔

انسانی حقوق کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے سے اخوت یا بھائی چارہ (Brotherhood) کی روح کے مطابق پیش آئیں۔ یہی انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ کا پہلا نکتہ بھی ہے۔ یہ اعلان بائبل کی اس تعلیم کے عین مطابق ہے کہ ''اپنے ہمسایہ سے ایسے محبت کرو جیسے خود سے کرتے ہو''۔ (Love the neighbour as thyself) اور ''اجنبی سے ایسے محبت کرو جیسے خود سے کرتے ہو (Love the stranger as you love yourself)

اسی طرح ہندومت میں نوع انسانی کے لیے روحانی مقاصد اور اقدار موجود ہیں۔ منو اور بدھ نے اچھی زندگی کے لیے جو ضوابط دیے ان میں انسانی حقوق کا سراغ ملتا ہے۔ ایک اصول تو اہنسا ہے یعنی تشدد سے آزادی۔ دوسری اصولی ہے استیا (احتیاج سے آزاد)۔ تیسرا اصول ہے اپاری گرہا یا استحصال سے آزادی اور چوتھا اور پانچواں اصول ارمرت اتوا اور ارو گیا ہیں جن کا مطلب ہے جلد موت اور بیماری سے آزادی۔ ہندومت میں دھرم کا جو تصور ہے وہ عادلانہ یا مبنی بر انصاف اعمال کا ہے۔

گیتا میں بھگوان کرشن، ارجن سے خطاب کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں:

''وہ جسے عزت اور بے عزتی ایک جیسی ہے، جو دوست اور دشمن کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، جس نے اعمال کے پھل کی خواہش کو یکسر چھوڑ دیا ہے اور نیکی جس کی فطرت بن گئی ہے، ایسا آدمی عارف ہے''۔

ایک اور جگہ کرشن کہتے ہیں:۔

''اے ارجن! نڈرتا، باطن کی پاکیزگی، طبیعت کی معرفت اور یوگ کا قیام، خیرات کرنا، حواس کو قابو میں لانا، قربانی کرنا، ریاضت کرنا اور راست بازی، بے آزاری، صداقت، غصہ نہ کرنا، تیاگ، شانتی، سکون قلب، چغلی نہ کھانا، فراخدلی، رحمدلی، لالچ نہ ہونا، انکساری، حوصلہ، جلال، عفو، پاکیزگی، عداوت نہ رکھنا، غرور نہ ہونا، یہ سب دیوتائی خصوصیات ہیں''۔

جب ویدوں کی اصل تعلیمات کو مسخ کیا گیا اور ذات پات کا نظام مسلط کیا گیا تو چھ صدی قبل از مسیح بدھ اور ان کے پیروکاروں نے اس نظام کو چیلنج کیا اور ایک بار پھر انسانی وقار اور برابری کا پرچار شروع کیا۔ بدھ کی تعلیمات کا ایک خاص پہلو عورت کی تکریم اور مساوات کی بحالی تھا۔ بدھ نے عورتوں کو بھی مردوں کی طرح خانگی زندگی کو ترک کرکے سنگھ قائم کرنے کا حق تسلیم کیا۔

بدھ کی تعلیمات کا مرکزی نکتہ ''ان آتما'' یا خودی کی نفی ہے تاکہ دکھوں سے نجات مل سکے۔ بدھ کے خیال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اپنی ذات کے مستقل ہونے کا تصور دنیا میں تشدد کا بڑا منبع ہے جبکہ بدھ یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ ہر چیز تبدیل ہو رہی اور تغیر ہے بشمول ہماری ذات کے۔ بدھ کے مطابق ہم سب ختم ہو جائیں گے اور ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کس طرح سلیقہ سے زندگی گزاریں اور نہ اپنی ذات کو اور نہ کسی اور کو نقصان پہنچائیں۔ جب ہم اپنی نفی کر کے زندگی کو دیکھیں تو یہ ایک واحد اور نہ ٹوٹنے والی ندی کی طرح اکائی بن جاتی ہے جس میں سب ہستیاں ایک دوسرے کے لیے دوستی اور مہربانی کے رشتہ میں جڑ جاتی ہیں۔ اسی سے کائناتی محبت اور اس کے نتیجہ میں عدم تشدد (اہنسا) کے تصور جنم لیتے ہیں۔ تمام ذی حس ہستیاں، انسان ہوں یا جانور، زندگی کے ایک جال کا حصہ ہیں۔ بدھ نے ذات پات کے نظام کے بارے میں کہا کہ یہ فطرت کا جبر نہیں ہے بلکہ مختلف پیشے اختیار کرنے کی وجہ سے تہذیبی عمل کے نتیجہ میں وجود میں آیا۔ بدھ کے دھرم میں تمام انسان ایک نوع ہیں اور دھرم (قانون) کی نگاہ میں، ان میں کوئی امتیاز نہیں اور صرف دھرم (قانون) بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

جب بدھ نے اپنی تعلیمات کا آغاز کیا تو ہندو معاشرہ میں کسی انسان کے مرتبہ اور وقار کا تعین اس بات سے ہوتا تھا کہ وہ کس خاندان میں پیدا ہوا، اس کے پاس کتنی دولت ہے اور اس کی طاقت یا اقتدار کتنا ہے۔ بدھ کے ان روایات کو رد کر دیا اور یہ تعلیم دی کہ انسان کے مرتبہ اور عظمت کا تعین اس کے اخلاق سے متعین ہوتا ہے۔ بدھ نے یہ تعلیم بھی دی کہ عدم تشدد (اہنسا) اور دان (خیرات) یا اپنی دولت میں دوسروں کو شریک کرنا، تشدد اور لالچ سے برتر نیک اقدار ہیں۔

بدھ کی تعلیم کی بازگشت ہمیں پندرھویں صدی کے وسط میں سکھ مذہب کے بانی بابا گورونانک کی تعلیمات میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ ساری کائنات پر آسمان کی روشنی غالب ہے اور ساری تخلیق خدا ہی کی ہے۔ تمام بنی نوع انسان میں اُجالا اسی آسمانی نور کی وجہ سے ہے۔ خدا ہی ہے جو زندگی عطا کرتا ہے۔ گورونانک کے نزدیک ذات پات کی تقسیم اور سماجی امتیازات اس ایمان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے۔ خدا کی کوئی ذات نہیں ہے اور نہ ہی وہ ذات کو کوئی اہمیت دیتا ہے۔ کسی بھی شخص کو اس کے حسب ونسب کی بنا پر بلند تر (اُتم) یا کمتر (نیچ) نہیں سمجھنا چاہیے۔ برہمنوں اور کھتریوں کے خلاف گورونانک خود کو کم ذاتوں اور شودروں کے ساتھ متعارف کرداتا ہے:

''کوئی کم سے کم تر ہوں یا اس سے بھی کم ترین ہوں، نانک ان کے ساتھ ہے''۔

ذات پات کی بجائے گورونانک بھی انسانی عمل کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔

''انسان جو الفاظ ادا کرتا ہے انہیں اہمیت دی جائے گی۔ وہ جو خوراک کھاتا ہے اسے اہمیت دی جائے گی۔ اس کی حرکات کو اہمیت دی جائے گی۔ جو وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اس کو اہمیت دی جائے گی۔ بے شک ہر سانس جو وہ لیتا ہے اس کو اہمیت دی جائے گی''۔

گورونانک کے نزدیک صحیح کردار میں سب سے پہلی بات ایماندارانہ کمائی اور اس کی بنیاد پر خیرات ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''وہ جواپنی محنت کی کمائی میں سے کھاتا ہے اور اس میں سے کچھ دوسروں کو بھی دیتا ہے نانک۔ یہی وہ بندہ ہے جو سچے راستے کو جانتا ہے''۔

References

1. The History of Human Rights by Micheline R. Ishay, University of California Press, London, 2003.

2. Buddhism, Human Rights and Social Renewal by Nalin Swasis, Hong Kong, 2000

3. سکھ۔ مذہب۔ تاریخ۔ سیاست

جے ایس گریوال اردو ترجمہ امجد محمود، بک ہوم، لاہور 2006

4. بھگوں گیتا رائے روشن لعل، فکشن ہاؤس

لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقلیتوں کو درپیش مسائل کو مذہبی نہیں سیاسی بصیرت سے دیکھنے کی ضرورت

(آئی ۔اے ۔رحمٰن)

قائداعظم کو جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے اس کا اختتام بجا طور پر اس اپیل پر ہوتا ہے کہ پاکستان کی تعمیر و تشکیل ان خطوط پر کی جائے جو قائداعظم نے تجویز کئے تھے۔ اور اس ریاست کے حوالے سے ان کے جو منصوبے تھے ان کی سب سے جامع وضاحت ہمیں اور کہیں نہیں ملتی ماسوائے اس تقریر کے جو انہوں نے 11 اگست ۔1947ء کو قانون ساز اسمبلی میں کی تھی۔ جب کبھی بھی اقلیتوں کے حقوق کی خلاف ورزیوں کی اطلاعات منظر عام پر آتی ہیں۔ اس موقع پر اس تقریر کا حوالہ بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

یہ تقریر مسلم لیگ تحریک کے ہدف اور دوقومی نظریہ کے بارے میں قائداعظم کے بیانات سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے کیونکہ موخرالذکر بیانات پاکستان کی تخلیق کے حوالے سے دلائل کی نوعیت رکھتے تھے۔ یہ صرف قائداعظم کی 11 اگست کی تقریر تھی جس میں انہوں نے پاکستان کے نصب العین کی توضیح و تشریح کی تھی۔ یہ بات اس وقت واضح ہوتی ہے اگر ہم اس مخصوص انداز کا تجزیہ کریں جس میں قائداعظم کی تقریر تکمیل کے مراحل طے کرتی ہے۔

قائداعظم اپنی تقریر کا آغاز مقننہ کی آزاد و خودمختار حیثیت پر زور دیتے ہوئے کرتے ہیں (ایک ایسی چیز جسے قرار داد مقاصد کے مقننین نے نظر انداز کر دیا) اس کے بعد وہ بہتر نظم و نسق کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں...... تمام شہریوں کی ''جان۔ مال اور مذہبی عقائد'' کا تحفظ...... بدعنوانی، مہنگائی اور اقربا پروری کا خاتمہ......

اس کے بعد قائداعظم نے اس بات کا اعلان کیا ''اگر ہم پاکستان کی اس عظیم ریاست کو مطمئن اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں...... ہمیں صرف اور صرف کلی طور پر اپنی تمام تر توجہ لوگوں کی فلاح و بہبود پر مرکوز کرنا ہوگی...... خاص طور پر عوام الناس اور غربا......'' لیکن یہ نصب العین اس بات کو یقینی بنائے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا کہ ہر شخص ''قطع نظر اس امر کے کہ اس کا تعلق کس برادری سے ہے...... قطع نظر اس بات کے کہ ماضی میں اس کے تعلقات آپ کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ کس نوعیت کے تھے...... قطع نظر اس بات کے کہ اس کا رنگ ذات یا نسل کیا ہے.... وہ اول، دوم اور آخر اس ریاست کا شہری ہے ......جس کے حقوق ......استحقاق اور فرائض مساویانہ ہیں......''

اس کے بعد پانچ صد الفاظ (پوری تقریر کا ایک تہائی سے معمولی کم) پر مشتمل ایک دلیل ہے جس کا مقصد عقیدے کی بنیاد پر شہریوں کے درمیان تمیز کو ختم کرنا ہے اور قائداعظم پر اعتماد نظر آتے کہ ''اکثریتی اور اقلیتی برادریوں...... ہندو برادری اور مسلم برادری...... کے تمام تضادات...... مٹ جائیں گے......'' قائداعظم کی تقریر کا یہ حصہ اپنے اندر پاکستان کے تمام شہریوں کے حقوق کا منشور سموئے ہوئے ہے...... قطع نظر اس بات کے کہ ان کا عقیدہ، رنگ یا نسل کیا ہے......

حیرت کی بات یہ ہے کہ اقلیت اور اس کے حقوق کے حوالے سے قائداعظم کا جو تصور ہے۔ اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ اقلیتی اور اکثریتی برادریوں کا ذکر کرتے ہوئے قائداعظم نے یہ کیوں کہا تھا...... ''حتیٰ کہ جب آپ مسلمانوں کی بات کرتے ہیں......تو آپ پٹھانوں، پنجابیوں، شیعوں، سنیوں وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں...... اور ہندوؤں کا ذکر کرتے ہوئے آپ برہمنوں، واشنواسیوں، کھتریوں، بنگالیوں، مدراسیوں وغیرہ کی بات کرتے ہیں......'' اس ضمن میں صرف ایک ہی معقول وضاحت پیش کی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قائداعظم کے نظریات کے مطابق ایک گروہ یا اقلیت بنانے کے لیے عقیدہ محض واحد وسیلہ نہیں تھا...... علاقائی برادریاں...... جو ایک ریاست میں سب سے بڑی اکثریت کے مقابلے میں کم تعداد میں ہیں......ان کی بھی بہ حیثیت اقلیت زمرہ بندی کی جا سکتی ہے......

اسی طرح ایک ملک کی مسلم آبادی کے چھوٹے فرقے...... مثال کے طور پر سعودی عرب یا پاکستان میں شیعہ حضرات یا ایران یا عراق میں سنی بھی اسی زمرے میں آتے ہیں اور ذات پات کے زیر اثر معاشرے میں تمام بے شمار چھوٹی ذاتیں اقلیتوں کے زمرے میں ہی آتی ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو چالیس سال سے زائد عرصے کے بعد اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کے اعلامیے نے کہی۔

11 اگست۔ 1947ء کی تقریر میں قائداعظم نے جن خیالات کا وضاحت کے ساتھ اظہار کیا۔ اقلیتوں کے بارے میں قائداعظم کے اس تصور نے بھی قائداعظم کے انداز فکر میں سنجیدگی اور گہرائی کا اظہار کیا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیشہ ہی یہ کہا تھا کہ اقلیتوں کے حقوق ایک سیاسی معاملہ تھا......اور یہ کہ ایک مذہبی معاملہ ہرگز نہیں تھا...... 1935ء میں آئینی اصلاحات کے بارے میں پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ پر تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے اس بات کا اعلان کیا کہ مذہب کو سیاست میں نہیں لانا چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا: ''مذہب محض خدا اور انسان کے درمیان ایک معاملہ ہے...... یہ اقلیتوں کا مسئلہ ہے اور یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے......''

اگر ہم قائداعظم کے انداز فکر کی پیروی کرتے ہوئے مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے سے گریز کرتے ہیں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقلیتی معاملات کو بہ حیثیت سیاسی مسائل تسلیم کر لیتے ہیں تو اس کے نتیجے میں تمام شہریوں کی زندگی آسان اور سہل ہو جائے گی۔ یہ معاملات دو زمروں میں آئیں گے...... ایک زمرہ ان معاملات پر مشتمل ہوگا جن کا تعلق مذہبی عقیدے سے ہے (اس کی طرف قائد اعظم نے تمام شہریوں کی جان و مال کے ساتھ اشارہ کیا تھا) مثال کے طور پر عقیدے کی آزادی، اس پر عمل اور اس کی تبلیغ اور ذاتی قوانین...... دوسرے زمرے میں تمام شہری، سیاسی، معاشی اور سماجی حقوق آتے ہیں۔ جن کے حوالے سے اقلیتی برادری کے ایک رکن کے ساتھ دیگر شہریوں کی طرح سلوک کیا جائے گا......

آیئے ہم مختلف مثالوں کا جائزہ لیتے ہیں: گلزار ڈینیل اپنے تعلیمی ریکارڈ کے بل بوتے پر یونیورسٹی میں ایم بی اے کی کلاس میں داخلے کا اہل ہے اگر ہم اسے مسیحی تصور کرتے ہیں اسے داخلہ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ وہ اقلیتی طلباء جن کا میرٹ اس سے اعلیٰ تھا انہیں پہلے ہی داخلہ مل چکا ہے...... اور یونیورسٹی کے پاس اقلیتی طلباء کے لئے صرف دو ہی نشستیں ہیں۔ لیکن اگر ہم اسے صرف ایک پاکستانی تصور کرتے ہیں تو اسے یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا ہے۔

اگر ہمارے ہاں مساویانہ حقوق کے ساتھ شہریوں کو پاکستانی تصور کرنے کی روایت قائم ہوتی۔ تو اس روایت نے یقیناً حکومت اور پاکستان کے عوام کو اس بات کی ترغیب دی ہوتی کہ وہ پروفیسر عبدالسلام کی بطور ایک عظیم پاکستانی سائنسدان عزت و احترام کرتے نہ کہ اسے ایک احمدی ہونے کا طعنہ دیتے۔ اسی طرح اگر رانا بھگوان داس کے مخالفین ان کے جج ہونے کی اہلیت اور استعداد پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھتے اور اس بات پر ان کی سوئی نہ اٹک جاتی کہ وہ ایک غیر مسلم تھے تو عدلیہ اور قوم دونوں ہی اس ہزیمت اور شرمندگی سے بچ جاتے جو ہمیں اس وقت اٹھانا پڑی جب بہ حیثیت سندھ ہائیکورٹ جج ان کی تعیناتی کو چیلنج کیا گیا۔

اگر طلباء، اساتذہ، پولیس اہلکار، فوجی افسران، ڈاکٹرز، مجسٹریٹس اور ملزموں کے ساتھ ہم وہی سلوک کریں جس کا بہ حیثیت شہری وہ تقاضہ کرتے ہیں اور بطور مسلم، ہندو، مسیحی اور اچھوت ان کی شناخت نہ کریں تو پاکستان میں عدم رواداری کی ایک بڑی وجہ ختم ہو جائے گی۔ جب قائد اعظم نے یہ کہا ''مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے اور ہندو، ہندو نہیں رہیں گے'' تو واضح طور پر ان کا یہی مطلب تھا۔

یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ جب ایک شہری جس کا نام مہیش بھیل ہے۔ وہ بدین میں واقع ایک ہسپتال میں جاتا ہے تو اس کا نام اس کے عقیدے اور اس کے کمزور اور غیر محفوظ ہونے کا بھید کھول دیتا ہے۔ ناموں کا مسئلہ براعظم میں مسلمانوں کے اس احساس کی پیداوار ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں...... کیونکہ متعدد مسلم اکثریتی ممالک میں مسلموں اور غیر مسلموں کے ایک ہی جیسے مشترکہ علاقائی نام ہیں۔ یہ ''اکثریتی اور اقلیتی برادریوں کے تضادات میں سے ایک بڑا تضاد ہے'' جو صرف کچھ وقت گزرنے کے ساتھ ہی ختم ہوگا۔

اس دلیل کو کہ تمام شہری مساویانہ حقوق، استحقاق اور فرائض کے اہل ہوں گے۔ اقلیتوں کو اکثریتی برادری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں جذب کرنے کا کوئی منصوبہ تصور نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہاں کوئی ایسی تجویز زیر غور نہیں ہے کہ وہ اپنے مندروں اور گرجا گھروں یا شخصی قوانین یا زبان یا رسم ورواج کو خیر باد کہہ دیں...... وہ صرف بہ حیثیت شہری مساویانہ حقوق کے مالک ہوں گے......

کیا قائداعظم پاکستان کی ریاست کے حوالے سے تفصیلی منصوبے کو اس سے زیادہ واضح کر سکتے تھے؟ انہیں اس افراتفری کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا جو ان کے ترجمان کی پیدا کردہ اور ان افراد کے ذاتی اور جانبدارانہ رجحانات کی مرہون منت تھی۔ یہاں الزام عائد کیا جاتا ہے کہ قائداعظم کی 11 اگست۔ 1947ء کی تقریر، آزادی سے پہلے قتل یا آزادی کے بعد ان کے بیانات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اتنی ہی غلط یہ بات ہے کہ ''(اسمبلی میں کی جانے والی قائداعظم کی تقریر آزادی کے بعد اقلیتوں کے بارے میں ان کا واحد عوامی بیان تھا......'' اکتوبر 1947ء سے مارچ 1948 تک اقلیتوں کی مساویانہ حیثیت کے بارے میں ان کے بیانات میں ہمیں کم از کم سات حوالہ جات ملتے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ قائداعظم وقتاً فوقتاً اسلامی روایات اور اقدار کا حوالہ دیتے رہتے تھے۔ لیکن عوامی جمہوریت، خودمختار مقننہ اور اقلیتوں کے لئے مساویانہ حیثیت کے لئے ان کے دلائل اسلام سے متصادم نہیں تھے...... کیونکہ وہ اسلام کو سمجھتے تھے...... قانون ساز اسمبلی میں ان کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کو آج چھ دہائیاں گزر چکی ہیں اور آج بھی یہ تقریر نہ صرف یہ کہ اقلیتوں کو درپیش مسائل حل کرنے کے لیے ایک منصفانہ انتخاب ہے بلکہ یہی ایک واحد راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے پاکستان ایک متحد اور ترقی پذیر ملک کے طور پر آگے بڑھ سکتا ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ جہد حق' جنوری 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتواں باب

(انسانی حقوق کے نفاذ، حقوق کے فروغ، حقوق کی تحریک کو مستحکم کرنے کے لیے حکمت عملی کی تشکیل اور عوام تک رسائی حاصل کرنے میں سول سوسائٹی کا کردار)

- پاکستان میں انسانی حقوق پر عملدر آمد کی راہ میں رکاوٹیں (حنا جیلانی)
- ریاستی سرپرستی میں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی۔ناقابل تلافی نقصان (آئی۔اے۔رحمٰن)
- حقوق تک رسائی حاصل کرنے میں سول سوسائٹی کا کردار (ایم ابوالفضل)
- جاگیردارانہ نظام انسانی حقوق کے حصول میں رکاوٹ (آئی۔اے۔رحمٰن)
- قائد کی سوچ حقوق کے فروغ کے لیے مشعلِ راہ (اردشیر کاؤس جی)
- انتظامیہ کی بے حسی حقوق کے حصول میں بڑی رکاوٹ (آئی۔اے۔رحمٰن)
- حقوق کے فروغ کے لیے حکمت عملی (پرویز ہود بھائی)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں انسانی حقوق پر عملدرآمد کی راہ میں رکاوٹیں

(حنا جیلانی)

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے ضلعی کور گروپ کوآرڈینیٹروں اور رضا کار نامہ نگاروں کی سالانہ تین روزہ ورکشاپ میں کمیشن کی کونسل ممبر محترمہ حنا جیلانی نے "پاکستان میں انسانی حقوق پر عملدرآمد کی راہ میں رکاوٹیں" کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس سیشن میں ان کے خیالات اور سوال جواب کی تفصیل قارئین کی رہنمائی کے لئیے درج ذیل ہے۔

دیکھیں جب تک آپ اپنی راہ میں حائل رکاوٹوں کی نشاندہی نہیں کر سکتے تب تک آپ اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ کونسی چیزیں انسانی حقوق کی راہ میں حائل ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ہمیں ہر صورت انسانی حقوق کا تحفظ کرنا ہے۔ فرض کریں کہ لوگ کہتے ہیں کہ جنگوں میں تو لوگ مارے ہی جاتے ہیں یا یہ کہ ہنگامی حالات میں ناانصافیاں ہو جاتی ہیں۔ یہ بات درست نہیں۔ انسانی حقوق پر عملدرآمد کا تعلق ان باتوں سے ہے کہ نظام کس قسم کا ہے۔ قانون پر عملدرآمد کروانے والے افراد کی تربیت کیسی ہے۔ میرے تجربے کے مطابق پاکستان میں انسانی حقوق کی راہ میں دو چیزیں حائل ہیں۔

1- پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستانی قوانین میں خامیاں ہیں۔

2- دوسری بات یہ کہ وہ ادارے نہیں بنائے گئے جن کے ذریعے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔

ایک اور بات جو بہت سنگین مسئلہ ہے وہ یہ کہ لوگوں کا نظام عدل سے اعتماد اٹھ گیا ہے جس سے تشدد اور بے صبری میں اضافہ ہوا ہے۔ اور لوگ فوری انصاف چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کو چاہیے کہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ انصاف کے لیے کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ یہ ایک عمل اور procedure کا نام ہے۔ اس سے گزرے بغیر انصاف کا ملنا ممکن نہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس عمل میں کسی سے زیادتی نہ ہو۔ لوگ ہم پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ تو مجرموں کے ساتھی ہیں۔ یہ ان کے حقوق کی بات کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

☆ victim کے حقوق

☆ accused کے حقوق

یہ ضروری نہیں ہے کہ accused ہی مجرم ہو اس کے لیے دھیان رہے کہ کہیں انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ان کی پامالی تو نہیں ہو گئی۔ لیکن Nobody must have impunity الزام ثابت ہو اور سزا بھی منصفانہ ہو۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کا نظام سے اعتبار اٹھ گیا ہے اس لیے عدم برداشت میں اضافہ ہو رہا ہے اور تشدد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر نظام عدل ٹھیک ہو تو انسانی حقوق پر عملدرآمد مشکل نہیں ہے۔ بشرطیکہ قوانین ٹھیک ہوں۔ لیکن اگر قوانین بہت بہترین ہوں اور عدلیہ competent نہ ہو تو پھر بھی مشکل ہو جائے گی۔

وکلا کی تحریک کے بعد عام آدمی میں تاثر یہ ہے کہ عدلیہ آزاد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عدلیہ حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہے۔ عدلیہ کو صرف انتظامیہ سے آزادی نہیں چاہیے۔ بلکہ آزاد عدلیہ خود اپنی خواہشات اور مفادات سے بھی آزاد ہوتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ بعض اوقات قانون بذات خود ناانصافی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں سزائے موت ہاتھ پاؤں کاٹنا یا سرعام کوڑے مارنا شامل ہیں۔ یہ بھی رکاوٹ ہیں۔

یا ہمارے آئین میں بھی ایسے تضاد ہیں جو انسانی حقوق کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ مثلاً آئین کے مطابق تمام شہری برابر ہیں۔ مسلم شہری اور غیر مسلم شہری کے حقوق میں بہت فرق ہے۔

اسی طرح آئین میں دو parallels ہیں۔ یعنی سپریم کورٹ کے parallel وفاقی شرعی عدالت۔ ابھی حال ہی میں شرعی عدالت نے یہ فیصلہ دے دیا کہ حدود کے زمرے میں جو مقدمات آتے ہیں۔ ان کو شرعی عدالت ڈیل کرے گی۔ لیکن حدود کی جو انہوں نے تعریف کی اس کے مطابق تو پورا criminal code اس کے تحت آ جاتا ہے۔

ان مثالوں کو بیان کرنے کا میرا مطلب یہ ہے کہ کس طرح خود نظام عدل ہی بعض اوقات انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کرتا ہے۔ اور یہ یہاں تک محدود نہیں۔ دوہرا نظام نیچے تک ہے۔ ایک طرف سیشن کورٹ ہے جو ضابطہ فوجدار کے تحت کام کرتی ہے۔ اور وہ مقدمات جو ضابطہ فوجداری کے تحت نہیں آتے ان کے لیے علیحدہ نظام ہے۔ تیسرے خیبر پختونخواہ میں نظام عدل کی گونج ہے۔ تو ان مسائل سے ہوتا یہ ہے کہ آپ انصاف کا ایک جیسا نظام قائم نہیں رکھ سکتے۔ یعنی انسانی حقوق کے تصور کی آفاقیت کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ کا آئین آپ کے حقوق کی ضمانت دیتا ہے۔ یعنی یہ گارنٹی آپ کو ریاست دیتی ہے اور ان پر تضاد عدلیہ کا کام ہے۔ لیکن ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ آئین خود کئی معاملات میں خاموش ہے۔ مثلاً جبراً لاپتہ کیے جانے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والے افراد کے متعلق آئین کچھ نہیں بتاتا۔ اسی طرح protection against tortue کا معاملہ ہے۔ ہمارے آئین میں صرف Torture is only banned in case of confession یعنی یہ نہیں کہا گیا کہ Torture is totally band دوسرے لفظوں میں آئین نے تشدد کی کئی صورتوں کی اجازت خود دے دی ہے۔ ادھر Pakistan Penal Code میں تشدد کو define بھی نہیں کیا گیا۔ اس طرح Human trafficking کے لفظ کی تعریف تک نہیں کی گی حالانکہ بچوں اور لڑکیوں کا اغواء اور ان کی سمگلنگ ہمارے ملک میں ایک سنگین مسئلہ ہے لیکن آپ کا آئین اس پر خاموش ہے تو آپ کو ان سب مسائل کو دیکھنا ہوگا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ سیاسی شعور کے بغیر ہیومن رائٹس کا کام ممکن نہیں۔ آپ کو لوگوں میں سیاسی شعور پھیلانا چاہیے۔ اب آپ وفاق کے تصور کو لے لیجئے۔ آئین نے ریاست کو ایک فیڈریشن قرار دے دیا لیکن وفاق کے تصور کی وضاحت تک نہیں کی۔ وفاق کا مطلب ہے کہ یہ پہلے مختلف اجزاء تھے جو اکٹھے ہو گئے۔ لیکن صوبوں کے علیحدہ وجود یا اور قومیتوں کے تصور کو رد کر دیا۔ مثلاً اقوام متحدہ میں یہ حق مانا گیا کہ ہر قوم کو اپنے قدرتی وسائل پر حق ہے لیکن آپ کا آئین یہ تسلیم نہیں کرتا۔

سوالات و جوابات

سوال۔ متبادل نظام انصاف کے خلاف عالمی سطح پر کیا کوششیں ہو رہی ہیں؟

جواب۔ متبادل نظام انصاف کے خلاف تصور کا یہ بنیادی مطالبہ ہے کہ یکساں نظام ہو۔ اگر ایک طرف سیشن کورٹ اور دوسری طرف اینٹی ٹیرر کورٹ ہو۔ میرا مقدمہ سیشن کورٹ میں چلایا جاتا ہے۔ اور فرض کریں کسی دوسرے شخص کا مقدمہ اینٹی ٹیرر کورٹ میں چلایا جاتا ہے تو یہ ناانصافی ہوگی۔ یہ انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ مگر ہمارے ہاں ایک ہی ریاست کے اندر کئی طرح کے نظام ہیں۔ اب قبائلی علاقوں کو دیکھ لیں۔ بھی یا تو پاکستانی ریاست ہے یا نہیں ہے۔ یہ دوہرا نظام ناانصافی پر مبنی ہے۔ جب آپ نے اقوام متحدہ کے معاہدوں پر دستخط کر دیئے ہیں تو آپ پابند ان حقوق کو پورا کرنے کے جن کو آپ نے Rectify کیا ہے۔ پاکستان کے علاوہ بھی کئی ریاستیں ہیں جو یہ دوہرا معیار رکھتی ہیں۔ اسرائیل نے 67 معاہدوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ جو کہ اس کے خلاف سائن ہوئے ہیں۔

سوال۔ ماورائے عدالت قتل جیسا کہ فوج بلوچستان میں کر رہی ہے ہم ان سے بطور ہیومن رائٹس ڈیفنڈر کیسے نبٹ سکتے ہیں؟

حنا۔ یہ بہت اچھا سوال ہے۔ دیکھیں جب آپ کا نظام صحیح طور پر جمہوری نہیں ہوگا تو پھر یہ ہوگا۔ اداروں کے درمیان توازن ہونا چاہیے۔ تین ادارے ہیں جن کے درمیان توازن ضروری ہے۔

☆ انتظامیہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

☆ عدلیہ

☆ پارلیمان

لیکن ہمارے ملک میں فوج ان تینوں سے ماوراء ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں یہ نہیں کہتی کہ آپ اسے قبول کرلیں بلکہ آپ کو اسے چیلنج کرنا چاہیے۔ اسی لیے ہم ہر صورت جمہوری نظام کی حمایت کرتے ہیں۔ جمہوریت کے اندر استحصال اور جبر کی گنجائش کم ہے۔ جمہوری نمائندے لوگوں کو جوابدہ ہوتے ہیں۔ فوج کے افسران عوام کو جوابدہ نہیں ہیں۔ تو ہمیں اس صورتحال میں کیا کرنا چاہیے۔ ہم یہ کرسکتے ہیں کہ ہم اپنی طاقت میں اضافہ کریں۔ اگر کسی سے زیادتی ہو ہم سب اس کی مدد کو پہنچ جائیں اور دوسروں کو پتہ چلے کہ یہ اکیلا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھی اس کے ساتھ ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اکٹھے ہو جائیں ورنہ ہم مارے جائیں گے۔

سوال۔ ہم نے آزاد عدلیہ کے لیے جدوجہد کی لیکن اب عدلیہ لا پتہ افراد کے لیے کچھ نہیں کر رہی؟

جواب۔ I agree with year آزاد عدلیہ کے لیے جدوجہد کرنے کے ہمارے دو مقاصد تھے۔

1- ہم انتظامیہ کو ایک پیغام دینا چاہیے تھے۔

2- ہم عدلیہ کو بھی ایک پیغام دینا چاہتے تھے۔

لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم اداروں میں تصادم بھی نہیں چاہتے۔ عدلیہ پوری طرح آزاد نہیں بلکہ اپنے مفادات اور خواہشوں کے تابع ہے۔ جہاں تک لا پتہ افراد کا تعلق ہے۔ یہ دو طرح کے ہیں۔

1- 9/11 کے حادثے کے نتیجے میں غائب ہونے والے

2- قوم پرست اور سیاسی سرگرمیوں کے نتیجے میں غائب ہونے والے

چیف جسٹس صاحب نے لا پتہ افراد کے بہت سے کیس سنے نہیں لیکن کسی کا فیصلہ نہیں سنایا۔ آئی جی کو بلا کر ڈانٹ دیا اور کبھی کسی اور کو بلا کر ڈانٹ دیا۔ معاملہ اس سے آگے نہیں گیا اور جائے گا بھی نہیں۔ تو پھر فوج کا احتساب کون کریگا۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج کا احتساب کرنے والا کوئی ادارہ ہے ہی۔ فوج ان سب سے ماوراء ہے۔ صرف پی پی کو نشانہ بنانا تو نہیں؟

جواب۔ یقیناً یہ کسی حد تک سیاسی انتقام ضرور ہے۔ جن لوگوں نے چیف جسٹس کا ساتھ دیا تھا ان کے خلاف واقعی کوئی کیس نہیں کھولے گئے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ عدلیہ کی ان حرکتوں سے عدلیہ اور ملک دونوں کو نقصان ہوگا۔

سوال۔ ان حالات میں بار کیا کردار ادا کرسکتی ہے؟

اچھا کردار ادا کرسکتی ہے اور کر بھی رہی ہے۔ بار اب تقسیم ہے۔ پرو چیف جسٹس دھڑا اب کمزور ہے اور عدلیہ کا نقاد دھڑا اب طاقتور ہے جو کہ خوش آئند بات ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوال ۔کیا چیف جسٹس کسی سیاسی پارٹی کی کوششوں سے بحال ہوئے؟

جواب ۔ ہاں بالکل پاکستان کی سب سے طاقتور سیاسی پارٹی اور آپ سب جانتے ہیں وہ کون ہے۔

سوال ۔بحیثیت صدر آپ نے لاپتہ افراد کے لیے جو آواز اٹھائی اس سے کیا نتائج نکلے؟

جواب ۔ دیکھیں کوشش جاری ہے۔ہم سپریم کورٹ میں مقدمہ بھی لڑ رہے ہیں۔آج بھی اخبار میں میرا بیان ہے۔ابھی میں کل ہی بلوچستان سے آئی ہوں۔

سوال ۔عدلیہ بلوچستان میں لاپتہ افراد کا نوٹس کیوں نہیں لیتی؟

جواب ۔عدلیہ کی دوڑ وہاں تک ہے جہاں فوج کی شروع ہوتی ہے۔اس لیے عدلیہ اس معاملے میں کچھ نہیں کرے گی۔

سوال ۔جسٹس خلیل رمدے کی توسیع کے بعد آپ چیف جسٹس سے ملیں تھیں کیا انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کی؟

جواب :نہیں بالکل نہیں۔

سوال ۔کیا عدلیہ کو پارلیمان کے معاملات میں دخل کا حق ہے؟ مثلاً دلدار اشاہ کیس میں۔

جواب ۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس معاملے میں عدلیہ کا آدھا فیصلہ صحیح تھا۔لیکن سی جے کا یہ کہنا کہ اس سے مشاورت کی جائے سراسر غلط ہے۔سی جے کو نیب کے چیئرمین کے تقرر کا کوئی حق نہیں ہے۔

سوال ۔ایوانوں میں عام پاکستانی کے لیے انصاف کی بات کب ہوگی؟

جواب ۔ جب آپ ان کے دروازے خود جا کر کھٹکھٹائیں گے۔

سوال ۔ٹی وی چینلز پر یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ آپ پی پی کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہیں اور چیف جسٹس کے خلاف ہیں؟

جواب ۔ میں جمہوری نظام کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہوں اور میرا حق اور فرض ہے۔ مجھے اس کے لیے جیو سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ اور عدلیہ پر تنقید عدلیہ کی اصلاح کے لیے ہے۔یہ بار کا کام ہے اگر میں یہ نہ کروں تو اپنے فرض میں کوتاہی کرونگی۔

سوال ۔ کیا بھٹو کیس سے عدلیہ کی شہرت بہتر ہوگی؟

جواب ۔دیکھیں اس پر ابھی بات چل رہی ہے لیکن جو بھی فیصلہ ہو وہ قانون کے مطابق ہونا چاہیے۔

(بشکریہ: ماہنامہ جہدِ حق' مئی 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریاستی سرپرستی میں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی۔ناقابل تلافی نقصان

(آئی۔اے۔رحمٰن)

کوئٹہ میں پانچ غیر مسلح 'چیچن' باشندوں کے قتل کی تحقیقات کے لیے کا کرٹربیونل کا قیام ایک خوش آئند بات ہے۔لیکن حکومت کی یہ کارروائی ملک میں ماورائے عدالت ہلاکتوں کی بھرمار کو روکنے کے لیے مؤثر اور جامع اقدامات کی ضرورت کو ختم نہیں کرتی۔

کوئٹہ کا المناک واقعہ قومی سطح پر غیض وغضب اور اشتعال کا سبب بنا ہے کیونکہ متاثرہ افراد کی سفاکانہ ہلاکتوں کی تفصیلات جلد ہی منظر عام پر آگئیں اور اس حوالے سے سرکاری موقف اتنا بے ہودہ اور لغو تھا کہ اس پر یقین کرنا بہت مشکل تھا۔کون کہہ سکتا ہے کہ گزشتہ چند دنوں میں جن افراد کی لاشیں بلوچستان کے مختلف حصوں میں پڑی ملی ہیں انہیں بھی اسی طرح اور اتنی ہی بیدردی کے ساتھ قتل نہیں کیا گیا تھا۔آج ہم بلوچستان میں جو کچھ بھی دیکھ رہے ہیں وہ ماورائے عدالت ہلاکتوں کی بدترین اور انتہائی خطرناک شکل ہے۔جس کا ملک کو سامنا ہے۔

یہ نقطہ نظر کہ بہت سے واقعات جن میں بلوچستان کے مختلف علاقوں میں گولیوں سے چھلنی اور مسخ شدہ لاشیں ملی ہیں وہ ماورائے عدالت ہلاکتوں کے زمرے میں آتے ہیں...... غلط یا مبہم نہیں ہے۔متاثرہ افراد کی خاصی بڑی تعداد کے بارے میں شروع میں یہی بتایا گیا تھا کہ انہیں ''اٹھا'' لیا گیا تھا یا جبراً غائب کردیا گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر منحرفین کے طور پر جانے پہچانے جاتے تھے یا وہ قوم پرستانہ مقاصد کی حمایت کرتے تھے۔بعض افراد قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لیے پریشانی کا باعث بھی بنے تھے اور ان کے اہلکاروں کو اپنا دشمن بھی بنایا تھا۔ چند واقعات میں متاثرین کے اغواء کنندگان کی شناخت کرلی گئی تھی...... جو ایک یا کسی دوسری سکیورٹی ایجنسی کے ارکان تھے......

اس کے علاوہ قاتل کو سزا دینے میں حکومت کی ناکامی حتیٰ کہ قاتلوں کا تعاقب کرنے میں سنجیدگی کے فقدان سے شکوک جنم لیتے ہیں کہ حکومت اس میں ملوث تھی۔یوں، اس بات کا مطالبہ کرنا جائز اور درست ہے کہ سڑکوں پر ملنے والی تمام لاشوں کے واقعات کو، خاص طور پر وہ لاشیں جن پر انتہائی تشدد کے نشانات تھے۔ماورائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عدالت ہلاکتوں کے واقعات تصور کیا جائے...... جب تک کہ اس کے برعکس ثبوت مہیا نہ ہو جائے...... بجائے اس کے کہ ہم عام طور پر مفلوک الحال اور بے سہارا متاثرہ خاندانوں سے یہ توقع رکھیں کہ وہ اس ملک کے طاقتور آقاؤں کو چیلنج کرنے کا خطرہ مول لیں گے۔

ایک لحاظ سے بلوچستان میں ماورائے عدالت ہلاکتوں کی مہم اس گمراہ کن روایت کی توسیع ہے جو گزشتہ متعدد عشروں کے دوران دوسرے صوبوں...... خاص طور پر پنجاب میں بھی پھیل چکی ہے۔ جب دنیا ابھی اسقط میں مبتلا نہیں ہوئی تھی کہ دہشت گردی کا مقابلہ دہشت گردی سے بھی زیادہ خطرناک اشکال میں کیا جانا چاہیے۔ ماورائے عدالت ہلاکتوں کو 'پولیس مقابلوں میں اموات' کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اور اس روایت پر ابھی تک عمل کیا جا رہا ہے۔

گزشتہ برس ایچ آر سی پی کے اعداد و شمار کے مطابق، 338 افراد کو نام نہاد پولیس مقابلوں میں ہلاک کر دیا گیا۔ تقریباً 35 فیصد واقعات میں کہانی یہ سنائی گئی کہ متاثرہ افراد/مشتبہ افراد نے پولیس پر گولی چلا دی اور پولیس کی طرف سے جوابی فائرنگ کے نتیجے میں ان کی موت واقع ہوگئی۔ بعض واقعات میں فائرنگ کا تبادلہ ضرور ہوا ہوگا جس کی تصدیق پولیس ہلاکتوں سے ہوئی...... آٹھ (8) افسران اور 22 کانسٹیبلان...... لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تمام مقابلے حقیقی اور اصلی تھے۔ یہ حقیقت کہ ان مقابلوں میں 28 ''مشتبہ'' افراد زخمی ہوئے جنہیں زندہ پکڑ لیا گیا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مطلوبہ افراد کو گرفتار کرنا ناممکن نہیں ہے...... بشرطیکہ پہلے فائر کرنے کے رجحان پر قابو پا لیا جائے۔

اس بات پر یقین کرنے کی وجوہات موجود ہیں کہ ملک میں ماورائے عدالت سالانہ ہلاکتوں کی تعداد اس تعداد سے تجاوز کرتی ہے جسے میڈیا رپورٹ کرتا ہے اور انسانی حقوق کی تنظیمیں جس تعداد کا حوالہ دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے میڈیا رپورٹس کی بنیاد پر 2009 میں پولیس مقابلوں میں 226 ہلاکتیں ریکارڈ کیں...... پنجاب میں 181، سندھ میں 31، خیبر پختونخواہ میں 13 اور بلوچستان میں ایک...... تاہم پنجاب پولیس کے سربراہ نے اعلان کیا کہ صرف صوبہ پنجاب میں 208 مقابلوں میں 253 مجرم ہلاک کیے گئے۔

مسئلے کی سنگینی اور وسعت کا اندازہ پنجاب پولیس کی 2005 کی رپورٹ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو اس نے وفاقی حکومت کو پیش کی تھی۔ رپورٹ کے مطابق، 1990 سے 2005 (وسط اگست تک) 2,246 مشتبہ افراد کو ہلاک کیا گیا تھا...... اوسطاً 150 اموات سالانہ...... اس رپورٹ کے مطابق...... پولیس مقابلوں میں ہلاکتوں کے حوالے سے 1998 بدترین سال تھا...... 417 مقابلوں میں 413 اموات...... ان اعداد و شمار کو چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے مطابق، 1999 اس سے بھی بدترین سال تھا جب 350 مقابلوں میں 527 افراد کو ہلاک کیا گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ماورائے عدالت ہلاکتوں کو روکنے کے لیے آج تک جتنی بھی کوششیں کی گئی ہیں ان کو ناکام بنانے کے لیے کئی عوامل نے کردار ادا کیا ہے۔ اول اور سب سے اہم: یہ حقیقت ہے کہ ان ہلاکتوں کو...... برملا اور پوشیدہ......حکومتی رہنماؤں کی حمایت حاصل ہے۔ کالا باغ، جسے پولیس کو مجرموں کو ہلاک کرنے کی اجازت دینے والا پہلا پاکستانی حکمران تسلیم کیا جاتا ہے۔ یقیناً آخری فرد نہیں تھا جس نے پولیس کو ایسا کرنے کی اجازت دی۔ اس کے بعد آنے والے کئی حکمرانوں نے بھی اس روایت کو زندہ رکھا۔

دوم: بعض پولیس افسروں نے مجرموں کو ہلاک کرنے کی روایت کا دفاع کیا ہے یا اس کا جواز پیش کیا ہے...... متعلقہ افراد کے سرزد کردہ جرائم کی گھناؤنی نوعیت کے پیش نظر یا عدالتی نظام میں ان کے اعتماد کے فقدان کی بنا پر......

سوئم: جس سہولت کے ساتھ ماورائے عدالت ہلاکت کی مقابلتاً کم سزا سے بچ نکلنا ممکن بنادیا گیا ہے۔ اس نے بدعنوان اہلکاروں کو اس بات کی شہہ اور حوصلہ دیا ہے کہ وہ اپنی خدمات اجرت اور کرائے کے عوض پیش کریں۔ چہارم: پولیس مقابلوں یا زیر حراست ہلاکتوں کے بارے میں عدالتی تحقیقات کا نظام منہدم ہو چکا ہے۔ یا تو کوئی انکوائری منعقد ہی نہیں ہوتی اور اگر تحقیقات کا حکم جاری کیا بھی جائے تو یہ فریضہ سرسری طور پر کوئی جونیئر مجسٹریٹ سرانجام دے دیتا ہے یا متاثرہ خاندان پولیس کے دباؤ کے تحت خاموش رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔

جبکہ پولیس مقابلوں کے باعث صورتحال پہلے ہی بہت تشویش ناک تھی۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ نے اسے مزید سنگین بنادیا ہے۔ اگر ایک بار کسی شخص کو دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے تو اس کے تمام حقوق سلب ہوجاتے ہیں...... بشمول زندہ رہنے کا حق...... اس ماحول میں "دہشت" گرد کو ہلاک کرنے کا جواز پیش کرنا بہت آسان ہوتا ہے...... ہمیں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش ہی نہیں کرنا پڑتی کہ متاثرہ فرد دہشت گرد تھا بھی یا نہیں۔

مزید برآں: انتظامیہ نے قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کو ان قوانین، معاہدوں اور روایات کے بارے میں آگہی دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی جن کا مقصد ماورائے عدالت ہلاکتوں کا سلسلہ بند کرنا ہو۔ حتیٰ کہ سینئر پولیس اور سیکیورٹی اہلکار بھی ماورائے عدالت ہلاکت کی توضیح وتشریح کے بارے میں واضح نہیں ہیں اور اکثر وبیشتر وہ یہ نہیں جانتے کہ ماورائے عدالت ہلاکت سے درگزر کرنا یا اس کی اجازت دینا اتنا ہی مجرمانہ قتل ہے جتنا اپنے ہاتھوں سے کسی کو قتل کرنا۔ سب سے بڑھ کر حکومت کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ ماورائے عدالت ہلاکتوں کا تسلسل اس کے لیے بدنامی کا ایک ایسا دھبہ ہے جو نہ صرف یہ کہ اس کی ساکھ اور شہرت کو بری طرح متاثر کر رہا ہے بلکہ عوام اور ریاست کے درمیان دوری پیدا کرنے کا سبب بھی بن رہا ہے اور ریاستی اداروں اور اہلکاروں کی عوام کے انتہائی بنیادی حقوق کو تحفظ فراہم کرنے کی صلاحیتوں کو نقصان پہنچا رہا ہے۔

ماورائے عدالت ہلاکتوں کی روایت ختم کرنے کے لیے دوشاخہ حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت عیاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ایک طرف قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کی تربیت کے لیے مرتب کردہ مینوئلز (کتابچوں) میں ایسی ہدایات اور طریق کار کو شامل کیا جائے جن کا مقصد ماورائے عدالت ہلاکتوں کا قلع قمع کرنا ہو۔ ہر وہ واقعہ جو دیکھنے میں ماورائے عدالت ہلاکت محسوس ہو، اسے ایک سنگین جرم کے طور پر درج کیا جائے اور اعلیٰ عہدیداروں پر فائز چند ایک اہلکاروں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے جو دوسروں کے لیے لائق عبرت ہو۔اور دوسری طرف قانون نافذ کرنے والی تمام ایجنسیوں میں سینئر افسران اپنے خطا کار ماتحتوں کا دفاع کرنے کی بجائے انہیں سزائیں دینا شروع کردیں۔

سکیورٹی اہلکاروں کی طرف سے مسلط کردہ ہلاکتوں کے خلاف ایک بامعنی مہم کون سی حتمی شکل اختیار کرتی ہے۔اس حوالے سے ایک تفصیلی تجزیے اور ٹھوس جانچ پڑتال کی ضرورت ہے۔امید کی جاتی ہے کہ کاکڑ ٹربیونل اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان اور سول سوسائٹی کے ارکان پر مشتمل ایک مشترکہ کمیشن کی تشکیل کی راہ ہموار کرے گا جو ملک میں ماورائے عدالت ہلاکتوں کے مختلف اسلوب کا جائزہ لے گا اور اس سلسلے میں موثر مداوے پیش کرے گا۔

(بشکریہ: ماہنامہ 'جہد حق' جون 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقوق تک رسائی حاصل کرنے میں سول سوسائٹی کا کردار

(ایم ابوالفضل)

حکمران طبقہ اپنے اردگرد سول سوسائٹی کا جال بنتا ہے تاکہ وہ پر امن طریقے سے معاشرے پر اپنے تسلط کو یقینی بنا سکے اور سول سوسائٹی بھی یہ تاثر دیتی ہے گویا کہ وہ تمام تر معاشرے کی نمائندگی کرتی ہے۔

ہمیں جو مسئلہ درپیش ہے وہ حکمران طبقے کی فطرت اور اس کے خلقی رجحانات سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم نے اپنی آزادی کے لیے نہ تو کوئی جدوجہد کی اور نہ ہی اس کے لیے کوئی قربانی دی۔ چنانچہ ہمارا نوزائیدہ متوسط طبقہ (بورژوا) جو کہ ابھی اپنی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں سے گزر رہا تھا۔ بذات خود اپنے آپ کو کوئی واضح شکل نہ دے سکا اور نہ ہی وہ کوئی ایسا جواز حاصل کر سکا جو حکمران طبقے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ مغربی پاکستان میں جاگیردار طبقے کو حکمران طبقے کی حیثیت ہی حاصل رہی۔ اس طبقے کا کسانوں کے ساتھ رشتہ بنیادی طور پر سیاسی حرز کا ہے.....مثال کے طور پر طاقت اور لاقانونیت اس تعلق کی خاص خوبی ہے اور جاگیردارانہ سیاست میں اس کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ فوج کے ساتھ اس کے اتحاد کی یہ ایک بڑی وجہ ہے جو ملک میں نہ صرف یہ کہ حکومتوں کے اچانک تختے الٹنے بلکہ فوجی حکمرانی کو تقریباً ایک مستقل شکل دینے میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔

اس قسم کے حکومتی اختیارات کی مساوات میں ایسے سیاسی اتحادوں کی ضرورت نہیں پڑتی جو ایک سول سوسائٹی کو تشکیل دیتے ہیں۔ یوں ہماری سول سوسائٹی کمزور اور ضعیف ہے کیونکہ ہمارا سرمایہ دار طبقہ کمزور ہے۔ لگتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھوں بُری طرح پٹنے کے بعد اس نے خود اپنے ہاتھوں سیاسی اقتدار کی خواہش کا گلہ گھونٹ دیا۔ اب یہ طبقہ جاگیرداروں کے تسلط اور فوج کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے اور یہ ان نیولبرل اقدامات کی بھی حمایت کرتا ہے جن کا مقصد پاکستان کو صنعتی ترقی سے دور رکھنا ہے۔

امید کی کرن

اب ہمارے پاس ایک ہی امید کی کرن باقی رہ گئی ہے اور وہ ابھرتے ہوئے انڈسٹریل بورژوا کی صورت۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ہے۔ (صنعتکاروں کا متوسط طبقہ)......خاص طور پر پنجاب میں......جو کہ نہ صرف یہ کہ قوم پرستانہ رجحانات رکھتا ہے بلکہ حکمران جاگیردار طبقہ کے ساتھ اپنے تضادات کے حوالے سے بھی خاصہ حساس واقع ہوا ہے۔ آنے والے دنوں میں عین ممکن ہے وہ اتنا طاقتور ہو جائے کہ اقتدار کے ایوانوں پر دستک دینے لگے۔

اسی اثنا میں سول سوسائٹی جو ہم دیکھ رہے ہیں ابھی نامکمل اور ادھوری ہے وہ موجودہ حکمران طبقے کے اردگرد کوئی جالا نہیں بُن رہی۔ بلکہ ایک ایسے حکمران طبقے کی پیش بندی میں مصروف ہے جسے ابھی معرض وجود میں آنا ہے۔ فی الحال تو اس کی کمزوری کا یہی ایک پیمانہ ہے۔ یہ ابھی تک اپنے اجزائے ترکیبی کو متحرک کرنے میں لگی ہوئی ہے...... ہمارا کمزور صنعتی بورژوا، پیشہ ور حضرات ہنرمند افراد، نچلا متوسط طبقہ وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت وہ جس جدوجہد میں مصروف ہے اس دوران وہ خود کو تشکیل دے سکتی ہے...... ایک ایسی جدوجہد جو ہم نے اپنی آزادی کے لیے نہیں کی تھی...... جمہوریت اور جمہوری حقوق کے لیے ہماری یہ جدوجہد، ہماری آزادی اور حاکمیت دونوں کو مستحکم کرے گی۔

انگریزی سے ترجمہ۔ بشکریہ ''ڈان'' (مضمون سے اقتباس)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاگیردارانہ نظام انسانی حقوق کے حصول میں رکاوٹ

(آئی۔اے۔رحمٰن)

حال ہی میں رونما ہونے والے چند واقعات نے ایک بار پھر اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ پاکستانی خواتین کو تشدد کے حوالے سے بڑھتے ہوئے عدم تحفظ کا سامنا ہے اور اس منفی رجحان پر قابو پانے کے لیے ایک فوری پروگرام تشکیل دینے اور اس پر نیک نیتی کے ساتھ عمل درآمد کرنے کی ضرورت ہے۔

بہاولپور کے نزدیک گاؤں میں ایک 20 سالہ لڑکی کو مبینہ طور پر پنچائت کے حکم پر بجلی کے جھٹکے لگا کر ہلاک کر دیا گیا۔ تفصیلات کے مطابق اس کے خاندان والوں نے اسے اس بات کی سزا دی کیونکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق ایک نوجوان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ دریں اثناء ملزمان نے کسی پنچائت کے انعقاد سے انکار کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ لڑکی نے والدین کی طے کردہ شادی کے موقع پر خودکشی کر لی۔ جبکہ یہ فیصلہ کرنا کہ کونسا موقف درست ہے ایک عدالت کا کام ہے۔ بعض ایسے حقائق کی طرف توجہ دینا ضروری ہے جنہیں چیلنج نہیں کیا گیا۔ متاثرہ لڑکی اپنے ایک کزن کے ساتھ کراچی گئی تھی اور انہوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے والد اور بعض دیگر رشتہ داروں نے اسے اپنا قانونی حق استعمال کرنے سے روکا اور گھر واپس آنے پر مجبور کیا جہاں انہوں نے لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی کرنے کی سازش تیار کی۔ ان افراد نے جس جرم کا ارتکاب کیا ہے وہ عیاں ہے۔ وہ کسی صورت میں اس کی ہلاکت کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے...... شادی کرنے کا قانونی حق استعمال کرنے کی پاداش میں اسے قتل کیا گیا یا جبری شادی کی اذیت سے بچنے کے لیے اس نے خودکشی کی...... فرق صرف یہ ہے کہ ان کی طرف سے دی گئی سزا کا دارومدار ان حالات پر ہے جن کے تحت لڑکی کی موت واقع ہوئی۔

حکومت کو انصاف کے غیر قانونی فورموں کے وبال سے عوام کو نجات دلانے کے لیے کوئی کارروائی عمل میں لانے سے قبل عدالتی کارروائی کے خاتمے کا انتظام نہیں کرنا چاہیے۔ اس واقعہ میں پنچائت کے خلاف عائد کردہ الزامات کی معتبریت سے قطع نظر۔ یہ بات کوئی راز نہیں ہے کہ اس نوعیت کے اجتماعات عوام کو مختلف قسم کے جرائم کے حوالے سے سزائیں سناتے رہے ہیں...... اور یہ کہ بعض سزائیں...... مثال کے طور پر کسی خاتون کے خلاف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجتماعی جنسی تشدد کا حکم صادر کرنا یا کسی ملزم کو یہ حکم دینا کہ وہ اپنی کم عمر بچیوں کی مخالف فریقین کے افراد کے ساتھ شادیاں کر دیں۔ بدترین بربریت کے زمرے میں آتی ہیں۔

مزید براں۔ پنچائتوں کی غیر قانونی سرگرمیاں صرف پنجاب تک ہی محدود نہیں ہیں۔ ملک کا کوئی بھی حصہ اس قباحت سے پاک نہیں ہے...... اس حقیقت کے باوجود کہ یہ سندھ میں زیادہ وسیع پیمانے پر مسلط ہے اور وہاں اس نے واضح طور پر کہیں زیادہ ادارہ جاتی شکل اختیار کر رکھی ہے...... سندھ کے قبائلی جرگوں کی مذمت میں بہت کچھ تحریر کیا جا چکا ہے اور سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کے باوجود یہ ادارہ ابھی تک قائم و دائم ہے۔ جس نے جرگوں کو قطعی طور پر غیر قانونی قرار دیتے ہوئے ان تمام افراد کو حراست میں لینے کا حکم صادر کیا تھا جو ایسے جرگوں کے انعقاد کے ذمہ دار ہیں یا ان کے فیصلوں پر عمل درآمد کرتے ہیں۔

ایک اہم عامل جس نے پنچائتوں/ جرگوں کو قائم رہنے میں مدد دی ہے وہ وڈیروں اور جاگیرداروں کی طرف سے ان کا دفاع ہے۔ اور یاد رہے کہ ارکان اسمبلی بدستور زمینداروں اور جاگیرداروں کے مطیع و تابعدار ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپنی خواتین کو ان جرائم کے خلاف تحفظ فراہم کریں جن کا ارتکاب نام نہاد سرداروں کی کونسلیں کرتی ہیں تو ہمیں ان کے خلاف ایک موثر قانونی طریقہ کار وضع کرنا ہوگا۔

اس سلسلے میں مثالی حل تو یہ ہوگا کہ ایک سخت اور غیر لچکدار قانون اپنانے کے عمل کا آغاز کیا جائے۔ اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے یا یہ مناسب سمجھا جاتا ہے کہ پنچایت/ جرگہ کی نظر ثانی شدہ شکل کو ہی قانونی بنیاد فراہم کر دی جائے۔ تو پھر صوبے کی حکومتوں کے نمائندوں کو مشترکہ مفادات کی کونسل یا کسی دوسرے فورم میں اکٹھے مل کر بیٹھنا چاہیے اور اس موضوع پر یکساں قوانین اپنانے چاہئیں۔ تاہم، پنچائت/ جرگہ کے اختیارات کو مصالحت اور ثالثی تک ہی محدود کیا جانا چاہیے اور انہیں سزائیں سنانے یا ان پر عمل درآمد کی قطعاً اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

لڑکیوں کی ہلاکتوں کو روکنے کے لئے بھی موثر قانون سازی کی ضرورت ہے...... پیدائش سے قبل اور بعد...... دو حالیہ واقعات نے اس معاملے کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

پہلے یہ رپورٹ منظر عام پر آئی کہ خانیوال میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو اس وقت سزا دی جب الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کے ہاں پیدا ہونے والا بچہ ایک لڑکی تھا۔ خاتون کو بری طرح مارا اور پیٹا گیا اور رسوں کے ساتھ اسے چارپائی سے باندھ دیا گیا۔ وہ حمل کے آخری مراحل میں تھی اور جب پولیس اس کی مدد کو پہنچی اور اسے اس کی والدہ کے گھر لے جایا جا رہا تھا تو اس نے راستے میں ہی ایک بچی کو جنم دیا۔

اور اس کے بعد ایدھی فاؤنڈیشن کی یہ رپورٹ منظر عام پر آئی کہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں اور گندے نالوں میں پھینکے جانے والے نوزائیدہ بچوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور دس پھینکے جانے والے نوزائیدہ بچوں میں نو لڑکیاں ہوتی ہیں۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران جس شک و شبے کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رپورٹس نے اس سوئے ظن اور بدگمانی کی تصدیق کر دی ہے: یہ کہ نوزائیدہ بچوں کا قتل (طفل کشی)......کم از کم کچھ حد تک......ملک کی آبادی میں خواتین۔و۔مرد تناسب کا ایک سبب بنتا ہے جو کہ 114:100 ہے (100 مردوں کے مقابلے میں 114 خواتین) اس بات کی صحیح طور پر نشاندہی کی گئی ہے کہ طفل کشی کے بارے میں اعداد و شمار کا تعلق صرف بڑے شہروں سے ہے۔ ملک میں بدترین قسم کے مجرمان جو تباہی مچا رہے ہیں۔ اس حوالے سے آج تک اندازہ ہی نہیں لگایا گیا۔

یہ انکشافات متعدد اقدامات کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اول: حکومت کو اس بھارتی قانون کا جائزہ لینا چاہیے جس کے تحت میڈیکل پریکٹیشنرز کو اس امر کی ممانعت ہے کہ وہ کسی شخص کو پیدا ہونے والے بچے کی جنس کے بارے میں آگاہ کریں......کیونکہ اس کے نتیجے میں جبری اسقاط حمل عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اور اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا ایک ایسے ہی یا اس سے بہتر قانون کو پاکستان میں بھی متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ دوم؛ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر یا کسی پبلک مقام پر اگر کسی نوزائیدہ بچے یا اس کی لاش کو پھینک دیا جاتا ہے تو پولیس کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ طفل کشی کے ہر واقعہ کی مکمل تفتیش کرے۔ ممکن ہے بہت سے مجرمان پکڑے جانے سے بچ جائیں لیکن طفل کشی کے الزام کے تحت بعض ملزمان کے خلاف مقدمات کی سماعت......یا حتیٰ کہ قاتلوں کے خلاف مہم کی تشہیر......کم از کم چند مجرموں کو ان کے عزائم سے ضرور باز رکھ سکتی ہے۔

تاہم، نوزائیدہ بچوں کا قتل (طفل کشی) اور مرضی کے مطابق شادی کرنے کے خواتین کے حق میں مداخلت ایسی سماجی برائیاں ہیں جنہیں صرف قوانین کے ذریعے ختم نہیں کیا جا سکتا......انہیں چاہے کتنی ہی سختی کے ساتھ نافذ کیوں نہ کیا جائے۔ ان اسباب کی بھی تحقیقات ہونی چاہیے کہ اس سلسلے میں بعض متعلقہ قوانین پر ایمانداری کے ساتھ عملدرآمد کیوں نہیں ہو رہا ہے۔

اصل مسئلہ خواتین کے اس حق کی نفی ہے جس کے تحت انہیں جسم پر کنٹرول حاصل ہے۔ خاص طور پر اس کے تخلیقی عمل پر اور ان کے اس حق کی نفی کہ وہ مردوں کے مقابلے میں مساویانہ حیثیت کی مالک ہیں جس کے تحت انہیں اپنی مرضی کے مطابق شادی کرنے اور خاندان منظم کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ جبکہ خواتین کے حقوق کی پامالی کو روکنے اور ان حقوق کا تحفظ کرنے کے لئے قوانین اور ان قوانین پر مکمل عمل درآمد کی ضرورت ہے۔ تعلیمی اداروں میں صنفی عدم مساوات کو ختم کرنے اور خواتین کی آزادانہ نقل و حرکت، وراثت، کام، مساویانہ کام کے لیے مساویانہ اجرت، اثاثہ جات کی ملکیت اور فیصلہ سازی میں منصفانہ شمولیت کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں انہیں دور کرنے کے لیے ایک فعال اور منظم تحریک زیادہ موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ خواتین کے حقوق پر انتہا پسندوں کے بڑھتے ہوئے حملوں نے اس نوعیت کے اقدامات اٹھانے کی ضرورت اور اہمیت کو اور بھی زیادہ اجاگر کر دیا ہے......خاص طور پر لڑکیوں کے تعلیم حاصل کرنے اور مستقبل کا انتخاب کرنے کے حقوق پر......اولین مطمع نظر......آئین کے نئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آرٹیکل 25-A کے تحت اور تفویض کردہ فرائض سے ان منصوبوں کو حتمی شکل دینا چاہیے۔ جن کے تحت 2015 تک...... اگر اس سے قبل نہیں...... سو (100) فیصد پرائمری تعلیم کا ہدف حاصل کرنا ہے۔ سکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شرح داخلہ میں جو تفاوت اور فرق پایا جاتا ہے اسے دور کرنے کے لیے ٹھوس کوششیں کی جانی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی اکیسویں صدی کے ترقیاتی اہداف...... صنفی مساوات اور خواتین کی فیصلہ سازی میں شمولیت...... کے حصول کی ذمہ داری خصوصی ٹاسک فورسز کے سپرد کی جاسکتی ہے۔

(بشکریہ: ماہنامہ 'جہد حق' فروری 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قائد کی سوچ حقوق کے فروغ کے لیے مشعلِ راہ

(اُردشیر کاؤس جی)

بابائے قوم نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی ریاست کا جو نقشہ پیش کیا تھا اسے واپس لانے کے بارے میں عرصہ دراز سے کئی تجزیہ نگار بہت کچھ لکھتے چلے آئے ہیں۔ قائد کے تصورات پر گہری نظر رکھنے والے ممتاز کالم نگار اردشیر کاؤس جی کے نزدیک ریاستی بیانیے اور عوام کی سوچ میں تبدیلی لائے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں ہو گا:

دہشت گردی اور غارت گری کے اس دور میں جبکہ حکومت اور نظام حکومت بالکل معدوم ہوتے چلے جا رہے ہیں جناح کا پاکستان کون واپس لائے گا؟ اس وقت جبکہ ملکی حالات خراب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں، شہریوں کا ایک گروہ جناح کا پاکستان واپس لوٹانے کی اپیل پر مبنی ای میل پیغامات بھجوا رہا ہے۔ قومی سوچ انحطاط کے جس عالم سے گزر رہی ہیں، ایسے وقت میں ایسی شے کو واپس لانے کی خواہش جو اس ملک کی تاریخ میں ایک مختصر سے وقفے کے لیے موجود رہی ہو، قریب قریب ناممکن دکھائی دیتا ہے۔

محمد علی جناح کے پاکستان کو اُن کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی قرارداد مقاصد کی منظوری کی شکل میں مسترد کر دیا گیا تھا اور قائد کے اُس غیر مبہم خطاب کی نفی کر دی گئی تھی جب انہوں نے 11 اگست 1947 کو قانون ساز اسمبلی میں واضح طور پر اعلان کیا تھا ''...... آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا مسلک سے ہو، کاروبارِ ریاست کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔'' یوں لوگوں کو چاہتے یا نا چاہتے ہوئے بھی ریاست کو مذہب کا سرپرست بنا دیا گیا۔

1950 کے اوائل میں ایک برطانوی لکھاری ہیکٹر بولائتھو کو حکومت کی طرف سے جناح کی سوانح حیات لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ سوانح حیات 1954 میں شائع ہوئی۔ اخلاقی بد دیانتی اور منافقت اس ملک میں اس حد تک جڑیں پکڑ چکی تھی کہ اُس دور کی حکمران اشرافیہ نے جناح کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا اور کتاب میں قائد کے فقرے کو یوں شائع کیا گیا ''آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا فرقے سے ہو، اس امر کا اس بنیادی اُصول کے ساتھ کوئی سرکار نہیں کہ ہم سب ایک ہی ریاست کے اور یکساں حقوق کا حامل شہری ہیں۔''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت کے دوران اپریل 1962 میں اس ہر طرف چھائی ہوئی منافقت میں کسی حد تک کمی رونما ہوئی اور سرکاری پریس ڈیپارٹمنٹ نے قائداعظم جناح کی بطور گورنر جنرل تقاریر کا مجموعہ شائع کیا۔ 11 اگست 1947 کا خطاب بھی اپنے اصلی اور مکمل متن کے ساتھ شائع کر دیا گیا۔ (ان تقاریر کا مجموعہ بے نظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں بھی شائع کیا گیا اور یہ 1989 میں فروخت کے لیے دستیاب تھا)

1984 میں جبکہ جنرل ضیاالحق کا سیاہ دور چھایا ہوا تھا، محمد علی جناح کی ایک ایسی سوانح حیات منظر عام پر آئی جسے اب تک کی بہترین تحریر بھی کہا جا سکتا ہے۔ امریکا میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی جانب سے پروفیسر سٹینلے وولپرٹ کی وسیع تحقیق پر مبنی کتاب ''جناح آف پاکستان'' شائع کی گئی اور اس کے 500 نسخے فروخت کے لیے پاکستان میں بھی بھجوائے گئے۔

باقاعدہ اشاعت سے قبل آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے دو کاپیاں وزارت اطلاعات کو بھجوائیں تاکہ اس کتاب کو مقامی طور پر شائع کرنے کی اجازت بھی حاصل کی جا سکے۔ یہ وزارت جسے سرے سے موجود ہی نہیں ہونا چاہیے، اس میں بیٹھے ''ذہین اور قابل ترین'' افراد نے اس کتاب کے بعض اقتباسات کا خصوصی طور پر نوٹس لیا جن میں ہمارے بابائے قوم کی ذاتی زندگی اور عادات واطوار وغیرہ کے بارے میں بیان کیا گیا تھا۔

چنانچہ باقی ماندہ 498 کاپیوں کی فروخت کی اجازت نہ دی گئی اور انہیں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے گودام سے ہٹا لینے کی ہدایت کی گئی۔ یقیناً مقامی طور پر دوبارہ شائع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے بڑی احمقانہ حرکت یہ کی گئی کہ پروفیسر وولپرٹ سے رابطہ کر کے اُن سے مطلوبہ عنوانات حذف کرنے کے لیے کہا گیا تاکہ اس کو دوبارہ شائع کیا۔ فطری طور پر پروفیسر وولپرٹ کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ ایک سکالر کی حیثیت میں وہ بنیادی اُصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے لہٰذا کسی قسم کی ترمیم یا حذف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

1989ء تک پاکستان میں اس کتاب پر پابندی عائد رہی۔ اس بات کا سہرا بے نظیر حکومت کے سر جاتا ہے کہ اُس نے کتاب دوبارہ شائع کرنے کی اجازت دی یوں یہ کتاب فروخت کے لیے پیش کی گئی۔ گویا ضیاالحق حکومت کی تمام کوششیں رائیگاں رہیں۔

ہمارے ہمسائے بھارت نے بھی برداشت سے عاری عناصر کو اپنی صفوں میں جگہ دے رکھی ہے۔ ایسی کتابوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جن پر بھارت میں پابندی عائد ہے۔ گاندھی جی کے قتل کے بارے میں سٹینلے وولپرٹ کا 'فرقہ پرستانہ، ناول ''نائن آور ٹو راما'' بھی ایسی ہی کتابوں میں شامل ہے۔ اس پر بھارتی حکومت نے 1962 میں پابندی لگائی تھی اور اب امسال اگست میں جسونت سنگھ کی کتاب ''جناح: انڈیا پارٹیشن۔ انڈی پینڈنس'' کی اشاعت کے صرف دو روز بعد ریاست گجرات کی حکومت نے مذکورہ کتاب پر پابندی لگانا اور اسے ضبط کرنا موزوں خیال کیا (جسونت سنگھ کو اُن کی جماعت بی جے پی سے بھی خارج کر دیا گیا۔)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کتاب پر 'فوری طور پر' اور 'عوام کے وسیع تر مفاد میں' پابندی لگائی گئی کیونکہ مبینہ طور پر اس کے مشمولات 'انتہائی قابل اعتراض، قومی مفادات کے خلاف، گمراہ کن' ہونے کے علاوہ تاریخی حقائق کو 'مسخ' کرتے تھے۔ یہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کی توہین پر مبنی تھے جن کا شمار جدید بھارت کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔ جسونت سنگھ نے فوری طور پر بھارت کی سپریم کورٹ سے رجوع کرتے ہوئے اس پابندی کو بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کے طور پر چیلنج کیا۔ عدالت نے گجرات حکومت کے نام نوٹس جاری کیا۔ اسی دوران گجرات ہائی کورٹ میں بھی ایک اپیل دائر کر دی گئی جس نے کتاب پر سے پابندی ختم کر دی۔ گجرات حکومت کی طرف سے یہ عدالتی فیصلہ ماننے سے انکار پر یہ معاملہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔

اب جناح کے پاکستان کو اپنی اصلی حالت میں واپس لانے کے معاملے کی بات کی جائے تو ایسا کرنا اب ممکن نہیں رہا کیونکہ اس کا آدھا حصہ تو پہلے ہی ہمارے سیاستدانوں اور جرنیلوں کی ہوس اقتدار کی نذر ہو چکا ہے۔ اب اگر ہماری قیادت کے اندر کچھ بچانے کا حوصلہ موجود ہے تو صرف جناح کے پاکستان کی اُس روح کو بچایا جا سکتا ہے جسے قائد نے برسہا برس قبل اپنے اگست کے خطاب میں واضح کیا تھا۔ کاش مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے بیشتر حصے نے قائد کی اس بات پر غور کیا ہوتا کہ 'مذہب، ذات اور مسلک کو کاروبار ریاست سے کوئی سروکار نہیں، تو آج ہماری دنیا قدرتے حالت میں ہوتی۔ عین ممکن تھا کہ ان خطوں میں بڑھتی ہوئی انتہا پسندی نے اس طرح جڑیں نہ پکڑی ہوتیں اور مختلف ریاستوں کو مذہب کے بارے میں اپنے مسخ شدہ اور انتہا پسندانہ نظریات پوری دنیا پر تھوپنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔

جہاں تک پاکستان کا معاملہ ہے، قرارداد مقاصد ذوالفقار علی بھٹو کے تشکیل کردہ آئین میں دیباچے کے طور پر شامل ہے جبکہ ضیاالحق نے اسے ضمیمے کے طور پر آئین کا باقاعدہ حصہ بنا دیا۔ کسی بھی حکومت میں یہ حوصلہ نہیں تھا کہ وہ ملاؤں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو چیلنج کر سکے۔ جناح کا پاکستان واپس لانے کے لیے ہمیں ایک انقلاب سے گزرنا ہوگا اور یہ انقلاب قوم کی ذہنیت کو تبدیل کرنے کا ہے اور اسے یقینی بنانے کی خاطر ہمیں عہد جدید کے کسی بالغ نظر راہنما کی تلاش ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ 'نوائے انسان' دسمبر 2009)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتظامیہ کی بے حسی حقوق کے حصول میں بڑی رکاوٹ

(آئی۔اے۔رحمٰن)

ملک کے غریب اور محروم طبقات کے مطالبات یا اُن کے شکوے شکایات کے حوالے سے ہیئت مقتدرہ کی سوچ سمجھی لاتعلقی سے بڑھ کر کوئی بھی شے غریب عوام کے خلاف اس میں ہائے پائے جانے والے حقارت اور تعصب کے جذبات کا مظاہرہ نہیں کرتی جبکہ یہ معاشرے کے بارسوخ طبقات کے لیے مراعات پیدا کرنے کی خاطر ہر قسم کی قیمت ادا کرنے کو تیار رہتی ہے۔

اختیارات کی وفاقی اکائیوں کی سطح پر منتقلی کے عمل کا، جس پر پاکستان کے مستقبل کا دارومدار بھی ہے، راستہ روکنے کے خواہاں پیوستہ مفادات والے طبقات کے تحفظ کے لیے برسر اقتدار حلقوں کی بے قراری مراعات یافتہ طبقات کے دباؤ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی دیرینہ روایت کا تسلسل ہے۔اسی طرح سے حکومت کی طرف سے محروم طبقات کی اُمنوں کو نظر انداز کر دینے بلکہ اُنہیں باہم میل جول کے لیے گنجائش دینے سے انکار بھی اسی افسوسناک روایت کا حصہ ہے۔اس نکتے کی وضاحت کے لیے صرف چند مثالیں پیش کرنا ہی کافی رہے گا۔

18 ویں آئینی ترمیم کی منظوری سے قبل بھی محنت کشوں کے نمائندگان نے حکومت پر آجر اور اجیر کے باہمی تعلقات اور ٹریڈ یونینوں کے بارے میں کلیدی فروخت کی قانون سازی کو حتمی شکل دینے کے لیے زور ڈالا تھا کیونکہ 2008 میں کی جانے والی عبوری قانون سازی اپریل 2010 میں زائد المیعاد ہو جانے والی تھی۔مگر اس درخواست کو درخور اعتنا خیال نہیں کیا گیا جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے تحت محنت اور افرادی قوت کے شعبے صوبوں کے حوالے کیے جانے کی تجویز تھی۔ ملک کی سرکردہ ٹریڈ یونینیں ایک برس سے زائد عرصے سے ان تبدیلیوں کے باعث پیدا ہونے والی مشکلات کے ازالے پر زور دے رہی ہیں بلکہ وہ یہ معاملہ سپریم کورٹ تک بھی لے کر گئی ہیں۔

محنت کشوں کو اُن سے تعلق رکھنے والے معاملات صوبوں کے حوالے کر دیے جانے پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس عمل کی حمایت کرتے ہیں۔وہ محض اس بات کی تسلی چاہتے ہیں کہ نئے قوانین کے تحت قومی سطح کی ٹریڈ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یونینوں کو کیا تحفظ حاصل ہوگا مثلاً صنعتی تعلقات کے قومی کمیشن کی ذمہ داریاں کون نبھائے گا، عالمی ادارۂ محنت کے معاہدات پر عمل درآمد کی نگرانی کون کرے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چھوٹے صوبے سوشل سکیورٹی فنڈ یا سماجی تحفظ کے دیگر فوائد میں اپنا مناسب حصہ کیسے حاصل کر پائیں گے؟ اسی اثنا میں حکومت پنجاب کی جانب سے نئے صوبائی قانون کے تحت محنت کشوں کے حقوق میں کٹوتی کے فیصلے نے اپنے حقوق اور سہولیات کے بارے میں محنت کشوں کی بے چینی میں مزید اضافہ کیا ہے۔

ایکٹ 267 کے تحت پارلیمان کو ان معاملات کا حل ایک قرارداد کے ذریعے تلاش کرنے کا حق 18 اپریل 2011 تک حاصل تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا متعلقہ حلقے اس معاملے کی ہنگامی نوعیت سے نیز اس حقیقت سے واقعی آگاہ ہیں کہ وہ اس ملک کے محنت کش طبقات کے حقوق کے بارے کس حد تک زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ انہیں اس معاملے کی بہت زیادہ پرواہ نہیں کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ محنت کش حکومت کو گرانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس سے اُن کے محنت کش مخالف جذبات اور رجحانات بھی عیاں ہوتے ہیں۔

پنجاب میں نوجوان ڈاکٹروں کی طرف سے ہڑتال کی مثال ہی لیجیے۔ اطلاعات کے مطابق مناسب طبی نگہداشت نہ ملنے کی وجہ سے بچوں سمیت کئی مریض جاری کی بازی ہار گئے۔ ان ہلاکتوں کا درست اندازہ لگانا اس وجہ سے بھی ممکن نہیں کہ میڈیا میں بیان کیے جانے والے اعداد و شمار صرف ہسپتالوں میں پیش آنے والے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں وہ مریض شامل نہیں جو اس خدشے کی وجہ سے ہسپتالوں یا بنیادی مراکز صحت میں آئے ہی نہیں کہ ڈاکٹر حضرات تو ہڑتال پر ہیں۔

مریضوں کی اس حالت زار کے باوجود صوبائی حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور اسے مداخلت کا کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے میں ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ لگا۔ اس سے قبل وہ نوآبادیاتی اور آمرانہ طرز ہائے اقتدار کی رہنما کتب میں درج تمام حربے مثلاً مظاہرین کو منتشر یا گرفتار کرنے کے لیے بلادریغ طاقت کے استعمال، لازمی خدمات کا قانون بروئے کار لانے، مظاہرین کے راہنماؤں کی ملازمت سے برخاستی اور متبادل افراد کی بھرتی جیسے اقدامات کا سہارا لیتی رہی۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ڈاکٹر اپنے مطالبات کے حوالے سے سو فیصد حق بجانب نہیں تھے لیکن پنجاب حکومت ان سے بات چیت کرنے نیز معاملہ درست انداز میں عوام کے سامنے رکھنے میں ناکامی کے باعث اس استدلال کو استعمال میں لانے کا حق بھی کھو بیٹھی۔

ایک مرحلے پر یہ بھی کہا گیا کہ یہ معاملہ وزیراعلیٰ کے بیرون ملک ہونے کی وجہ سے طے نہیں پا سکا۔ صوبائی منتظم اعلیٰ کے غیر ملکی دورے کی معقول وجوہات کو پیش نظر رکھنے کے باوجود (جو بجائے خود نہایت مختصر مدت پر مشتمل تھا) چند سوالات اُٹھائے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اول یقیناً پورے پنجاب کا نظم و نسق صرف فرد واحد کے سر پر نہیں چلتا، وزیراعلیٰ کی غیر موجودگی میں پورے نظام کے ساتھ کیا ماجرا ہوا؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوم: وزیراعلیٰ جہاں کہیں بھی تھے، اُن کے ساتھ رابطہ ایسا بھی غیر ممکن کیونکر ہوگیا حالانکہ انہیں تو ایسی معمولی باتوں کی اطلاع بھی دی جاتی ہے کہ آپ کی بلی دودھ پینا چھوڑ گئی ہے۔ کوئی بھی فرد یہ بات ماننے پر تیار نہیں ہوگا کہ بیرون ملک دورے کی صورت میں وزیراعلیٰ (یا پھر وفاقی معاملہ ہونے کی صورت میں وزیراعظم) کو اُن کے دائرہ اختیار میں آنے والے شہریوں کے مسائل کے بارے میں زحمت نہیں دی جاسکتی۔

نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹروں کی عدم موجودگی کے باعث عام لوگوں کو جو تکالیف برداشت کرنا پڑی، یہ حالت زار اُن کے منتخب نمائندوں اور نہ ہی سول سوسائٹی میں موجود اُن کے حامیوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرسکی۔ اس کی صرف یہی توجیہہ پیش کی جاسکتی ہے کہ اشرافیہ اور اُن کے حاشیہ نشین براہ راست اس ہڑتال سے متاثر نہیں ہوئے تھے اور کیونکہ وہ جن پرائیویٹ کلینکس پر جاتے ہیں وہ بدستور کام کررہے تھے۔ ڈاکٹروں کے مظاہروں سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والوں میں غریب اور محروم طبقات ہی شامل تھے جو صرف سرکاری ہسپتالوں میں جانے کی استطاعت رکھتے ہیں۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں نے حال ہی میں ایک اور موقع پر بھی بڑے پیمانے پر طاقت استعمال کی ہے تاکہ خانیوال سے تعلق رکھنے والے مزارعین کو اپنے مطالبات کے لیے آواز اٹھانے کی خاطر لاہور جانے سے روکا جاسکے۔ اُس سے چند ہی روز بعد اوکاڑہ کے مزارعین نے اپنے حقوق کی خاطر آواز بلند کرنے والے اپنے 3 ساتھیوں کی برسی منائی اور بہت بڑا جلسہ منعقد کیا۔ خانیوال اور اوکاڑہ کے مزارعین کے مسائل ایک عشرے سے زائد عرصے سے حل طلب چلے آرہے ہیں اور دوتین نسلوں سے زمینیں کاشت کرتے چلے آنے والے مزارعین کی طرف سے ان کی ملکیتی حقوق کے جائز مطالبے کے بارے میں حکومت کی بے اعتنائی بلکہ بے حسی کے باعث اُسے کئی مرتبہ موردالزام ٹھہرایا جاچکا ہے۔ مزارعین کے مطالبات کے مقابلے پر جو بھی دلائل پیش کیے جائیں، ان مطالبات کو مساوات اور فطری انصاف جیسے اُصول تقویت پہنچاتے ہیں۔ مزارعین کو اُن کے استحقاق سے مستفید ہونے کا موقع دینے میں تاخیر کے ضمن میں وفاقی اور صوبائی حکومت کے پاس کوئی معقول وجہ موجود نہیں۔

حالیہ چند ہفتوں کے دوران ریاستی اہلکاروں کے تشدد یا اُن کی بے حسی کا نشانہ بننے والوں میں لکرک حضرات (جنہیں اپنے مطالبات کے حق میں مظاہرے کرتے ہوئے اب کئی مہینے ہوچکے ہیں)، اساتذہ اور لیڈی ہیلتھ ورکرز بھی شامل ہیں۔ سیلاب زدہ علاقوں کے متاثرین بھی ریلیف کے کاموں کی سست رفتاری اور امدادی سامان کی قلت کے شاکی نظر آتے ہیں۔

اگرچہ اختلاف رائے کے حوالے سے حکومت کی طرف سے برداشت کی صورت حال میں کسی حد تک بہتری پیدا ہونے سے انکار ناانصافی کے مترادف ہوگا، اس کے باوجود محروم طبقات کو ابھی تک وہ شنوائی نصیب نہیں ہوسکی جس میں اُن کے مطالبات کو حق کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہو۔ نتیجے کے طور پر اب سرکاری اہلکاروں کی بے حسی کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نشانہ بننے والوں میں بجائے خود ریاست کے ساتھ لاتعلقی اور موجودہ نظام سے مفروضہ طور پر مستفید ہونے والوں کے بارے میں نفرت کے جذبات اُن کی روایتی مایوسی اور غم و غصے کی جگہ لے رہے ہیں۔اس خطرناک رجحان کے تباہ کن اثرات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

ریاست کی طرف سے ایک ایسے کنونش کی منظوری دیا جانا اشد ضروری ہے جس کی بدولت اسے عوام کی شکایات پر کان دھرنے نیز اُن کے ساتھ ایک دوستانہ مکالمے کے انعقاد کا جلد از جلد پابند بنایا جاسکے۔ایسا کیا جانا اس بنا پر بھی ضروری ہے کہ جب تک انتظامیہ کی طرف سے محنت کشوں، ہاریوں، کم آمدن والے ملازمین، پیشہ ورانہ اہلیت کے حامل افراد، خواتین اور اقلیتی گروہوں سے تعلق رکھنے والوں وغیرہ کے ساتھ مراعات یافتہ طبقات جیسا مساویانہ سلوک نہیں کیا جاتا، جمہوریت کے استحکام کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

(بشکریہ ماہنامہ 'نوائے انسان' جون 2011)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقوق کے فروغ کے لیے حکمت عملی

(پرویز ہود بھائی)

پاکستانی ایک قوم نہیں ہیں باوجود اس کے کہ پاکستان 1947 سے ایک آزاد ملک کے طور پر اپنا وجود رکھتا ہے۔ ایک مضبوط مشترکہ شناخت، ذہنی خدوخال کی یکسانیت، تاریخ کی سانجھ اور مشترکہ اہداف کی عدم موجودگی نے پاکستان کو ایک قوم کے سانچے میں ڈھلنے نہیں دیا۔ یہاں بسنے والے لوگوں کے درمیان مؤثر ادغام میں ناکامی سرکائے کی تقسیم اور مواقع کی فراہمی میں پائی جانے والی عدم مساوات، مؤثر جمہوریت کی عدم موجودگی اور قانونی ڈھانچے میں پائے جانے والے سقم سے پھوٹی ہے۔

وزیراعلیٰ پنجاب کی جانب سے حالیہ بیان بازی (طالبات کے ساتھ امریکہ دشمنی کے جذبات کے اشتراک اور انہیں پنجاب پر حملے نہ کرنے کی اپیل کے حوالے سے لاہور میں کی جانے والی تقریر) کے باوجود اہل پنجاب کی غالب اکثریت خود کو پہلے پاکستانی اور بعد میں پنجابی قرار دیتی ہے۔ لیکن بلوچ اور سندھی ایسا نہیں سوچتے۔ بلوچستان کے سکولوں نے پاکستان کا پرچم لہرانے اور پاکستان کا قومی ترانہ گانے سے انکار کر دیا ہے۔ سندھی پنجاب پر اپنا پانی چرانے کا الزام لگاتے ہیں۔ کراچی میں ایم کیو ایم شہر کو خالصتاً نسلی بنیادوں پر چلا رہی ہے۔ صوبہ سرحد میں پختون صوبے میں بسنے والی دوسری قومیتی اکائیوں کے جذبات کے علی الرغم نہایت واشگاف انداز میں اپنے صوبے کا نام پختونخوا رکھنا چاہتے ہیں۔ ملازمت کے حصول کے لیے ذات اور فرقے کو قابلیت پر ترجیح دی جاتی ہے اور جامعات میں مختلف نسلی اکائیوں سے تعلق رکھنے والے طالب علم ایک دوسرے متحارب ہیں۔

عدم توجہی کو پاکستان کی بنیادوں میں آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ انڈیا کے Boolean Negative کے طور پر تخلیق ہونے والے اس ملک میں ''تنوع'' کو رواج دیے جانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس حوالے سے اس بات کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہ جاتی کہ اس کا بانی صرف ایک سال بعد انتقال کر گیا تھا۔ محمد علی جناح کے نصوبوں کو نہایت مبہم انداز میں واضح کیا گیا تھا اور خود انہوں نے اپنے پیچھے مناسب تعداد میں تحریریں نہیں چھوڑی ہیں۔ ان کی تقریریں جو خاص مواقع کی وقتی ضروریات کا شاخسانہ تھیں آج ہر ایک انہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے مفہوم کے لبادے اوڑھنے میں آزاد ہے۔ کچھ ایسے ہیں جنہیں ان میں لبرل اور سیکولر خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور کچھ وہ ہیں جو ان میں اسلامی اقدار کو تلاش کر یت ہیں۔ اس حوالے سے پایا جانے والا کنفیوژن کبھی دور نہیں کیا جا سکتا۔

نو آبادی دور کی حکمران اشرافیہ نے قیام پاکستان کے بعد مسلم شناخت کی حامل واحد قومیتی شناخت پیدا کرنے اور شدید مرکزیت کے حامل ریاستی ڈھانچے کی تشکیل کو ہماری طرز حکومت کی بنیاد ٹھہرانے پر سارا زور صرف کر دیا۔ یہ رویہ مستقبل میں پاکستان کو درپیش آنے والی مشکلات کا سب سے بڑا سبب بن گیا۔ اس رویے کے مضرت رساں پہلو اس وقت سامنے آئے جب بلوچ، سندھی، پختون قومیتوں اور سب سے بڑھ کر مشرقی پاکستان میں بنگالی قومیت نے اس ملک میں اپنا مقام اورًا اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے جدو جہد شروع کی۔ چالیس سال پہلے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ہمیں اس خام خیالی سے باہر نکل آنا چاہیے کہ ناانصافی اور غیر جمہوری رویوں کی موجودگی میں محض مذہب کے اشتراک اور ریاستی طاقت کے بل بوتے پر لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مذہب لوگوں کو جوڑے رکھنے کے لیے ایک نہایت مؤثر قوت ہے۔ حال ہی میں کیے جانے والے ایک سروے میں 18 سے 27 سال کی عمر کے 2000 افراد سے رائے مانگی گئی تو ان میں سے ایک تہائی تعداد نے اپنے آپ کو سب سے پہلے مسلمان اور اس کے بعد پاکستانی قرار دیا۔ ان میں سے صرف 14 فیصد نے اپنی اولین شناخت پاکستانی کے طور پر قرار دی جبکہ مایوس اور دلگرفتہ اکثریت نے مذہب کے ساتھ اپنی شناخت کو جوڑا۔ ضیاالحق کے دور کے بعد پیدا ہونے والی نسل کا مشترکہ Refrain یہ ہے کہ ''ہر مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے اگر ہم اسلام کی بنیادوں کی جانب لوٹ جائیں۔''

تاہم ان بنیادی اصولوں کی مختلف تشریحات ہیں جو منقسم اور متشدد سیاسی قوتوں کو انگیخت کرتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ صرف وہی خدا کی منشا کو درست طور پر سمجھنے کی اہلیت رکھیت ہیں۔ سنی اور شیعہ مسلح گروہوں کے درمیان خونریز جنگ کا آغاز اسی کی دہائی میں ہوا تھا۔ آج وہ بھی جو ایک آئیڈیل اسلامی معاشرے کی یوٹو پین صورت کے خواب دیکھتے ہیں طالبان سے دہشت زدہ ہیں جو کلاشنکوف اور خودکش حملوں کے زور پر اپنی طرز کی شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ کوئی عارضی نوعیت کا مسئلہ نہیں ہے۔ کیا اس معاملے کو سنیوں پر چھوڑ دیا جائے کہ پاکستان کا قانون کیا ہونا چاہیے؟ کون سی شریعہ درست ہے: حنفی، مالکی، شافعی یا حنبلی؟ کیا امیر المومنین یا خلیفہ کو منتخب کیا جانا چاہیے اگر ہاں تو ایسا کون کرے گا؟ اس سے زیادہ پریشان سوال یہ ہے کہ کیا ہندو، عیسائی، پارسی، احمدی اور سکھ ایک جیسی حیثیت کے حامل پاکستانی بن سکتے ہیں؟ یا یہ کہ کیا پاکستان صرف مسلمانوں کے لیے ہے۔

ان تمام پریشان کن معاملات کے باوجود پاکستان ایک دن ضرور ایک قوم میں ڈھل سکتا ہے۔ جیسے بارش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلسل برستی رہے تو ایک نہ ایک روز پتھریلے پہاڑوں کو کاٹ پیٹ کر زمین کو زرخیز بنا لیتی ہے اسی طرح جب لوگ ایک طویل مدت تک اکٹھا رہنا شروع ہو جائیں تو ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ وہ ایک قوم بن جاتے ہیں۔ لیکن اس مدت کی طوالت کتنی ہوگی؟ پاکستان کے معاملے میں اس کے لیے صدیاں درکار نہیں ہوگی۔ یہاں رہنے والے لوگوں میں ثقافیت اور لسانی تنوع موجود ہے لیکن تقریباً تمام لوگ اردو زبان سمجھ لیتے ہیں۔ وہ ایک جیسے ٹی وی پروگرام دیکھتے ہیں اور ایک جیسے اخبار پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں ایک ہی تکلیف دہ اور نااہل بیوروکریسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے بچے ایک جیسی نہایت بُری لکھی ہوئی نصابی کتابیں پڑھتے ہیں۔ وہ ایک جیسی مصنوعات خریدتے ہیں اور ایک سے حکمران طبقے کی حماقتیں اور ظلم برداشت کرتے ہیں۔ بہت آہستگی کے ساتھ سہی لیکن یقینی طور پر ایک مشترکہ پاکستانی کلچر تشکیل پا رہا ہے۔

تاہم اس کے باوجود قومیت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ سوویت یونین اور یوگوسلاویہ دونوں ہی ستر برس بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ اگر پاکستان کو ایک مستحکم قومیت کی تشکیل کا راستہ تخلیق کرنا ہے تو اسے نہایت بنیادی مسائل پر قوم کے ساتھ مکالمہ کرنا پڑے گا۔ تبدیلی کا منشور کیا ہو سکتا ہے؟ سب سے پہلے تو یہ کہ پاکستان کو امن کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کو اپنے باطن میں جھانکنا ہوگا اور اپنے اندر جاری تمام جنگوں کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ بھارت کے ساتھ طویل دشمنی سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوا سوائے اس کے کہ اس کے نتیجے میں پاکستان ایک سکیورٹی سٹیٹ بن گیا ہے جو پہلی ترجیح کے طور پر طاقت کا استعمال کرنے کی عادی بن چکی ہے۔ مسئلہ کشمیر کا فوجی حل نکالنے کی کوشش کے نتیجے میں پاکستانی معاشرہ اتھل پتھل ہو کر رہ گیا ہے اور بیرونی بیساکھیوں پر انحصار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ فوج کا کردار پاکستانی عوام کو مضبوط دفاع فراہم کرنے کی حد تک محدود کرنا ہوگا، اس کے علاوہ اسے یقینی بنانا ہوگا کہ عوام کے آئینی اور بنیادی حقوق کی فراہمی میں کبھی تعطل نہیں پڑے گا۔

دوسری بات یہ کہ پاکستان میں معاشی عدل کی شدید ضرورت ہے۔ اس معاشی عدل کا تقاضا ہے کہ یہاں ایک ایسا سماجی انفراسٹرکچر ہو جس کے تحت ہر پاکستانی کے لیے باعزت روزگار کے مواقع اور قابلیت اور محنت کے مطابق آمدنی اور سہولیات کی فراہمی یقینی ہو۔ ان دیہی علاقوں میں جہاں زمین کی ملیت کا پرانا نظام قائم و دائم ہے وہاں بلا حیل و حجت اور بلا امتیاز زرعی اصلاحات کی جائیں۔ آزادی کے بعد بھارت میں جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا گیا تھا لیکن پاکستان میں نوآبادیاتی دور کے اراضی کی ملکیت کے پرانے نظام کو ریاست کی سرپرستی میں جاری و ساری رکھا گیا۔ ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے ادوار میں کی جانے والی زرعی اصلاحات نہایت غیر سنجیدہ نوعیت کی تھیں۔ اس کے علاوہ شہری علاقوں میں بھی شدید عدم مساوات پائی جاتی ہے۔ یہاں پر فوج سب سے بڑی جاگیردار بھی ہے اور سرمایہ دار بھی جس کے بہت بڑے بڑے اقتصادی، مفادات قائم ہیں جن کا ملکی دفاع سے ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے۔

تیسری یہ کہ پاکستان کو نوآبادیاتی دور کی طرز حکومت سے ہر صورت میں پیچھا چھڑانا ہوگا۔ پاکستان میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آباد تاریخی حوالے سے مختلف قسم کے تشخص رکھنے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رضا کارانہ طور پر مل جل کر رہنا چاہتے ہیں اوراس کے فوائد سے بھی ہمکنار ہونا چاہتے ہیں۔اسلام آباد میں موجود مرکزیت کی حامل عظیم الجثہ ریاستی مشینری ایک متنوع اور مختلف اکائیوں پر مشتمل ملک کا انتظام مؤثر طور پر نہیں چلا سکتی۔ بھارت کی طرح پاکستان میں بھی ضروری ہے کہ یہاں ایسی فیڈریشن ہو جس میں صوبے اور مقامی حکومتیں اقتصادی اور سماجی حوالے سے اختیارات پوری طرح لیس ہوں جبکہ دفاع اور خارجہ امور مرکز کی ذمہ داری ہو۔خاص طور پر بلوچستان اور وفاق کے درمیان معاملات کو جلد از جلد حل ہونا چاہیے اوراس سلسلے میں فوجی قوت کے استعمال کی بجائے سیاسی دانائی کو بروئے کار لانا چاہیے۔

چوتھی بات یہ کہ پاکستان کو ایک نئے سوشل کنٹریکٹ کی ضرورت ہے۔یہ ایک کمٹمنٹ ہے جس کے مطابق ریاست شہریوں کے ساتھ بہتر اور مساویانہ طور پر معاملات طے کرے گی اور اس کے بدلے شہری اپنی سماجی ذمہ داریاں اور شہری ہونے کی حیثیت سے فرائض ادا کریں گے۔اس کے برعکس آج کے دور میں پاکستانیوں کی غالب اکثریت آئین میں دیے گئے بنیادی تحفظ سے بھی محروم ہے۔ایک جانب تو یہ حال ہے کہ غریبوں کو زندگی کے بنیادی حقوق دینے سے بھی انکار کیا جا رہا ہے دوسری جانب یہ عالم ہے کہ دولت مند اور بااثر لوگوں کو سہولت حاصل ہے کہ وہ ہر قسم کا تحفظ اور مراعات دولت کے بل بوتے پر خرید سکتے ہیں۔صورت حال یہ ہو چکی ہے کہ غریب اور امیر دونوں یکساں طور پر اپنے شہری فرائض ادا کرنے سے لاپرواہ ہیں۔دولت مندوں کی اکثریت ٹیکس چوری کی عادی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹیکس جمع کرنے کی شرح ہو یا جی ڈی پی کی شرح پاکستان دنیا میں کم ترین سطح پر موجود ہے۔

پانچویں یہ کہ ہماری تعلیم کو نصاب اور طرز تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔تعلیم کے لیے مختص فنڈز نہایت ایمانداری کے ساتھ سکولوں کے بہتر انفراسٹرکچر، کتابوں اور اساتذہ کی تنخواہوں پر خرچ کیے جانے چاہئیں لیکن یہی کافی نہیں ہے۔سکولوں میں طالب علموں کو دماغ کا استعمال کیے بغیر ''اتھارٹی'' کی تابع فرمانی سکھائی جاتی ہے، آج کے مسائل کے حل کے لیے ماضی پرستی کا درس دیا جاتا ہے اور دوسروں کے مذہب، ثقافت اور زبان کے بارے میں نارواداری پر مبنی رویوں کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔اس کی بجائے ضروری ہے کہ ہم انہیں سوال پوچھنے کی جرأت دیں، انہیں کھلے دل ودماغ کا بنائیں، ان میں تخلیقی انداز فکر کو پروان چڑھائیں، ان کے ادراک میں منطق اور حقیقت پسندی کے رنگ بھریں، انہیں سماجی طور پر ذمہ دار شہری ہونا سکھائیں اور انہیں مذہبی، لسانی اور ثقافتی تنوع کا احترام کرنے کا درس دیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان مضبوط ہو اور کامیابیوں سے ہمکنار ہو تو ہمیں ایک نارمل قوم تشکیل دینا ہو گی جس کے افراد مجرد نظریات کی بجائے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی مفادات کے احترام کے رشتے سے وابستہ ہوں۔صرف یہی ایک راستہ ہے جس پر چل کر ہم اس کثیر الجہتی سول وار سے بچ سکتے ہیں جو ہمارے اردگرد پہلے ہی شروع ہو چکی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) ایک آزاد غیر سرکاری ادارہ ہے جو قانون کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ یہ ادارہ غیر سیاسی اور غیر منافع بخش بنیادوں پر کام کرتا ہے۔ اس کا مرکزی دفتر لاہور میں ہے۔ کمیشن نے 1987 میں اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔ ایچ آر سی پی کا سب سے بااختیار ادارہ اس کی جنرل باڈی ہے جو تمام ارکان پر مشتمل ہے۔ جنرل باڈی کا سال میں کم از کم ایک اجلاس ضرور منعقد ہوتا ہے۔ ادارے کے انتظامی اختیارات ایک کونسل کے پاس ہیں جو ہر تین سال بعد منتخب کی جاتی ہے۔ یہ کونسل ہی ادارے کے عہدے داروں کا انتخاب کرتی ہے جو یہ ہیں: چیئرپرسن، معاون چیئرپرسن، وائس چیئرپرسنز، جو تعداد میں پانچ سے زیادہ نہیں ہوتے، ایک سیکرٹری جنرل اور ایک خزانچی۔ حکومت یا کسی سیاسی پارٹی کا قومی یا صوبائی سطح کا کوئی عہدیدار ایچ آر سی پی کا عہدیدار نہیں بن سکتا۔ کونسل کے سال میں کم از کم دو اجلاس ہوتے ہیں۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں منظرِ عام پر لانے اور عوامی احتجاجوں، رابطہ مہموں اور عدالتی کارروائیوں کے ذریعے ان کا حل ڈھونڈنے کے علاوہ، کمیشن سیمینارز، ورکشاپس کا اہتمام اور جائزہ وفود بھی تشکیل دیتا ہے۔ ایک ماہنامہ جہدِ حق، اردو میں شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں انسانی حقوق کی صورت حال کے متعلق ایک سالانہ رپورٹ انگریزی اور اردو میں شائع کی جاتی ہے۔

ایچ آر سی پی کے عہدیداران برائے :2011-2013

چیئرپرسن	محترمہ زہرہ یوسف
معاون چیئرپرسن	کامران عارف
وائس چیئرپرسنز	سلیمہ ہاشمی (پنجاب)
	سردار طاہر حسین (بلوچستان)
	امرناتھ موتومل (سندھ)
	شیر محمد خان (خیبر پختونخوا)
خزانچی	ائیر مارشل (ر) ظفر اے چوہدری

ایچ آر سی پی کا مرکزی سیکرٹریٹ لاہور میں ہے، جس کے سربراہ سیکرٹری جنرل آئی اے رحمان ہیں۔ کمیشن کے ذیلی دفاتر کراچی، کوئٹہ اور پشاور میں ہیں۔ حیدر آباد (سندھ)، سکھر (سندھ)، ملتان (پنجاب) گلگت۔ بلتستان اور تربت مکران (بلوچستان) میں ٹاسک فورسز اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ اسلام آباد میں کمیشن کا ایک مرکز برائے فروغِ جمہوریت بھی قائم ہے اور ملک بھر میں نامہ نگار اور فعال کارکن اس کی سرگرمیوں میں اس کی معاونت کرتے ہیں۔ کمیشن کی ایک جامع ویب سائیٹ ہے: www.hrcp-web.org اور ایک بلاگ بھی کام کرتا ہے: www.hrcpblog.wordpress.com

خط و کتابت مندرجہ ذیل پتوں پر کی جا سکتی ہے:

ہیڈ آفس / پنجاب چیپٹر
ایوانِ جمہور۔ 107 ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600
فون: 35864994-35838341-35865969 (042)
فیکس: 3588358 (042) شکایات سیل: 35845969 (92-42)
موبائل: 0333-2006800
ای میل: hrcp@hrcp-web.org
ویب سائیٹ: www.hrcp-web.org

بلوچستان چیپٹر
کمرہ نمبر AF-1، فلور 1، جناح کیپیٹل سنٹر بزد آرٹس کونسل، ایم اے جناح روڈ، کوئٹہ
فون: 2827869 (081) فیکس: 2820117 (081)
موبائل: 0321-8024184
ای میل: quettahrcp@gmail.com, quetta@hrcp-web.org

سندھ چیپٹر
یونٹ نمبر 08، فلور 1، اسٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر 5 (لالا کو ہاؤس)
عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی۔ 74400
فون: 35637131, 35637132 (021)
فیکس: 35637133 (021) موبائل: 0334-2175682
ای میل: hrcp@cyber.net.pk, karachi@hrcp-web.org

خیبر پختونخوا چیپٹر
مکان نمبر 18BB/2C، پارک روڈ، یونیورسٹی ٹاؤن، پشاور
فون 5844253 (091) فیکس 5853318 (091)
موبائل: 0333-9166873
ای میل: hrcppsh@gmail.com, peshawar@hrcp-web.org

اسپیشل ٹاسک فورس، حیدر آباد
فلیٹ نمبر 1165، فلور 1، عباسی چیمبرز، قاضی عبدالقیوم روڈ، گاڑی کھاتہ، حیدر آباد
فون: 2783688,2784678 (022)
فیکس: 2784645 (022) موبائل: 0332-3023367
ای میل: hrcphyd@live.com, hyderabad@hrcp-web.org

اسپیشل ٹاسک فورس، سکھر
مکان نمبر C-24، ہمدرد ہاؤسنگ سوسائٹی، ائیر پورٹ روڈ، سکھر (سندھ)
فون: 633544 (0715) موبائل: 0315-3146763
ای میل: jamila.mangi@yahoocom, shakirjamali@yahoo.com

اسپیشل ٹاسک فورس، ملتان
فلور 1، 1717 بالمقابل جوہری آرکیڈ، کچہری روڈ، ملتان
فون: 4517217 (061) (رہائش) 4581492 (061) موبائل: 0300-9637190
ای میل: rashidrehman@live.com, multan@hrcp-web.org

اسپیشل ٹاسک فورس گلگت۔ بلتستان
A-306، فلور 3، دار پلازہ، گلگت
فون: 457931 (05811) موبائل: 0344-5475553
ای میل: israrjpc2004@yahoo.com

اسپیشل ٹاسک فورس تربت / مکران
پرواز ہاؤس، بالمقابل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، پسنی روڈ، تربت، کیچ
فون: 413365 (0582) موبائل: 0323-2342406
ای میل: ghaniparwaz@hotmail.com

اسلام آباد آفس / مرکز برائے فروغِ جمہوریت
فلیٹ نمبر 2، بلاک نمبر 20، PHA، G-7/1، نزد زرعی ترقیاتی بینک، نزد پوائنٹ، اسلام آباد
فون: 2203397 (051) فیکس: 2203398 (051) موبائل: 0333-5616190
ای میل: hrcp@dslplus.net.pk, islamabad@hrcp-web.org